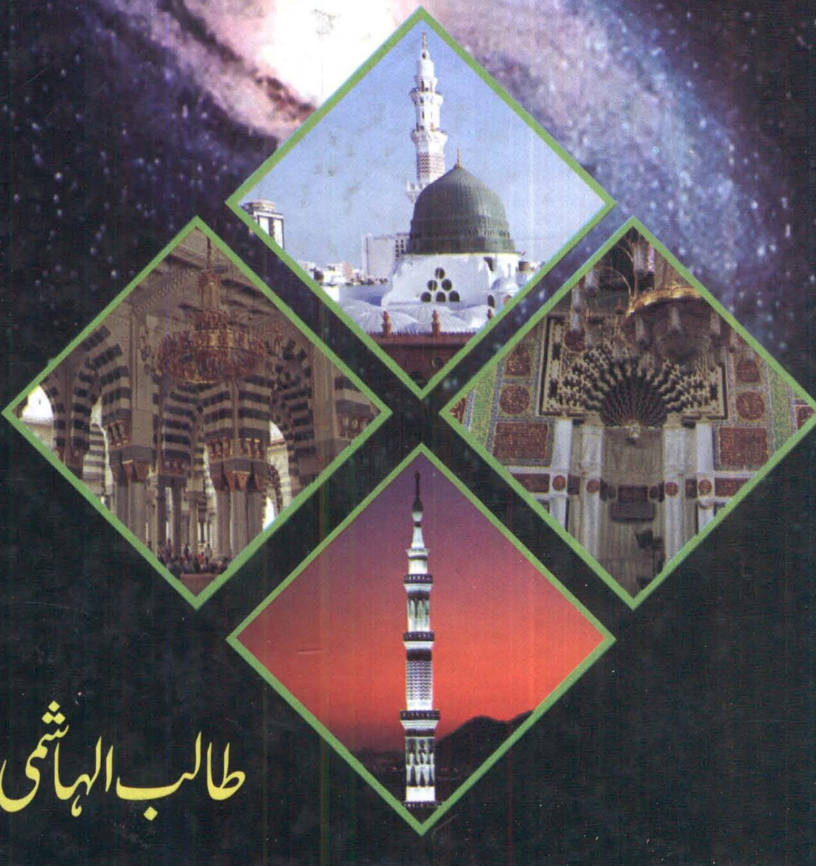
حَسُنَت جَمِیعُ خِصَالِہٖ



طالب الہاشمی

بسم الله الرحمن الرحیم

www.KitaboSunnat.com

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزُو

یا ز نورِ مصطفےٰ اُورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

(اقبالؒ)

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ

صلوا علیہ وآلہ

طالب الہاشمی

القمر انٹرپرائزز
غزنی سٹریٹ
اردو بازار : لاہور
فون : 7237500

خوبصورت، معیاری کتابیں

القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

اشاعت: دوم
تعداد: ایک ہزار
مطبع: عرفان افضل پرنٹرز لاہور
قیمت: -/250 روپے

ترتیب

اللّٰھم صلّ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ
آل سیدنا محمد واصحاب سیدنا محمد وبارک وسلم

بلغ العُلیٰ بکمالہٖ
کشف الدُّجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیعُ خصالہٖ
صلّوا علیہ وآلہٖ

یا صاحب الجمال و یا سید البشر

من وجہک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" ۱۳۵۱

امام بوصیریؒ کا ہدیۂ عقیدت

م- ۶۹۶ھ

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ — وَالْفَرِيقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

هُوَ الْحَبِيبُ الَّذِي تُرْجٰى شَفَاعَتُهُ — لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْأَهْوَالِ مُقْتَحِمِ

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيكٍ فِي مَحَاسِنِهِ — فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ

كَالزَّهْرِ فِي تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِي شَرَفٍ — وَالْبَحْرِ فِي كَرَمٍ وَّالدَّهْرِ فِي هِمَمِ

كَأَنَّهُ وَهُوَ فَرْدٌ فِي جَلَالَتِهِ — فِي عَسْكَرٍ حِينَ تَلْقَاهُ وَفِي حَشَمِ

وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُولِ اللّٰهِ نُصْرَتُهُ — إِنْ تَلْقَهُ الْأُسْدُ فِي آجَامِهَا تَجِمِ

وَائْذَنْ لِسُحْبِ صَلٰوةٍ مِّنْكَ دَائِمَةً — عَلَى النَّبِيِّ بِمُنْهَلٍّ وَّمُنْسَجِمِ

(قصیدۂ بُردہ سے ماخوذ)

منظوم ترجمہ / مفہوم

محمد مصطفےٰ سب کے دلوں کا چین صَلَّی اللّٰہ — عرب ہو یا عجم ہو، سرورِ کونین صَلَّی اللّٰہ

اُسی کی ذاتِ اقدس شافعِ روزِ قیامت ہے — ہم اُس کے اُمتی ہیں اس سے اُمیدِ شفاعت ہے

محاسن میں نہیں کوئی رسُولُ اللّٰہ کا ہمسر — کہ ہے ناقابلِ تقسیم حسنِ خاص کا جوہر

تر و تازہ شگوفہ نور کا مثلِ مہِ کامل — بلندی آسماں جیسی تو بخشش بحرِ بے ساحل

خلیق و نرم اور لاکھوں پہ بھاری دبدبہ اس کا — سراپا رحم اور شاہوں سے بڑھ کر مرتبہ اس کا

حبیبِ کبریا ہوں ضامنِ نُصرت تو ڈر کیا ہے — جلالِ غازیانِ حق کے آگے شیرِ نر کیا ہے

حضورِ پاکؐ پر دائم سلام اے رحمتِ باری — کہ اُن کے دم سے ہے فیضانِ عام اے رحمتِ باری

(نوائے بردہ از پروفیسر فروغ احمد مرحوم)

تعارف

سیرت نبویؐ اہل قلم اور ارباب فکر و نظر کا ہمیشہ سے محبوب موضوع رہی ہے دنیا کی دوسری زبانوں کو چھوڑیئے خود اردو میں اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا احاطہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے سیرت پاک ایک بحرزخار ہے اگر ہزاروں غوطہ زن اس کی تہ سے حسین اور قیمتی موتیوں کے ڈھیروں کے ڈھیر بھی چن لیں تب بھی وہاں کوئی کمی نہیں آئے گی بلکہ نت نئے جواہر گرانمایہ نکلتے رہیں گے اور دامن انسانیت کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ زیادہ تر محض قصیدہ خوانی اور مدح سرائی ہوئی ہے اس سے اتباع و اطاعت کا پہلو کم اجاگر ہوتا ہے۔

"حسنت جمیع خصالہ" بھی ایسے بحر زخار کا ایک قیمتی گوہر ہے جسے جناب طالب الہاشمی نے نہایت عرق ریزی سے مرتب کیا ہے یہ کام اگرچہ تحقیقی نوعیت کا ہے تاہم اس کی زبان میں چاشنی' مواد میں جامعیت اور طرز تحریر میں تسلسل موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب قاری کے لیے ایک جذب و کشف کی کیفیت کا آئینہ دار بن گئی ہے۔

سیرت نبوی کے کئی ایسے پہلو جن پر اب تک اصحاب فکر و نظر نے بہت کم قلم اٹھایا ہے جناب طالب الہاشمی نے ان کو ایسے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری کے دل میں عشق نبویؐ کے ساتھ ساتھ اطاعت نبویؐ کی تڑپ بھی پیدا ہوتی ہے۔ کتاب کے مندرجات کے سبھی ماخذ مستند ہیں جن سے استنادی اعتبار سے بھی اس کتاب کو خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔

آج کی مصروف ترین زندگی میں سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر یہ معرکہ آرا کتاب گوناگوں مسائل میں گھرے ہوئے انسانوں بالخصوص طلبہ' معلمین' خطباء' مقررین اور صحافیوں کے لیے ایک تحفہ گراں بہا سے کم نہیں۔ اس میں شامل مقالات کی تابناکی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی اور ان کی دلآویز خوشبو مشام جان کو معطر کر دے گی۔

محمد سعید اللہ صدیق

حُسنِ یُوسُفؑ دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری
آنچہ خُوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تقدیم

(از الحاج مولانا عبدالوکیل علوی صاحب ایم اے (عربی)
ایم اے (اسلامیات) ایم۔ اے (تاریخ اسلام)۔
(ایم او ایل فاضلِ عربی، فاضلِ علوم اسلامیہ)

قرآن حکیم فرقانِ مجید اس حقیقت کی واضح شہادت دیتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمدؐ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک نبوت و رسالت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے ہر قوم اور ہر ملک میں خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے جیسا کہ سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (آیۃ ۲۴)

(کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو)

سورۂ النحل میں فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔ (آیۃ ۳۶)

(اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا اس پیغام کے ساتھ کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو)

حق تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل کی مقدس جماعت

ہیں بہت سے امتیازی خصائص سے سرفراز فرمایا۔ ہم ان میں سے صرف چار کا ذکر یہاں کریں گے۔

(۱) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا جیساکہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (الاحزاب۔ آیۃ ۴۰)

(محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں)

(۲) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم، ملک یا زمانے کے لیے مبعوث نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام نوع انسانی کے لیے اور قیامت تک تمام زمانوں کے لیے مُبَشِّر اور مُنْذِر بنا کر مبعوث فرمایا جیساکہ سورۂ سبا میں ارشاد ہوا ہے:

وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (الاحزاب آیۃ ۲۸)

(اے محمدؐ) ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے)

سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (آیہ ۱۵۸)

(اے محمدؐ) کہو اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں)

(۳) اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنایا، آپؐ کی ذاتِ گرامی میں کمالِ انسانیت کے بہترین خصائص جمع فرما دیئے اور اسے ہر اس شخص کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بنا دیا جو اللہ (کے فضل) یوم آخرت (میں بھلائی) کا امیدوار ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والا ہو جیساکہ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا

(آیۃ: ۲۱)

(یقیناً تمہارے ہر اس شخص کے لیے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں بہترین نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ جزا کا امیدوار ہو اور اللہ کو بکثرت یاد کرے۔)

(۴) اللہ تعالیٰ نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پیروی کو اپنی محبّت کی نشانی اور مغفرت کا ذریعہ قرار دیا ہے جیسا کہ سورۃ آلِ عمران میں فرمایا گیا ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ۔ (آلِ عمران۔ آیۃ ۳۱)

(اے پیغمبرؐ) کہہ دو کہ اگر تمہیں اللہ سے محبّت ہے تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا)

○

رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرتِ طیّبہ، آپؐ کا اُسوۂ حسنہ اور اوصاف و کمالات ایسے پاکیزہ موضوع ہیں جس پر قرنِ اوّل سے لے کر آج تک دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ سیرت نگاری کی سعادت حاصل کرنے والوں میں زیادہ تر وہی اصحاب شامل ہیں جن کے سینوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی محبّت اور عقیدت سے معمور فرمایا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے انتہائی مسرّت محسوس ہو رہی ہے کہ میرے نہایت قابلِ قدر بزرگ بھائی اور لائقِ احترام دوست جناب محمد یونس طالب الہاشمی صاحب ان خوش قسمت اور خوش بخت انسانوں میں سے ہیں جنہیں خالقِ کائنات کی خصوصی مہربانی اور نظرِ کرم کی بدولت سیرتِ صحابہؓ پر ہزارہا صفحات سپردِ قلم کرنے کے

ساتھ سیرتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی اپنے قلم کو جنبش دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ بلاشبہ یہ سعادت اور خوش بختی قابلِ رشک ہے۔ جناب طالب الہاشمی پہلے بھی سیرۃ نبوی پر بڑوں اور بچوں کے لیے کئی گرانقدر کتابیں لکھ چکے ہیں (اخلاقِ پیمبری، ارشاداتِ دانائے کونین، معجزاتِ سرورِ کونین، جنت کے پھول اور ہمارے رسول پاک) ـــــ مؤخر الذکر کتاب پر مؤلف کو صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے) لیکن زیرِ نظر کتاب بعض خصوصیات کی بنا پر منفرد حیثیت کی حامل ہے اس میں فاضل مؤلف نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، خصائل، شمائل اور اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں پر ایسے بلیغ اور عام فہم انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ قاری کے دل میں جہاں حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور عقیدت کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں وہاں حضور کے اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنانے کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

مجھے پوری توقع ہے کہ جس طرح جناب ہاشمی صاحب کی علمی کاوشیں قبل ازیں علمی اور دینی حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ یہ کتاب بھی جو فی الحقیقت بارگاہِ نبوی میں طالب الہاشمی کا ہدیۂ عقیدت ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ نہ صرف قبولیتِ عامہ حاصل کرے گی بلکہ مؤلف کے لیے توشۂ آخرت بھی ثابت ہو گی۔

بارگاہِ ربّ العزت میں دست بدعا ہوں کہ وہ اس اسم بامسمّٰی کتاب کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی تڑپ پیدا کر دے ـــــ اور فاضل مؤلف کو عہدِ رسالت کے واقعات پر مشتمل اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی ایسے دلکش اسلوب میں قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو عامۃ الناس بالخصوص نئی پود کے لیے کشش اور زیادہ سے زیادہ نفع کا باعث ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

خاکسار **عبدالوکیل علوی**

۱۰۶ ۔ حبیب پارک بالمقابل منصورہ

نزد جامعہ تنویر القرآن، لاہور

۱۳ ذیقعدہ ۱۴۱۷ ہجری مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۹۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ چند

از مؤلف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

فخرِ موجودات سرورِ کائنات رحمتِ عالم امام الانبیاء والمرسلین ختمی مرتبت سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تمام کمالات و صفات کی جامع ہے اور آپؐ کا اُسوۂ حسنہ انسانیت کی معراج اور مغفرت کی شاہراہِ مستقیم ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے قرآنِ حکیم میں لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (سورۃ الاحزاب) فرما کر آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کو اہلِ ایمان کے لیے اَبَدُ الآباد تک بہترین دستورِ حیات قرار دیا ہے۔ اس آیۂ مقدسہ پر غور کیا جائے تو دل و دماغ پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور زبان بے اختیار محوِ درود و سلام ہو جاتی ہے۔

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور قیامت تک لکھی جاتی رہیں گی لیکن ہر لکھنے والے نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ موضوع کا حق ادا نہیں ہو سکا اور اس کا کوئی نہ کوئی پہلو تشنۂ تکمیل رہ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُسوۂ نبویؐ کے ہر پہلو اور ہر گوشے میں اتنی ہمہ گیری اور وسعت ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے والا قدم قدم پر ع "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست" کہتے ہوئے ٹھٹھک جاتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ کہا گیا ہے۔

پیشِ نظر کتاب سیرۃ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام بالخصوص اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مؤلف نے گزشتہ دس سال کے دوران مختلف اوقات میں سپردِ قلم کیے۔ نوعیت کے اعتبار سے ان مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا) وہ مضامین جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہو چکے ہیں (بکثرت اضافوں اور ترامیم سے نشر شدہ تقریروں کی شکل بالکل تبدیل ہو گئی ہے۔)

(ب) وہ مضامین جو کتابچوں کی صورت میں شائع ہو کر قبولیتِ عامّہ حاصل کر چکے ہیں۔

(ج) وہ مضامین جو مختلف علمی اور ادبی رسائل میں شائع ہوئے اور بہت پسند کیے گئے۔

(د) کچھ نئے مضامین جو گزشتہ چند مہینوں میں لکھے گئے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے حسنِ ظاہری اور جمالِ معنوی کی وسعتیں اور پہنائیاں بیان سے باہر ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے مجھ عاجز بیاں اور شکستہ پا کو عرصہ تک اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی لیکن

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ چند سال پہلے اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ میں شرحِ صدر سے بہرہ ور ہو گیا اور پھر اس موضوع پر بڑے ذوق و شوق سے بے تکان لکھنے لگا۔ اگر حق تعالیٰ کا خاص فضل و کرم میری دستگیری نہ کرتا تو میں ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اُس ذاتِ بے ہمتا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

اگرچہ اپنے زمانہ، موقع و محل اور محرکات کے اعتبار سے بعض مضامین کے اسلوب اور اندازِ نگارش میں تفاوت و تنوع ہے اور بعض واقعات کا اعادہ و تکرار بھی ہو گیا ہے لیکن ہر بات کا تعلق ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اس لیے یہ اعادہ و تکرار بھی نشاطِ روح کا باعث ہو گا۔

اگر میں یہ کہوں کہ یہ مجموعۂ مضامین ایک ایسا گلدستہ ہے جس کے خوش رنگ پھولوں کی دلآویز خوشبو سے ہر صاحب دل قاری کا مشامِ جان معطر ہو جائے گا تو شاید اسے خودستائی پر محمول کیا جائے لیکن ان مضامین کے تمام تر الفاظ و معانی ہر آن مؤلف کے جذبات و احساسات اور خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی محبت اور عقیدت کے "ہم نشین و ہم عنان" رہے ہیں اس لیے اس کو پورا یقین ہے کہ اس ہم نشینی سے انہوں نے اتنا اثر ضرور قبول کیا ہوگا کہ قارئین کے دلوں میں اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشعلِ راہ بنانے کی تڑپ پیدا کر دیں ورنہ مؤلف اور اس کی انشاء پردازی کی کیا بساط ہے

نہ سلیقہ مجھ میں کلام کا، نہ قرینہ مجھ میں سلام کا
مرے آنسوؤں کو سخن کہو، مری خامشی کو نوا کہو

اس موقع پر مجھے شیخ سعدیؒ کا وہ قطعہ یاد آ رہا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ مٹی جیسی چیز بھی پھولوں کی ہم نشینی سے ان کی خوشبو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

(قطعہ)

گِلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلآویزِ تو مستم
بگفتا من گِلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(ایک خوشبودار مٹی حمام میں مجھے ایک عزیز دوست نے دی۔ میں نے مٹی سے پوچھا کہ تو مشک ہے یا عنبر کہ تیری دلآویز خوشبو نے مجھے مست کر دیا ہے۔ وہ بولی میں تو حقیر مٹی ہی تھی لیکن کچھ مدت پھولوں کی صحبت میں رہی۔ ہم نشین کی خوبی نے میرے اندر اثر کیا (کہ میں خوشبودار ہو گئی) ورنہ میں تو وہی ناچیز مٹی ہوں)

اگر اس کتاب میں کوئی خوبی ہے تو وہ صرف اور صرف محبوبِ

رَبُّ الْعٰلَمِیْن کے ذکر کی بدولت ہے اور اگر کہیں مؤلف کے قلم یا فکر و خیال نے ٹھوکر کھائی ہے تو اس کا سبب مؤلف کا قصورِ فہم یا اس کی علمی کم مائیگی ہے۔

قارئین کرام سے استدعا ہے کہ ان کو کتاب میں جو تسامحات اور اسقام نظر آئیں اُن سے آگاہ فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ انہیں آئندہ ایڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ سے بصد عجز و الحاح دعا ہے کہ وہ کتاب کو مؤلف کے لیے مغفرت کا ذریعہ اور شفاعت کا وسیلہ بنا دے اور ساتھ ہی مؤلف کو اتنی مہلت اور توفیق دے کہ وہ کتاب کا دوسرا حصہ بھی مکمل کر سکے جس میں رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حیاتِ طیبہ کے ماہ و سال اور شب و روز (طفولیت، جوانی، بعثت، ہجرت، غزوات و مشاہد، حجۃ الوداع، سفرِ آخرت وغیرہ) کے حالات ایسے اسلوب میں قلمبند کیے جا رہے ہیں کہ بہت طویل اور اَدَق تحریروں کے مطالعہ سے گریز کرنے والے نوجوانانِ ملّت کے لیے کشش اور نفع کا باعث ہوں۔

میں محبِ گرامی مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کا صمیمِ قلب سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تقدیم لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

راجئ غفران و شفاعت

طالب الہاشمی

۱۰ مارچ سنہ ۱۹۹۷ء

۱۱۸۔ ڈی رضوان بلاک۔ اعوان ٹاؤن

ملتان روڈ لاہور

حبیبِ کبریا ﷺ کے امتیازی خصائص

اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر دور میں اپنے بہترین بندوں کو نبوت اور رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا لیکن انبیاء و رسل علیہم السلام کی اس مقدس جماعت میں جناب محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیسیوں امتیازی خصوصیات حاصل ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "خصائص کبریٰ" میں اڑھائی سو کے قریب حضور کے خصائص جمع کیے ہیں۔ ان سب کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک ضخیم دفتر درکار ہے۔ محدود ضخامت کی اس کتاب میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف تیس ۳۰ امتیازی خصائص اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

(۱)۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منفرد نوعیت کا مقامِ محبوبیت عطا فرمایا۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (آیۃ ۵۶)

(اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان (نبی) پر درود و سلام بھیجو)

جس ذاتِ پاک پر خود اللہ جل شانہٗ اور اس کے ملائکہ درود بھیجتے ہوں اس کے بلند مقامِ محبوبیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حق تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کو بھی حکم دیتا ہے کہ تم بھی (میرے محبوب) نبی پر درود و سلام بھیجو۔ اس نوع کے حکم کی نظیر پورے قرآن حکیم میں کسی اور نبی یا رسول کی شان میں نہیں ملتی۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ آپؐ اللہ کے آخری رسول اور نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی رسول یا نبی نہیں آئے گا۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (آیۃ ۴۰)

(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین (نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں) اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔)

(۳) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا جیسا کہ سورۃ الانبیا میں ارشاد ہوا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیۃ ۱۰۷)

(اور ہم نے تم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے یا یہ کہ ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو در اصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔ یعنی وہ آپؐ کی پیروی کر کے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں فلاح پائیں گے)

(۴) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو روئے زمین کے تمام انسانوں کے لیے "خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا" بنا کر بھیجا حالانکہ آپؐ سے پہلے جو رسول اور نبی گزرے وہ کسی خاص علاقے، بستی، ملک یا قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔

سورۃ سبا میں فرمایا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (آیۃ ۲۸)

(اور (اے نبیؐ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)

(۵) اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا جیسا کہ سُورَۃُ النِّسَآءِ میں ارشاد ہوا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (آیۃ ۸۰)

(جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی)

(۶) حضورِ انور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پیروی کرنا اللہ سے مَحبّت رکھنے کے مترادف ہے۔ ایسا کرنے والے اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں اور ان کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (آیۃ ۳۱)

(اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ) اگر تم حقیقت میں اللہ سے مَحبّت رکھتے ہو تو میری مُتابعت کرو (اس طرح) اللہ تم سے مَحبّت کرے گا اور تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

(۷) حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے کوثر عطا فرمایا جیسا کہ سُوْرَۃُ الْکَوْثَر میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۔ آیۃ: ۱)

(ہم نے (اے نبی) تجھے کوثر عطا کیا)

بعض مفسرین نے کوثر سے مراد "خیرِ کثیر" لی ہے۔ یعنی آپؐ کو بے انتہا خیر اور بے شمار بھلائیاں اور نعمتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ متعدد روایتوں میں کوثر سے مراد اس نام کا ایک حوض ہے جو قیامت کے دن میدانِ حشر میں آپؐ کو ملے گا۔ اس سخت وقت میں جب کہ ہر ایک "پیاس پیاس"، (العطش العطش) پکار رہا ہوگا، آپؐ کی اُمّت حوضِ کوثر پہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوگی اور

آپؐ اس حوض سے اس کو سیراب کریں گے۔

بہت سی روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار اور اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، اس کے کنارے سونے کے ہیں اور وہ (کنکریوں کے بجائے) موتیوں اور ہیروں پر بہہ رہی ہے۔ حوضِ کوثر کو پانی نہرِ کوثر سے ملے گا۔

ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا اور آخرت دونوں میں بے انتہا خیر اور بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ ان میں رسالت، قرآن، علم، حکمت، اسلام، رفعِ ذکر، خُلقِ عظیم، حوضِ کوثر اور نہرِ کوثر وغیرہ سبھی بھلائیاں خیر اور نعمتیں شامل ہیں۔ بلاشبہ آپؐ کا صاحبِ کوثر ہونا ایک منفرد اعزاز ہے۔

(۸) صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کا عدیم المثال اور مہتم بالشان شرف حاصل ہوا جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۭ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ (آیۃ ۱)

(پاک ہے وہ (اللہ) جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ (دُور کی اس مسجد) تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ دیکھنے اور سننے والا۔)

اسراء یا معراج ایک عظیم الشان معجزہ ہے جو انسانی قیاس، عقل اور استنباط کی سرحد سے بالاتر ہے۔ اسراء سے مراد ہے راتوں رات آپؐ کو قدرتِ غیبی کے ساتھ مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے جانا اور

معراج سے مراد ہے آپؐ کا بیت المقدس سے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنا۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں۔ یہ لفظ عروج سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ یہ واقعہ بیان کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا عُرِجَ بِیْ یعنی مجھ کو اوپر چڑھایا گیا۔ اسی مناسبت سے اس واقعہ کا نام معراج پڑ گیا۔ اس کی تفصیلات بہت سی مستند احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ مکہ معظمہ سے بیت المقدس پہنچے تو وہاں اُن سب پیغمبروں کو موجود پایا جو روزِ ازل سے اس وقت تک دنیا میں آئے تھے۔ آپؐ نے ان سب کو نماز پڑھائی، گویا آپؐ کو "امام الانبیاء و رُسل" بننے کا مہتم بالشان شرف حاصل ہوا اس کے بعد آپؐ کو عالم بالا کی انتہائی بلندیوں تک پہنچایا گیا جہاں تک کسی دوسرے پیغمبر یا فرشتے حتیٰ کہ جبریل علیہ السلام کی بھی رسائی نہ ہو سکی تھی۔

اس تحیّر خیز سفر میں ساتوں آسمانوں کی سیر، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے، انبیاء کرامؑ سے ملاقات، بارگاہِ ربّ العزت میں حاضری، ربّ العالمین کا خاص الخاص قرب اور اس سے ہم کلامی اور نماز کی فرضیت وغیرہ جیسے بے شمار واقعات پیش آئے۔ پھر آپؐ کو واپسی کا سفر بھی پہلے کی طرح طے کرایا گیا۔ بیت المقدس میں آپؐ نے دوبارہ تمام پیغمبروں کو نماز پڑھائی اور پھر بُراق پر سوار ہو کر مکہ پہنچ گئے۔ یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہو گیا۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ عظیم الشان خصوصیت یا شرف ہے جس میں کوئی دوسرے نبی یا رسول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک و سہیم نہیں۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو تمام لوگوں کے لیے قابلِ تقلید (بہترین) نمونہ بنا دیا، جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (آیۃ ۲۱)

(تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک عمدہ نمونہ (طریق زندگی) ہے)

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحبِ خُلقِ عظیم بنایا جیسا کہ

سورۂ قلم میں فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (آیۃ ۴)

(اور (اے محمدؐ) یقیناً تم اخلاق کے بڑے درجے پر ہو یا تمہارے اخلاق بہت اعلیٰ ہیں)۔

(۱۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھی۔ آپؐ انہیں اس کی آیات سناتے تھے، ان کی زندگیاں سنوارتے تھے اور انہیں قرآن اور دانائی کی تعلیم دیتے تھے۔ آپؐ کی بعثت سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۱۶۴)

(درحقیقت ایمان لانے والوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا رسول اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے اور ان کو شرک اور دوسرے مفاسد سے پاک کرتا ہے (ان کی زندگیاں سنوارتا ہے) اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)۔

(۱۲) اللہ جل شانہٗ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل ایمان کا انتہائی خیر خواہ، ان کی تکلیف پر دکھی ہو جانے والا، ان کی بھلائی کا بے حد خواہشمند اور ان پر نہایت شفیق اور مہربان بنایا جیسا کہ سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آیۃ: ۱۲۸)

(تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جسے ہر وہ چیز شاق

گزرتی ہے جو تم کو تکلیف (نقصان) پہنچائے، جو تمہاری بھلائی کا بے حد
خواہشمند اور اہل ایمان پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔)

(۱۳) اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو گواہی دینے والا، نافرمانوں کو ڈرانے والا، اطاعت گزاروں کو خوشخبری دینے والا، اللہ کے دین کی دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا جیسا کہ سُوْرَۃُ الْاَحْزَاب میں ارشاد ہوا ہے:

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا
وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا (آیۃ ۴۶)

(اے نبی! ہم نے تم کو گواہ اور خوش خبری دینے والا اور اللہ کے حکم سے
اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے)

رب کریم نے "سراج منیر" (روشن چراغ) کا خطاب صرف رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو عطا فرمایا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو گواہ بنانے کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس میں تین قسم کی گواہی شامل ہے۔

۱۔ اللہ کے دین "اسلام" کے حق یعنی سچ ہونے کی گواہی دینا اور خواہ کیسے ہی ناموافق حالات ہوں، یہ گواہی دینے سے پیچھے نہ ہٹنا۔

۲۔ اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنا یعنی اپنے اخلاق اور کردار سے اس بات کی عملی شہادت دینا کہ جس دین کی طرف لوگوں کو بلایا جا رہا ہے آپؐ اس کا مجسم نمونہ ہیں۔

۳۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس بات کی گواہی دینا کہ جو پیغام آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا وہ آپؐ نے کسی کمی بیشی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دیا اور اپنے قول و عمل سے حق واضح کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

(۱۴) اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اُمّت کو "اُمّتِ وَسَط" قرار دیا اور اس کو دوسرے لوگوں (دوسری اُمّتوں) کے طرزِ عمل کے بارے میں گواہی دینے کے منصب پر مامور کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

کو اپنی اُمّت کے نگہبان اور گواہ بنایا گیا جیسا کہ سُورۃُ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝

(آیۃ: ۱۴۳)

(اے نبی ان سے کہو) ..... اور اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک اُمّتِ وَسَط بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

فی الحقیقت یہ آیت اُمّت محمّدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امامت کا اعلان ہے یعنی یہ اُمّت حضور صلی اللہ علیہ کی متابعت کرنے کی بدولت "اُمّتِ وَسَط" کے مرتبے پر پہنچ گئی۔ "اُمّتِ وَسَط" کی کسی دوسری زبان میں بالکل صحیح اور مکمل تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ اختصار کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد ایک ایسی اُمّت ہے جو عدل و انصاف کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں میں صدر کی حیثیت رکھتی ہو اور جس کا تعلق سب کے ساتھ یکسانیت اور راستی کا ہو۔ دنیا کے لوگوں پر اُمّتِ وَسَط کے گواہ ہونے اور رسولؐ کے اس پر گواہ ہونے کے بارے میں صحیح بخاری (کتاب التفسیر جلد دوم) میں حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (حضرت) نوح علیہ السلام کو بلائے گا وہ آئیں گے اور عرض کریں گے کہ اے اللہ میں حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے ہمارے احکام لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ حضرت نوحؑ کہیں گے، جی ہاں پہنچا دیئے تھے۔ اس کے بعد ان کی اُمّت سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس اللہ کے احکام لے کر کوئی رسول آیا تھا یا نہیں؟ وہ اُمّت کہے گی، نہیں آیا۔ اس وقت میری اُمّت (یعنی اُمّت وَسَط) گواہی دے گی کہ بے شک نوح علیہ السلام نے احکامِ الٰہی

لوگوں تک پہنچا دیئے تھے اور میں کہوں گا کہ یہ لوگ (یعنی اُمّتِ وسط کے لوگ) سچ کہہ رہے ہیں۔"

مختصر یہ کہ قیامت کے دن تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمّت پر گواہ ہوں گے اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اُمّت دوسری امتوں پر گواہ ہوگی اور آپؐ اپنی اُمّت پر گواہ ہوں گے۔

(۱۵) اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر دین کو مکمل کر دیا اور قیامت تک اس میں کسی کمی بیشی کے امکان کو ختم کر دیا اور اللہ کی رضا کے حصول کا ذریعہ صرف اسلام کو قرار دیا جیسا کہ سورۃ المائدہ میں ارشاد ہوا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (آیۃ ۳)

(آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔)

دین کو مکمل کر دینے سے مراد وہ مستقل نظامِ حیات ہے جو زندگی کے ہر معاملے میں بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کی فلاح کا ضامن ہے یعنی دینِ اسلام۔ نعمت تمام کرنے سے مراد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔

(۱۶) اللہ تعالیٰ نے اپنی سب سے آخری کتاب حضورؐ پر نازل فرمائی۔ اس کو بے مثل بنایا اور قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ ص وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ (آیۃ ۲۳)

(اور (اے کافرو) اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری نہیں تو اس کی مانند ایک ہی سورۃ بنا

لاؤ۔ اپنے سارے ہم نواؤں کو بلالو۔ اللہ کے سوا جس کی چاہے مدد لے لو اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔)

سورۃ الحجر میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (آیۃ ۹)

(بے شک) یہ ذکر (قرآن) ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے (نگہبان) ہیں)

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم آج تک محفوظ چلا آرہا ہے۔ اس کے نزول سے اب تک لاکھوں حفاظ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ کوئی شخص اس کی ایک آیت کی مثل بھی نہیں بنا سکا اور نہ بنا سکے گا۔ یہ سب سے بڑا معجزہ ہے جو حضورؐ کو عطا ہوا۔ اس کی کسی سورۃ یا آیت کی مثل بنا لانے کا چیلنج ان لوگوں کو دیا گیا جن کو اپنی قدرتِ کلام، فصاحت و بلاغت اور طلاقتِ لسانی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے سوا ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ جب انہوں نے اس چیلنج کو قبول کرنے سے اپنے عجز کا اظہار کر دیا تو بعد کے زمانہ کے لوگوں کے لیے تو یہ عجز اور درماندگی اور بھی نمایاں ہے۔

(۱۷) اللہ جل شانہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود پر فائز ہونے کی بشارت دی جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے:

عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا ۝ (آیۃ ۷۹)

(قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پر فائز کر دے)

مقامِ محمود کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ کافروں کی دشنام طرازیوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محمود و ممدوحِ خلائق بنا دے گا اور سارا عالم آپؐ کی تعریفوں سے گونج اٹھے گا۔ (اور یہ ہو کر رہا)

دوسرا پہلو یہ ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ شفاعت پر کھڑے ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا گیا کہ مقامِ محمود کیا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، شفاعت۔ (صحیح بخاری و جامع ترمذی)

اس سلسلے میں اور بھی متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن صرف حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہی کو مقامِ شفاعت پر کھڑا ہونے کا شرف حاصل ہوگا اور آپؐ ہی اللہ تعالیٰ کے اِذن سے خلقِ خدا کی شفاعت کریں گے۔

(جس کی شفاعت کا اِذن ہوگا آپؐ اسی کی شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا۔)

(۱۸) ایسے ناساعد حالات میں جب ہر طرف سے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شدید مخالفت ہو رہی تھی اور صرف گنتی کے چند اہلِ ایمان آپؐ کے ساتھ تھے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ خوشخبری سنائی

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (سورہ الم نشرح آیۃ ۴)

(اور (ہم نے) تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا)

اور پھر ایک دن دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف عرب کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی صداؤں سے گونج اٹھا بلکہ تمام روئے زمین پر کسی نہ کسی ذریعے سے (اس میں دوست بھی شامل تھے اور دشمن بھی) آپؐ کے اسمِ گرامی کا چرچا پھیل گیا۔ دنیا میں کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور وہاں پانچوں وقت باآوازِ بلند آپؐ کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں مسلمانوں کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں گے وہاں حضورؐ کے ذکر کا آوازہ لازماً بلند ہوگا۔

(۱۹) حضرت عیسٰی عَلَیْہِ السَّلَام نے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا نام لے کر اپنے بعد آنے کی بشارت دی جیسا کہ سورہ الصّفّ میں ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ (آیۃ ۶)

(اور یاد کرو عیسیٰؑ ابن مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہو گا۔)

مستند احادیث سے ثابت ہے کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا نام مبارک صرف محمدؐ ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا اور صحابہ کرامؓ میں یہ نام بھی معروف تھا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پہلے عرب کی پوری تاریخ میں احمد نام کے کسی شخص کا سراغ نہیں ملتا۔

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنی جانوں سے بھی بڑھ کر عزیز رکھیں اور نبیؐ کی بیویوں کو اپنی مائیں سمجھیں جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ (آیۃ ۔ ۶)

(بلاشبہ نبی تو مومنوں کے لیے اپنی جانوں سے بڑھ کر عزیز ہیں اور نبیؐ کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں۔)

اس سلسلے میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہنا چاہیے "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اُس کو اُس کے باپ، اولاد اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہوں۔"

(صحیحین)

(۲۱) اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسولؐ کو ایذا دینے والوں پر لعنت بھیجی ہے جیسا کہ سُورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا ○ (آیۃ۔ ۵۷)

(جو لوگ، اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا ہے)

اللہ کو اذیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے اور کفر و شرک کو اپنا شعار بنایا جائے۔ رسولؐ کو اذیت دینے سے مراد یہ ہے کہ رسولؐ کو جھٹلایا جائے اور ان کو طعن و تشنیع اور سبّ و شتم کا نشانہ بنایا جائے۔ ایسا کرنا جہاں رسولؐ کو اذیت پہنچانے کا باعث ہوگا وہاں اللہ کی ناراضی کا باعث بھی ہوگا کیونکہ رسول کی مخالفت اور نافرمانی اللہ کی مخالفت اور نافرمانی ہے۔

(۲۲) اللہ تعالیٰ نے آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو خود تعلیم دی تھی (علم سکھایا تھا) جیسا کہ سورۃ النّسَاء میں ارشاد ہوا ہے:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ○ (آیۃ ۱۱۳)

(اور (اے نبیؐ) تم کو وہ کچھ سکھا دیا ہے جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے۔)

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ اپنی کتاب "رحمۃ للعالمین" جلد سوم میں لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی آیاتِ متعددہ سے ثابت ہے کہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ لکھنا جانتے تھے ـــــ اب لفظ عَلَّمَكَ

ظاہر کرتا ہے کہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے خود تعلیم دی۔ دنیا میں شاگرد کو تعلیم قوّتِ شنوائی و بینائی یعنی حسیات کے ذریعہ سے دی جاتی ہے پھر جب یہ تعلیم حواسِ انسانی میں قیام پذیر ہو جاتی ہے تو اس کا نام "تعلیم پا جانا" رکھا جاتا ہے۔ انبیاء کی تعلیم ان کے قلب سے شروع ہوتی ہے۔

اَنْزَلَہٗ عَلٰی قَلْبِكَ لہٰذا اللہ کے تعلیم دینے اور بندہ کے تعلیم دینے میں بڑا نمایاں تفاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی (الاعلیٰ آیۃ ۶)

(ہم تجھے پڑھائیں گے اور پھر تو نہ بھولے گا)

تعلیم ربّانی کا نسیان سے برتر ہونا وہ خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی معلّم یا متعلّم میں نہیں پائی جا سکتی۔ ۶۱

(۲۳) اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے یہ اصول طے کر دیا کہ وہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے اختلافی معاملات میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو حَکَم نہ مان لیں جیسا کہ سورۃ النسآء میں فرمایا گیا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (آیۃ ۶۵)

(سو اے محمدؐ تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کر لیں)

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اپنی حیاتِ مبارک میں حَکَم بننا ظاہر ہی ہے۔ بعد وفات آپؐ کی شریعت قیامت تک مسلمانوں کے لیے حَکَم یا فیصلہ کن سند ہے۔ فقہاء نے اس آیت کی بناء پر یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو کوئی رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

کے کسی حکم میں شک و شبہ کرے یا اسے ماننے سے انکار کردے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ ایک حدیث میں خود حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔ (تفہیم القرآن جلد اول)

(۲۴) اللہ تعالیٰ نے آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی / رسالت کو نور قرار دیا جیسا کہ سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ (آیۃ ۱۵)

(بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے)

بعض علماء نے نور سے مراد آپؐ کی ذاتِ گرامی کو لیا ہے اور بعض نے آپؐ کی رسالت کو۔ دونوں صورتوں میں آپؐ کے لیے لفظ "نور" کا نزول حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی منفرد خصوصیت ہے۔

(۲۵) اللہ تعالیٰ نے آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی کو "برہان" یعنی کافی اور محکم یا روشن دلیل قرار دیا جیسا کہ سورۃ النِّسَآء میں ارشاد ہوا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ (آیۃ ۱۷۴)

(اے لوگو! تمہارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن آچکی ہے)

مفسرین نے "برہان" سے مراد رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی کو لیا ہے جن کی سیرتِ طیبہ اور تعلیم کی جامعیت ہر معاملے اور مشکل میں بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔

(۲۶) اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو بطورِ خاص حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ادب کرنے کا حکم دیا۔ سورۂ فتح میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ (آیۃ ۱۰)

(اے نبیؐ!) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں)

سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ

(آیۃ ۱ و ۲)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔)

ان آیات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کسی حالت میں اپنی رائے اور خیال کو اللہ اور رسول کے فیصلے پر مقدم نہ رکھیں۔ نیز یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی ادب و احترام ملحوظ رکھیں۔

اگرچہ اس حکم کے مخاطب وہی لوگ تھے جو عہدِ رسالت میں موجود تھے مگر بعد کے لوگوں کو بھی ایسے تمام موقعوں پر یہی ادب ملحوظ رکھنا ضروری ہے جب آپؐ کا ذکر ہو رہا ہو یا احادیثِ نبوی بیان کی جا رہی ہوں۔

(۲۷) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھ کو پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔ ایک تو مجھ کو فتح دی گئی رعب سے ایک مہینہ کی راہ کی دوری پر (یعنی دشمن ایک مہینہ کی راہ کی دوری پر ہوتا ہے اور اس کے

دل میں میرا رعب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے)۔ دوسری یہ کہ ساری زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک قرار دیا گیا ہے یعنی میری اُمّت میں سے جو شخص جہاں نماز کا وقت پائے نماز پڑھ لے (اگر وضو کے لیے پانی نہ ملے تو تیمم کرے)۔ تیسری یہ کہ میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا گیا جو مجھ سے پہلے کسی کو حلال نہ تھا۔ چوتھی یہ کہ مجھ کو شفاعت کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ پانچویں یہ کہ مجھ سے پہلے ہر نبی کو خاص طور اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھ کو ساری دنیا اور تمام قوموں کے لیے بھیجا گیا۔ (مشکوٰۃ شریف بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اسی مضمون کی ایک حدیث کچھ فرق کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہٗ سے بھی مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، مجھے چھ باتوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے (مجھ سے پہلے یہ چھ باتیں کسی نبی کو نہیں دی گئیں) ——— (۱) مجھے جوامعُ الکَلِم (قلیل الالفاظ مگر کثیر المعانی کلمے) عطا کیے گئے۔ (یعنی مختصر مگر جامع بات کہنے کی صلاحیت دی گئی) (۲) مجھے رعب کے ذریعے نصرت بخشی گئی (۳) مالِ غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا۔ (۴) ساری زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک بنایا گیا (یعنی میری شریعت میں رُوئے زمین پر ہر جگہ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اگر وضو یا غسل کے لیے پانی نہ ملے تو تیمم کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے) (۵) مجھے ساری دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا۔ (۶) میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ (مسلم، ترمذی، ابنِ ماجہ)

(۲۸) حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: قیامت کے دن میں آدم کی اولاد کا سردار ہوں گا اور سب سے پہلے میں قبر سے اٹھوں گا اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ (صحیح مسلم)

(۲۹) حضرت ابو سعید خُدری رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: قیامت کے دن میں تمام آدمیوں (وَلَدِ آدم)

کا سردار ہوں گا اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں کہتا اور میرے ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا اور میں یہ براہِ فخر نہیں کہتا اور اس دن آدمؑ اور ان کے سوا تمام ہی دوسرے پیغمبر میرے لوا (جھنڈے) کے نیچے جمع ہوں گے۔ (احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ)

(۳۰) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہؓ ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپؐ نے اُن کو یہ باتیں کرتے سُنا۔ ایک صاحب نے کہا، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا۔ دوسرے نے کہا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام فرمایا، تیسرے نے کہا، عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ چوتھے نے کہا، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کی باتیں سُن کر فرمایا، میں نے تمہاری باتوں کو سنا اور تمہارے اس تعجب کو محسوس کیا کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور ہاں وہ ایسے ہی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ہم کلام ہیں تو بے شک وہ ایسے ہی ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں تو حقیقت میں وہ ایسے ہی ہیں اور آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے انتخاب کیا ہے تو واقعی وہ اللہ کے برگزیدہ ہیں لیکن سن لو کہ میں اللہ کا حبیب ہوں اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں کہتا اور قیامت کے دن میں حمد کا جھنڈا (لواء الحمد) اٹھانے والا ہوں جس کے نیچے آدمؑ اور تمام دوسرے پیغمبر ہوں گے اور اس پر مجھ کو فخر نہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا اور سب سے پہلے میں جنت کے دروازے کی زنجیر ہلاؤں گا اور اللہ تعالیٰ درِ جنت میرے لیے کھول دے گا اور مجھ کو اندر داخل کرے گا اور میرے ساتھ فقرائے مومنین ہوں گے اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں کہتا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک میں سب اگلوں پچھلوں سے زیادہ عزت والا ہوں اور یہ میں بڑائی کے طور پر نہیں کہتا۔" (مشکوٰۃ شریف بحوالہ ترمذی و دارمی نیز "سید المرسلین" بحوالہ ترمذی و دارمی و ابونعیم بسندِ حسن)

رسُولِ
والاحسَب عالی نسَب
صلی اللہ علیہ وسلم

آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے جس وقت سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کعبہ شریف کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو انھوں نے بارگاہِ رب العزت میں دعا مانگی :

"اے ہمارے رب! تو ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔" (البقرہ : ۱۲۹)

اور آج سے کوئی دو ہزار سال پہلے حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں اور جو (کتاب) مجھ سے پہلے آچکی ہے تورات، اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک رسول جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا، ان کی بشارت سُناتا ہوں۔" (سورۃ الصّف : ۶)

دعائے خلیلؑ و ذبیحؑ اور بشارتِ مسیحؑ یوں پوری ہوئی کہ آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے عرب کی وادی غیر ذی زرع میں اس ذات قدسی کا ظہور ہوا جس نے ابرِ رحمت بن کر انسانیت کی بے برگ و بار کھیتی کو سرسبز و شاداب کر دیا اور کفر و شرک، ظلم و جور اور فسق و فجور کے اندھیروں کو دور کر کے ہر طرف اللہ کا نور پھیلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جنہیں

اس نے اپنے بعد کائنات ارضی و سماوی کی سب سے بزرگ ہستی بنایا، ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جو عرب کا سب سے معزز اور شریف ترین خاندان تھا اور اس شعر کا مصداق تھا:

أَكْرِمْ بِهِ نَسَبًا طَابَتْ عَنَاصِرُهُ
أَصْلًا وَّ فَرْعًا وَّ قَدْ سَادَتْ بِهِ الْبَشَرُ

(الروض النظیف)

(آپؐ کا نسب کیسا کچھ باکرامت ہے کہ جس کے تمام اجزا پاکیزہ ہیں اصل سے بھی اور فرع سے بھی اور آپؐ کے سبب جنسِ بشر کو شرف حاصل ہو گیا)

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بزرگوں میں سے کوئی مرد و عورت بطور سفاح (بغیر نکاح) کے نہیں ملے۔ خدا تعالیٰ مجھ کو ہمیشہ اصلابِ طیبہ سے ارحامِ طاہرہ کی طرف مصفّٰی مہذب کر کے منتقل کرتا رہا۔ جب کبھی دو شعبے ہوئے (جیسے عرب و عجم پھر قریش و غیر قریش) میں بہترین شعبہ میں رہا۔ (کذا فی المواہب)

صحیح مسلم میں حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو۔ ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب کیا۔

ترمذی شریف میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں محمدؐ ہوں عبداللہ کا بیٹا اور عبدالمطلب کا پوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جو مخلوق کو پیدا کیا تو مجھ کو اچھے گروہ

میں بنایا یعنی انسان بنایا۔ پھر انسانوں میں دو گروہ پیدا کیے عرب اور عجم اور مجھ کو اچھے گروہ یعنی عرب میں پیدا کیا۔ پھر عرب میں کئی قبیلے بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے قبیلہ میں پیدا کیا یعنی قریش میں۔ پھر قریش میں کئی خاندان بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے خاندان میں پیدا کیا یعنی بنی ہاشم میں۔ پس میں ذاتی طور پر بھی سب سے اچھا ہوں اور خاندانی لحاظ سے بھی سب سے اچھا ہوں۔

حضرت خیر الانام سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کی ذریت طاہرہ میں سے ہیں جو حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ بن حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے ان تک آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب یہ ہے:

سرور کونین سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیّ بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لوّی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ یہاں تک تو بالکل یقینی اور متفق علیہ ہے۔ حجازِ مقدس کے تمام قبائل کا نسب بھی یہیں تک منتہی ہوتا ہے۔ عدنان کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک بعض ناموں میں اختلاف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسماء عبرانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوئے ہیں۔ عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک قریبًا چالیس پشتوں کا فرق ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے کہ قریش کا نسب نامہ صرف عدنان تک بیان کرنا چاہیے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ "ہم نے کسی شخص کو ایسا نہیں پایا جو عدنان سے آگے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب یقینی طور پر جانتا ہو۔"

(عیون الاثر لابن سید الناس)

ان روایات کا یہ مطلب نہیں کہ عدنان کا اولادِ اسمٰعیل میں ہونا کسی درجہ میں مشکوک ہے۔ تمام اہلِ عرب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ عدنان بنی اسمٰعیل میں

سے تھے۔ صرف بعض اسماء میں اختلاف ہونے کی بناء پر عدنان تک نسب نامہ بیان کرنا احتیاط کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

قریش

عدنان مکہ کے فرمانروا تھے اور سارے عرب میں مقتدر حیثیت کے مالک تھے۔
ان کی دسویں پشت میں فہر بن مالک پیدا ہوئے وہ بھی اپنی قوم کے سردار اور نامور تاجر تھے۔ ان کا لقب قریش تھا۔ قریش کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی کسب و تجارت کے ہیں جو قریش کا پیشہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ حجاز میں قریش وہیل مچھلی کو کہا جاتا تھا جو سمندر کا سب سے بڑا جانور ہے اور فہر نے اپنی قوت کے اظہار کے لیے یہ لقب اختیار کیا تھا۔ فہر کے زمانے میں یمن کے بادشاہ حسان بن عبد کلال حمیری نے مکہ پر حملہ کیا۔ فہر نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دے کر گرفتار کر لیا تین سال بعد وہ فدیہ دے کر رہا ہوا اس فتح نے سارے عرب پر فہر کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

قُصَیّ بن کِلاب

فہر یا قریش کی نسل سے چھٹی پشت میں قُصَیّ بن کلاب پیدا ہوئے۔ جب وہ جوان ہوئے تو انہوں نے کعبہ شریف اور مکہ معظمہ پر بنو خزاعہ کو قابض پایا۔ اس قبیلے نے چند سال پہلے قبیلہ جُرہُم سے یہ قبضہ حاصل کیا تھا۔ بنو جرہم وہ لوگ تھے جنہوں نے مدتوں پہلے بنو اسماعیل سے تولیت کعبہ کا منصب چھینا تھا۔ کچھ مدت کے بعد بنو خزاعہ نے بنو جرہم سے یہ منصب چھین لیا۔ وہ اگرچہ آل اسماعیل سے تھے لیکن بڑی خرابیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ قُصَیّ بڑے دانا، بہادر اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ بنو خزاعہ کے سردار اور کعبہ کے متولی حلیل بن حبشیہ نے قُصَیّ کی شرافت نسبی اور شاندار شخصیت سے متاثر ہو کر ان سے اپنی بیٹی حبیٰ کی شادی کر دی۔ حلیل کی وفات کے بعد قُصَیّ نے تولیت کعبہ

کا دعویٰ کر دیا۔ جب بنو خزاعہ اور بنو بکر نے ان کا دعویٰ تسلیم نہ کیا تو قُصیّ نے اپنے ماں جائے بھائی رزاح بن ربیعہ، بنی کنانہ، بنی قضاعہ اور مکّہ کے اطراف میں آباد قریش کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا اور بنی خزاعہ اور بنی بکر کو بزور مکّہ سے نکال دیا اور کعبہ کی تولیت پر قبضہ کر لیا۔ یوں وہ عرب کے سب سے معزز سردار بن گئے اور ان کا قبیلہ قریش عرب کا سب سے معزز اور مقتدر قبیلہ بن گیا۔ اب انہوں نے فہر کی ساری اولاد (قریش) کو عرب کے مختلف حصوں سے مکّہ میں جمع کر لیا اور شہر کو ان کے درمیان بانٹ کر ایک ایک حصہ میں ایک ایک خاندان آباد کر دیا۔ اسی بناء پر ان کو مُجَمِّع (جمع کرنے والا) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

قریش کے تمام خاندانوں نے قُصیّ کو اپنا سردار مان لیا چنانچہ انہوں نے مکّہ میں ایک شہری ریاست قائم کر دی۔ وہ قریش کے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں کراتے تھے، ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ کسی قبیلے سے جنگ کی نوبت آجائے تو اس کا انتظام کرتے تھے۔ کعبہ شریف کے متولی ہونے کی بناء پر حج کا تمام انتظام بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ حاجیوں کی میزبانی کرتے، ان کو کھانا کھلاتے، پانی پلاتے اور خانۂ کعبہ ان کے لیے کھولتے اور بند کرتے تھے۔ آپس میں مشورہ کے لیے انہوں نے قریش کے تمام سرداروں کی ایک قومی مجلس قائم کی جس کے اجلاسوں کے لیے ایک عمارت "دار الندوہ" تعمیر کی۔ قُصیّ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے عبد الدار کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد عبد الدار قریش کے سردار اور کعبہ کے متولی بن گئے۔

عبدِ مناف — بطحا کا چاند

قُصیّ کے دوسرے بیٹے اور عبد الدار کے چھوٹے بھائی کا اصل نام مغیرہ اور مشہور نام عبدِ مناف تھا۔ وہ بڑے خوبصورت، بہادر اور لائق آدمی تھے اور لوگ ان کو "قمر البطحا" کہا کرتے تھے۔ جب تک عبد الدار اور عبدِ مناف زندہ رہے دونوں بھائیوں میں

میں اتفاق رہا اور دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے رہے لیکن جب وہ دونوں فوت ہو گئے تو عبدِ مناف کے بڑے بیٹے عبدِ شمس نے عبدالدار کی اولاد کو سردار ماننے سے انکار کر دیا۔ قریش کے کچھ قبیلے عبدِ شمس کے طرفدار بن گئے اور کچھ عبدالدار کی اولاد کے۔ آخر کچھ دانا لوگوں نے بیچ میں پڑ کر مکہ کی ریاست کے مختلف عہدے عبدِ شمس اور بنی عبدالدار میں تقسیم کر دیئے۔ رفادہ اور سقایہ (حاجیوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے) کے عہدے عبدِ شمس کو دیئے گئے اور حجابہ (کعبہ کو کھولنے اور بند کرنے) لواء (جھنڈا اٹھانے) اور قومی مجلس کے انتظام (ندوہ) کے عہدے عبدالدار کی اولاد کے پاس رہے۔

ہاشم

اس انتظام کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ عبدِ شمس نے سارے فرائض اپنے چھوٹے بھائی ہاشم کے سپرد کر دیئے۔ ہاشم بڑے شریف، بہادر اور دریا دل آدمی تھے۔ ان کا اصل نام عمرو تھا، ہاشم کے نام سے اس وقت مشہور ہوئے جب مکہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا اور انہوں نے شام سے کثیر مقدار میں غلہ لا کر روٹیاں پکوائیں۔ پھر بہت سے اونٹ ذبح کروا کر سالن تیار کیا اور روٹیوں کا چورہ کر کے اس سالن میں ڈال دیا۔ اس کے بعد سب لوگوں کو عام دعوت دی کہ وہ آئیں اور یہ مالیدہ کھائیں۔

"ہشم" کے معنی توڑنے اور کچلنے کے ہیں روٹیوں کو توڑ کر اور کچل کر سالن میں ملانے کی وجہ سے ان کو "ہاشم" کہا جانے لگا۔ ہر سال حج کے موقع پر وہ حاجیوں کی بے حد خدمت کرتے اور ان کو عمدہ عمدہ کھانا کھلاتے اور ان کے لیے پانی کا خاص انتظام کرتے کیونکہ بنو جرہم مکہ سے نکلتے وقت زم زم کو بند کر گئے تھے اور اس وقت اس کا نشان تک نہ تھا۔ ہاشم چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں مکہ کے سارے کنوؤں سے پانی منگوا کر ان میں بھروانے کا اہتمام کرتے تاکہ حاجیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ حاجیوں کے منیٰ سے رخصت ہونے تک ان کی ضیافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی دریا دلی اور فیاضی نے ان کو عرب کے تمام قبائل میں بہت مقبول و محترم بنا دیا تھا۔ عمومی زندگی میں بھی وہ بہت نیک اور

رحم دل تھے۔ غریبوں اور کمزوروں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ انہوں نے قریش کی تجارت کو بہت ترقی دی اور اپنے بھائیوں کو ساتھ ملا کر عراق، فارس، حبش اور شام وغیرہ کی حکومتوں سے تجارتی مراعات حاصل کیں۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے مکہ عرب کی سب سے بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔

ہاشم نے اپنی زندگی میں کئی شادیاں کیں۔ ان کی ایک بیوی کا نام سلمیٰ بنت عمرو بن زید تھا جو مدینہ (جس کا نام اس وقت یثرب تھا) کے قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہاشم تجارت کے لیے شام جاتے ہوئے اکثر یثرب میں ٹھہرا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر میں انہوں نے سلمیٰ سے شادی کی اور کچھ دن یثرب میں ٹھہرنے کے بعد شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب غزہ پہنچے تو بیمار ہو گئے اور وہیں فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد سلمیٰ بنت عمرو کے بطن سے ایک فرزند پیدا ہوئے جن کا نام پہلے عامر اور پھر شیبہ رکھا گیا (بعد میں وہ اپنے اوصاف حمیدہ کی بنا پر شَیۡبَۃُ الۡحَمۡد، بھی کہلائے) شیبہ نام اس لیے رکھا گیا کہ بچے کے سر پر کچھ سفید بال تھے اور شیبہ کے معنی بوڑھے کے ہیں۔

عبدالمُطَّلِب بن ہاشم

مکہ میں ہاشم کی وفات کی خبر پہنچی تو ان کے چھوٹے بھائی مُطَّلِب ان کے جانشین ہوئے۔ ادھر ہاشم کے فرزند شیبہ جوانی کی عمر کے قریب پہنچنے تک (ایک روایت کے مطابق آٹھ سال کی عمر تک) یثرب میں اپنی ماں کے پاس پرورش پاتے رہے۔ وہ بڑے ہی نیک اور خوب صورت جوان تھے۔

ایک مرتبہ ثابت بن منذر (حضرت حسانؓ بن ثابت کے باپ) کو یثرب سے مکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس کی ملاقات مُطَّلِب سے ہوئی تو اس نے شیبہ کی بے حد تعریف کی۔ یہ سن کر وہ بے تاب ہو گئے اور یثرب جا کر شیبہ کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر مکہ لے آئے۔ قریش کے لوگوں نے ایک نوخیز لڑکے کو مُطَّلِب کے ساتھ آتے دیکھا تو کہنے لگے، یہ عبدالمُطَّلِب (مُطَّلِب کا غلام) ہے۔

مُطَّلِبؒ نے ان کو بہت سمجھایا کہ یہ میرا غلام نہیں بلکہ میرے بھائی ہاشمؒ کا فرزند شیبہ ہے۔ مگر "عبدالمُطَّلِب" نام کچھ ایسا مشہور ہوا کہ ان کا اصل نام لوگوں کو بھول ہی گیا۔ کچھ مدت کے بعد مُطَّلِب ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں یمن گئے اور وہیں فوت ہو گئے۔ اب عبدالمُطَّلِب ان کے جانشین ہوئے۔ وہ قریش میں سب سے زیادہ وجیہہ، سب سے زیادہ تومند، سب سے زیادہ دانا، سب سے زیادہ نرم مزاج اور سب سے زیادہ معاملہ فہم، سخی، بہادر اور انصاف پسند تھے۔ وہ ایک اللہ کو مانتے تھے اور ان سب برائیوں سے دور تھے جن میں قریش اور دوسرے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ ان کو اپنی قوم میں عزت و شرف کا وہ مرتبہ حاصل ہوا جو قریش میں اس سے پہلے کسی کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ ابنِ اثیرؒ کہتے ہیں کہ وہ ماہِ رمضان میں ہر سال غارِ حرا میں جا کر عبادت کیا کرتے تھے اور پورے مہینے مساکین کو کھانا کھلاتے رہتے تھے۔ وہ حاجیوں کی بھی خوب خدمت کرتے تھے اور ان کو دل کھول کر کھلاتے پلاتے تھے۔ اس طرح ان کی نیکی اور فیاضی کی سارے عرب میں شہرت ہو گئی۔

زم زم پھر برآمد ہو گیا

مدتوں پہلے جب قبیلہ جرہم کو مکہ سے نکالا گیا تھا تو وہ جاتے ہوئے چشمہ زمزم کو زمین میں دبا کر اس کا نام و نشان مٹا گئے تھے۔ عبدالمُطَّلِب اس چشمے کو اہلِ مکہ اور مسافروں کے فائدے کی خاطر تلاش کر کے پھر جاری کرنا چاہتے تھے مگر ان کو اس کی جگہ معلوم نہیں تھی۔ امام ابنِ اسحاقؒ نے حضرت علیؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبدالمُطَّلِبؒ ایک شب حطیم میں آرام کر رہے تھے کہ خواب میں انہیں زم زم کا مقام بتایا گیا کہ اس جگہ کو کھود کر یہ مقدس چشمہ (کنواں) برآمد کر لیں اور یہ کہ عَلَی الصَّبَاح ان کو ابلق رنگ کا ایک کوا زمین کریدتا ہوا دکھائی دے گا۔ بس اسی جگہ کو کھود دیں، اس کے کھودنے میں زیادہ مشقت

نہ ہوگی اور وہاں سے بہت پانی نکلے گا۔ اس وقت حضرت عبدالمطّلب کا ایک ہی بیٹا حارث تھا انہوں نے اس کو ساتھ لے کر علی الصّباح بتائی ہوئی جگہ پر کھدائی شروع کی تو جلد ہی زمزم کا کنواں برآمد ہوگیا۔ اس نعمتِ عظمیٰ کے ملنے پر اہلِ مکہ میں حضرت عبدالمطّلب کی عزت و توقیر پہلے سے بھی بڑھ گئی۔

عجیب منّت

زمزم کی کھدائی کے وقت حضرت عبدالمطّلب کو شدّت سے احساس ہوا کہ ان کا صرف ایک بیٹا ہے۔ جب کہ قریش کے اکثر سرداروں کے کتنے کتنے کڑیل جوان بیٹے ہیں، جو ان کے مددگار اور قوتِ بازو ہیں۔ چنانچہ انہوں نے منّت مانی کہ اگر خدا مجھے دس بیٹے عنایت کرے جو میری مدد کے لیے کھڑے ہوسکیں تو ان میں سے ایک کو میں اللہ کی راہ میں قربان کردوں گا۔ اللہ نے ان کی یہ دعا پوری کردی اور ان کو دس بیٹے عطا کردیے جو جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔ اب ایک دن انہوں نے اپنی نذر پوری کرنے کا ارادہ کیا اور سب بیٹوں کو اپنے ساتھ خانۂ کعبہ میں لے گئے تاکہ قرعہ ڈال کر معلوم کیا جاسکے کہ کس بیٹے کو قربان کیا جائے۔

جنابِ عبداللہ

حضرت عبدالمطّلب نے اس زمانے کے مروّجہ طریقے کے مطابق تیروں کے ذریعے قرعہ ڈالا تو وہ سترہ سالہ عبداللہ کے نام نکلا جو جناب عبدالمطّلب کے سب سے خوبصورت اور پیارے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائذ مخزومیہ تھا۔ ان سے جناب عبداللہ کے علاوہ حضرت عبدالمطّلب کے دو بیٹے ابوطالب اور زبیر اور پانچ بیٹیاں برّہ، اُمّ الحکیم بیضاء، عاتکہ، اروٰی اور امیمہ بھی تھیں۔ جناب عبداللہ کا نام قرعہ میں نکلتے ہی حضرت عبدالمطّلب

نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور چھری لے کر ان کو ذبح کرنا چاہا یہ دیکھ کر قریش کے سب لوگ جمع ہو گئے اور حضرت عبد المطلب کا ہاتھ پکڑ کر اس کام سے روک دیا ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر آپ نے اپنے بیٹے کو اس طرح ذبح کر دیا تو آئے دن کوئی نہ کوئی اپنے بیٹے کو یہاں لا کر ذبح کرنے لگے گا۔ پھر سب نے مشورہ دیا کہ چلو حجاز کی مشہور کاہنہ قطبہ کے پاس چلتے ہیں ممکن ہے وہ اس مشکل کا کوئی حل بتا دے۔ علامہ سہیلیؒ کا بیان ہے کہ یہ کاہنہ مدینے کے پاس ایک بستی حجر میں رہتی تھی چنانچہ عبد المطلب اور قریش کے کچھ سربرآوردہ لوگ حجر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ کاہنہ خیبر گئی ہوئی ہے۔ یہ سب لوگ خیبر پہنچے اور کاہنہ سے مل کر اس سے ماجرا بیان کیا۔ اس نے پوچھا کہ تمہارے ہاں آدمی کی دیت کیا ہوتی ہے؟ لوگوں نے کہا دس اونٹ۔ یہ سن کر کاہنہ بولی:

"تم لوگ واپس جاؤ اور عبد اللہ کے مقابلے پر دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو اگر اونٹوں پر قرعہ آ گیا تو بہتر ورنہ دس دس اونٹ بڑھا کر قرعہ ڈالتے جاؤ یہاں تک کہ قرعہ اونٹوں پر نکل آئے۔ جتنی تعداد میں قرعہ نکلے اتنے اونٹ ذبح کر دینا تمہاری منت پوری ہو جائے گی۔"

عبد المطلب نے مکہ واپس آ کر ایسا ہی کیا مگر قرعہ ہر مرتبہ عبد اللہ کے نام پر نکلتا یہاں تک کہ اونٹوں کی تعداد نوّے تک پہنچ گئی، لیکن دسویں مرتبہ قرعہ ڈالا گیا تو سو (۱۰۰) اونٹوں پر نکل آیا۔ عبد المطلب نے فوراً سو اونٹ ذبح کر دیئے اور لوگوں کو اذنِ عام دے دیا کہ جتنا چاہیں گوشت لے جائیں۔

جناب عبد اللہ کی شادی

جناب عبد اللہ کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو حضرت عبد المطلب نے ان کی شادی قریش کے خاندان بنو زہرہ کے سردار وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی بی بی آمنہ سے کر دی۔ وہ اپنی قوم کی بہترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں اور حسنِ صورت

اور حسنِ سیرت ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کا نسب نامہ کلاب بن مُرّہ پر جنابِ عبداللہ کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔

شجرۂ نسب ملاحظہ ہو:۔

فہر (قریش)
|
غالب
|
لؤی
|
کعب
|
مُرّہ
|
کلاب

قُصیّ	زُہرہ
عبدِ مناف	عبدِ مناف
ہاشم	وہب
عبدالمطّلب	
عبداللہ	بی بی آمنہ
(رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد)	(رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ)

بی بی آمنہ کی بنتِ عم ہالہ بنتِ وہیب سے حضرت عبدالمطّلب نے خود نکاح کرلیا۔ ان سے حضور کے چار چچا حضرت حمزہؓ، مقوّم، مغیرہ اور حجل پیدا ہوئے۔ آپ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بھی ہالہ ہی کے بطن سے تھیں۔

جنابِ عبداللہ کی وفات

شادی کے چند ماہ بعد جنابِ عبداللہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ فلسطین کے شہر غزہ گئے۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے یثرب پہنچے تو بیمار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم مکّہ واپس جاؤ اور میں اپنی دادی کے

خاندان بنو عدی بن نجار کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ ایک مہینہ کی علالت کے بعد وہیں ان کا انتقال ہوگیا اور وہ دارِ نابغہ میں دفن کر دیئے گئے اس وقت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بطنِ مادر میں تھے۔

مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی

جناب عبداللہ کے ساتھیوں نے مکہ پہنچ کر حضرت عبدالمطلب کو ان کی بیماری کی خبر دی تو انہوں نے اپنے بڑے فرزند حارث کو یثرب بھیجا مگر ان سے پہلے ہی جناب عبداللہ فوت ہو چکے تھے۔ حضرت عبدالمطلب کو اپنے لائق اور پیارے فرزند کی وفات کی خبر سُن کر سخت صدمہ پہنچا۔ بی بی آمنہ بھی فرطِ غم سے نڈھال ہوگئیں، مگر رضائے الٰہی کے سامنے سرِ خم کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ ابھی ان کا غم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر دی اس کا سبب یہ ہوا کہ ابرہہ نے کعبہ شریف کے مقابلے میں یمن کے شہر صنعاء میں ایک عالیشان گرجا بنوایا تھا اور حکم جاری کیا تھا کہ لوگ اس گرجے کو کعبہ کی جگہ سمجھیں۔ عربوں کو کعبہ شریف سے بڑی محبت تھی۔ ان کو ابرہہ کے حکم پر سخت غصہ آیا! ان میں سے کسی نے چھُپ کر ابرہہ کے گرجے میں غلاظت پھینک دی۔ ابرہہ کو پتہ چلا تو اس نے ایک زبردست فوج کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی تاکہ کعبہ کو گرا کر اپنے گرجے کی توہین کا بدلہ لے۔ اس کی فوج کے ساتھ چند جنگی ہاتھی بھی تھے۔

عبدالمطلب ابرہہ کے پاس

ابرہہ کی فوج کا ہراول دستہ مکہ کے قریب پہنچا تو اس نے قریش کے بہت سے مویشی پکڑ لیے۔ ان میں حضرت عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھی تھے۔ اب ابرہہ نے اپنا ایک ایلچی اہلِ مکہ کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میرا یہاں آنے کا مقصد کعبے کو ڈھانا ہے اگر تم میرا مقابلہ نہ کرو تو تمہاری مال وجان محفوظ رہیں گے۔

اور تم اپنے سردار کو میرے ساتھ گفت و شنید کے لیے بھیج دو۔ مکّہ کے سب سے بڑے سردار اس وقت حضرت عبدالمطّلب تھے وہ ایلچی کے ساتھ ابرہہ کے پاس چلے گئے۔ ان کی وجاہت اور شاندار شخصیت کو دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اتر کر ان کے پاس آ بیٹھا، پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے آدمیوں نے میرے اونٹ پکڑ لیے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔

یہ سُن کر ابرہہ بہت حیران ہوا اور کہا :

"اے قریش کے سردار! بڑی حیرت کی بات ہے کہ آپ کو اپنے مقدس مقام کا تو کچھ خیال نہیں ہے اور اپنے چند اونٹوں کی فکر ہے۔ آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا ہے۔"

عبدالمطّلب نے جواب دیا :

"ان اونٹوں کا مالک میں ہوں اس لیے ان کو چھوڑنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اس گھر (کعبہ) کا بھی ایک مالک ہے وہ خود اس کی حفاظت کریگا!"

ابرہہ نے طیش میں آکر کہا :

"میں دیکھوں گا کہ کعبہ میرے ہاتھ سے کیسے بچتا ہے، ہاں آپ اپنے اونٹ لے جائیں۔"

حضرت عبدالمطّلب نے واپس آکر قریش سے کہا کہ سب لوگ قریبی پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو۔ پھر وہ قریش کے چند سرداروں کو لے کر حرم میں گئے اور کعبہ شریف کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ ادھر ابرہہ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور پھر مکّہ پر حملہ کے لیے بڑھا۔ اس وقت آسمان پر یکایک ایک خاص قسم کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ نمودار ہوئے جن کی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے تھے۔ انہوں نے یہ سنگریزے ابرہہ کے لشکر

پر برسانے شروع کر دیئے۔ جس پر یہ سنگریزے پڑتے تھے اس کا جسم گل سڑجاتا تھا۔ اس طرح ابرہہ، اس کی فوج اور ہاتھی سب کے سب بُری طرح ہلاک ہوگئے اور کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہو گئے۔ قرآنِ حکیم کی سورۃ "الفیل" میں یہی واقعہ بیان ہوا ہے۔

ظہورِ قُدسی

واقعۂ فیل سے پچاس دن بعد اور بعض روایات کے مطابق پچپن دن بعد۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت　　بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آئے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا

حضرت عبدالمطّلب نے پوتے کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی سے دوڑے دوڑے گھر آئے۔ بچے کو گود میں لے کر منہ سر چوما اور اپنے پیارے فرزند کی یاد میں اشک بار ہوئے۔ ساتویں دن انہوں نے حضورؐ کا عقیقہ کیا اور قریش کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ ان کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنے پوتے کا نام محمدؐ رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں خلق اس کی تعریف کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے آپ کی والدہ ماجدہ نے دودھ پلایا۔ تین دن کے بعد آپ نے چند روز تک بی بی ثویبہؓ کا دودھ پیا جو آپؐ کے چچا ابولہب کی لونڈی تھیں۔ پھر بی بی حلیمہؓ کی قسمت جاگی اور وہ آپؐ کو اپنے ساتھ نجد لے گئیں تقریباً پانچ برس تک آپؐ نے ان کے پاس پرورش پائی پھر وہ آپ کو بی بی آمنہ کے سپرد کر گئیں۔

بی بی آمنہ کی وفات

جب سرکارؐ کی عمر مبارک چھ برس سے کچھ اوپر ہوئی تو بی بی آمنہ آپ کو ساتھ لے کر یثرب گئیں اور خاندان بنو عدی بن نجار کے ہاں ایک ماہ تک قیام کیا۔ اس دوران میں وہ اپنے شوہر کی قبر پر بھی گئیں اور حضورؐ کو بھی یہ قبر دکھائی۔ یثرب سے واپس ہوئیں تو راستے میں بیمار ہو گئیں اور ابواء کے مقام پر فوت ہو گئیں۔ وفادار لونڈی اُمّ ایمنؓ ننھے حضورؐ کو ساتھ لے کر مکہ پہنچیں۔

دادا کے پاس

حضرت اُمّ ایمنؓ نے مکہ آ کر مکہ کے دُرِّ یتیمؐ کو جناب عبدالمطّلب کے سپرد کر دیا۔ بوڑھے دادا نے یتیم پوتے کو سینہ سے لگایا اور نہایت محبت اور شفقت سے آپؐ کی پرورش کرنے لگے۔ وہ آپؐ کو اپنی تمام اولاد سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے آپؐ کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔ آپؐ کو اپنے ساتھ اپنی مسند پر بٹھاتے آپ کا منہ چومتے، آپ کی پشت اور سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہا کرتے، "خدا کی قسم میرے اس بیٹے کی شان ہی کچھ اور ہے۔ یہ اتنے اونچے مرتبے پر پہنچے گا جس پر اس سے پہلے کوئی عرب نہیں پہنچا۔ افسوس کہ دادا کی یہ شفقت حضورؐ کو صرف دو سال حاصل رہی۔ جب آپؐ آٹھ سال کے ہوئے تو حضرت عبدالمطّلب وفات پا گئے۔ حضورؐ کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ جب ان کا انتقال ہو رہا تھا تو آپ ان کے سرہانے کھڑے رو رہے تھے۔

جناب عبدالمطّلب کی رحلت کے بعد حضورؐ کو آپؐ کے چچا جناب ابوطالب نے اپنی کفالت میں لے لیا اور کفالت کا حق نہایت حسن و خوبی سے ادا کیا یہاں تک کہ آپ جوان ہو گئے۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

خیرِ مجسّم رحمتِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

آقائے دوجہاں ساقیٔ کوثر شافعِ محشر فخرِ موجودات سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس مجسّم خیر و برکت اور رحمت و شفقت تھی، اس پر نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ کسی ثبوت کی کیونکہ خود خالقِ کون و مکاں کا ارشاد ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (یعنی ہم نے آپؐ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا) چنانچہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیں اس میں خیر ہی خیر اور رحمت ہی رحمت نظر آئے گی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اور شفقت کسی ایک طبقے کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ آپؐ کا ابرِ رحمت دوست، دشمن، بوڑھے، بچے، عورت، آزاد، غلام، انسان، حیوان، کافر اور مسلمان ہر ایک پر جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا اس ابرِ رحمت کی چھینٹوں نے انسانیت کی بے آب و گیاہ کھیتی کو اس طرح سرسبز اور شاداب کر دیا کہ اس کی طراوت سے آج بھی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ قلم کو یارا نہیں کہ وہ حضورؐ کی رحمت و شفقت کو معرضِ تحریر میں لانے کا حق ادا کر سکے۔ مختلف عنوانات کے تحت کچھ واقعات کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

گلہائے چیدہ

بعثتِ نبوی سے پانچ سال پہلے کا ذکر ہے کہ قریش نے کعبہ شریف کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا آغاز کیا کیونکہ اس کی پرانی عمارت بہت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ تمام اہلِ مکہ نے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب دیواریں

کوئی ڈیڑھ گز اونچی ہو گئیں تو حجر اسود کو دیوار میں ایسی جگہ نصب کرنے کا سوال پیدا ہوا جہاں سے طواف کرنے والوں کو نظر آئے اور وہ بوسہ بھی دے سکیں۔ حجر اسود کی تنصیب ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور قریش کا ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ اعزاز اسے حاصل ہو۔ اس بات پر اتنا جھگڑا ہوا کہ سب قبائل مرنے مارنے پر تل گئے۔ بعض لوگوں نے تو خون بھرا پیالہ سامنے رکھ کر حلف اٹھایا کہ وہ اس اعزاز سے کسی صورت میں دست بردار نہ ہوں گے۔ اس طرح تعمیر کا کام چار پانچ دن تک رک گیا۔ قریب تھا کہ تلواریں نیاموں سے باہر آ جائیں، قریش کے ایک سن رسیدہ شخص ابوامیہ بن المغیرہ مخزومی نے اٹھ کر تجویز پیش کی کہ اے اہلِ قریش ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی بجائے اس بات پر اتفاق کر لو کہ اب جو شخص علی الصبح کعبۃ اللہ میں سب سے پہلے آئے اس کو ثالث بنا لو، سب نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور دوسرے دن صبح کو سب سے پہلے آنے والی ہستی کے لیے چشم براہ ہو گئے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد یکایک ان کی نظر ایک پیکر نورانی پر پڑی۔ نہایت حسین و جمیل چہرہ، آفتاب سے بڑھ کر روشن، میانہ قد، گھنی ڈاڑھی، سیاہ بال سرمگیں آنکھیں۔ تمام قبائلِ قریش بیک زبان پکار اٹھے:

هٰذَا الْاَمِیْنُ، رَضِیْنَا، هٰذَا مُحَمَّدٌ

(یہ امین ہیں۔ ہم راضی ہو گئے۔ یہ تو محمدؐ ہیں)

اب سب لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہو گئے اور یہ قضیہ آپؐ کے سامنے رکھا۔ آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی اور اپنے مبارک ہاتھوں سے حجر اسود کو چادر میں رکھ دیا۔ پھر فرمایا کہ تمام قبیلوں کے نمائندے اس کپڑے کو پکڑ کر حجر اسود کو اوپر اٹھائیں۔ سب نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ مقامِ نصب کے قریب پہنچا تو آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر اس کو دیوار میں لگا دیا۔ یوں قریش ایک طویل اور خوں ریز خانہ جنگی سے بچ گئے۔ اگر اس موقع پر

رحمت عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا وُرُودِ مسعود نہ ہوتا تو قریش ایک دوسرے سے لڑ کر صفحۂ ہستی سے یکسر فنا ہو جاتے۔ حضورؐ چاہتے تو حجرِ اسود کی تنصیب کا شرف صرف اپنے خاندان (بنو ہاشم) کے لیے بھی مخصوص فرما سکتے تھے، لیکن آپؐ کی شانِ رحیمی نے یہ گوارا نہ کیا اور آپؐ کے دریائے رحمت نے ہر قبیلے کو سیراب کر دیا۔

○ آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ اس حالت میں گھر تشریف لائے کہ جسم مبارک کانپ رہا تھا اور آپؐ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرما رہے تھے، مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ آپؐ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب اضطرابی کیفیت دور ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

"اے خدیجہؓ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

پھر آپؐ نے نُزُولِ وحی کا سارا قصہ حضرت خدیجہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہا کو سنایا اور فرمایا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے (اس ڈر کے بہت سے وجوہ علماء نے بیان کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ کو بار بار خیال آتا تھا کہ نُبوّت کے بارِ گراں کو اٹھاتے ہوئے یا اس کی ذمہ داریاں نباہتے ہوئے میری جان نہ چلی جائے)۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فوراً عرض کیا:

"ہرگز نہیں، آپؐ خوش ہو جائیے، خدا کی قسم آپؐ کو اللہ تعالیٰ کبھی رنج میں مبتلا نہ کرے گا۔ آپؐ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں (اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ کے اخلاق کریمانہ ہیں)"

(سیرۃ سرورِ عالمؐ بحوالہ صحیح بخاری، وغیرہ)

اوپر کی دونوں روایتوں سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ حضورؐ بعثت

سے پہلے بھی اور بعثت کے بعد بھی ہمیشہ صاحب خُلقِ عظیم اور خیرِ مجسّم رہے۔

○ مدینہ میں ایک دفعہ قحط پڑا۔ عباد بن شرحبیل نامی ایک بہت غریب آدمی بھوک سے مجبور ہو کر ایک باغ میں گھس گئے۔ کچھ پھل توڑ کر کھائے اور کچھ اپنے پاس رکھ لیے۔ باغ کے مالک نے ان کو پکڑ کر مارا اور پھر کپڑے اتروا لیے۔ عباد حضورؐ کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوئے۔ باغ کا مالک بھی ساتھ تھا۔ اس نے عباد کی چوری کا حال بیان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"یہ جاہل تھا تو تم (نرمی و خوش خُلقی) سے اسے تعلیم دیتے، یہ بھوکا تھا اسے کھانا کھلاتے۔"

پھر آپؐ نے عباد کے کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا۔

(ساٹھ صاع تقریباً ساڑھے تین من کے برابر ہوتے ہیں)

○ یمن کے قبیلہ دَوس کے رئیس حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی کو اللہ نے ابتداء ہی میں قبولِ اسلام کی سعادت سے بہرہ یاب کر دیا تھا لیکن ان کا قبیلہ نہایت سختی سے اپنے کفر و شرک پر جما رہا۔ حضرت طفیلؓ کی تمام کوششیں ان کو راہِ راست پر لانے میں ناکام ہو گئیں تو وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

"یا رسولؐ اللہ! ان بدبختوں کے لیے بددعا فرمائیے۔"

حضورؐ نے فوراً دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی:

"اے اللہ! دَوس کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس لا۔"

(صحیح مسلم)

رحمتِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ سن کر سب لوگ حیران رہ گئے کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ حضورؐ اب بددعا فرمائیں گے اور قبیلۂ دَوس

کے لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

○ مدینہ منورہ میں ایک پاگل عورت تھی۔ ایک دن حضورؐ کے پاس آئی اور آپؐ کا دست مبارک پکڑ کر کہا:

"محمدؐ! مجھے تم سے کچھ کام ہے میرے ساتھ چلو۔"

حضورؐ نے فرمایا: "جہاں کہو جاؤں گا۔"

وہ آپؐ کو ایک گلی میں لے گئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ آپؐ بھی اسی جگہ بیٹھ گئے اور اس کا جو کام تھا وہ کر دیا۔ (صحیح مسلم)

○ مدینہ منورہ کی لونڈیاں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور عرض کرتیں: "یا رسولؐ اللہ میرا فلاں کام ہے۔" آپؐ اپنا کام کاج چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کے ساتھ جا کر ان کے کام کر دیتے۔ ایک دفعہ حضرت خبابؓ بن ارتؓ مدینہ سے دور ایک غزوے پر گئے۔ ان کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتیں دودھ دوہنا نہیں جانتی تھیں۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ ہر روز حضرت خبابؓ کے گھر تشریف لے جاتے اور ان کے جانوروں کا دودھ دوہ دیا کرتے۔ (طبقات ابن سعد)

○ ایک مرتبہ ایک عورت مکہ کی ایک گلی سے گزر رہی تھی۔ اس کے سر پر اتنا بھاری بوجھ تھا کہ وہ مشکل قدم اٹھا سکتی تھی۔ لوگ اس کا تمسخر اڑانے لگے۔ حضورؐ کہیں قریب ہی تھے۔ آپؐ اس عورت کو مشکل میں دیکھ کر فوراً آگے بڑھے اور اس کا بوجھ خود اٹھا کر اس کی منزل پر پہنچا دیا۔

○ ایک دفعہ آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپؐ کا دامن پکڑ کر بولا، میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کر دو۔

آپؐ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام انجام دے کر نماز ادا کی۔ (سیرۃ النبیؐ بحوالہ ابوداؤد، بخاری)

عبداللہ بن اُبَی ساری عمر منافق رہا اور ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا رہا۔ واقعۂ افک میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے والوں کا سرگروہ وہی تھا۔ غزوۂ اُحد میں عین میدانِ کارزار میں اس نے مسلمانوں سے غدّاری کی اور اپنے تین سو حامیوں کو ساتھ لے کر الگ ہو گیا۔ حضورؐ کو اس کی تمام حرکتوں کا علم تھا لیکن آپؐ ہمیشہ درگزر فرماتے۔ جب وہ فوت ہوا تو آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ کو اس کی حرکتوں کی طرف توجہ دلائی لیکن رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متبسّم ہو کر فرمایا:

"اے عمر چھوڑ دو ان باتوں کو۔ اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ میرے ستّر دفعہ نماز پڑھنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں اس سے بھی زیادہ پڑھتا۔" (صحیح بخاری)

○ ایک دفعہ ایک صحابی نے حضورؐ سے کسی کے لیے بد دُعا کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے غضبناک ہو کر فرمایا:

"میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔" (سیرۃ النبیؐ بحوالہ زرقانی)

○ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتے ہیں کہ بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطلق تامّل نہ فرماتے تھے۔ (نسائی و دارمی)

○ ایک دفعہ ایک بدّو (دیہاتی گنوار) نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ دوڑے کہ اسے ڈانٹیں ڈپٹیں اور سزا دیں لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روک کر فرمایا:

"اسے جانے دو اور اس کے پیشاب پر پانی کا ایک بڑا ڈول ڈال کر بہا دو۔ تم لوگ تو دنیا میں آسانی اور نرمی کرنے کے لیے

بھیجے گئے ہو اور لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے مقرر نہیں کیے گئے ہو۔"

پھر اس بدو کو بلا کر فرمایا:

"دیکھو! مسجدیں اللہ کی یاد اور ذکر کے لیے ہیں۔ ان میں پیشاب وغیرہ کرنا منع ہے۔" (صحیح بخاری)

○ ایک دن رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بازار میں جا رہے تھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ایک اندھی عورت ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ بازار کے لوگ اس کو گرتے دیکھ کر ہنسنے لگے لیکن آپؐ بے چین ہو گئے۔ فوراً آگے بڑھ کر اس عورت کو اٹھایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ (سیرۃ نبوی)

○ غزوۂ اُحد میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سر اور پیشانی پر گہرے زخم آئے اور دو دندان مبارک بھی شہید ہو گئے۔ آپؐ سے کہا گیا کہ دشمنوں کے لیے بددعا فرمائیے لیکن بددعا کے بجائے آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

(اے اللہ! میری قوم سے درگزر فرما کیونکہ وہ (میری قوم کے لوگ) نہیں جانتے (نادان ہیں)۔

یعنی ابھی وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے اور نہ میرا مقام و مرتبہ پہچانتے ہیں۔ (مُسند احمد)

○ ایک دفعہ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم (مالِ غنیمت) تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک صاحب آپؐ کو چمٹ گئے۔ آپؐ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس چھڑی سے ان صاحب کو ٹہوکا دیا جس سے ان کے منہ پر خراش آ گئی۔

آپؐ نے فرمایا:

"آؤ مجھ سے بدلہ لے لو۔"

انہوں نے عرض کیا : "یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا۔"

غزوۂ بدر میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ آپؐ مجاہدین کی صفیں درست فرما رہے تھے کہ آپؐ کی چھڑی ایک صحابی کو لگ گئی جن کے قدم صف سے آگے نکلے ہوئے تھے۔ آپؐ نے ان سے بھی بدلہ لینے کے لیے فرمایا لیکن انہوں نے عرض کیا کہ میں نے معاف کر دیا۔ (اُسدُ الغابہ)

○ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قافلے سے پیچھے رہتے، کمزوروں کو (ان کی ہمت بندھا کر) چلاتے (اور جو بالکل چل نہ سکتے) انہیں اپنی سواری پر پیچھے بٹھا لیتے اور ان کے لیے دُعا فرماتے۔ (ابوداؤد)

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص سے کچھ کھجوریں قرض لیں۔ وہ قرض وصول کرنے آیا تو آپؐ نے ایک انصاری سے فرمایا کہ تم میری طرف سے قرضہ ادا کر دو۔ انہوں نے قرض خواہ کو کھجوریں دیں لیکن وہ ویسی نہیں تھیں جیسی اس نے قرض میں دی تھیں۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ انصاری نے کہا :

"تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی کھجوریں لینے سے انکار کرتے ہو ؟"

اس نے جواب دیا :

"ہاں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انصاف نہیں کریں گے تو پھر اور کون کرے گا ؟"

معاملہ حضورؐ تک پہنچا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؐ نے انصاری سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"وہ سچ کہتا ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ ویسی ہی یا اُن سے بہتر کھجوریں دیتے۔"
(ترغیب و ترہیب بحوالہ مُسنداحمد)

کُتبِ سِیَر کے مطابق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جس سے کوئی قرض لیتے تو اس سے بہتر واپس کرتے اور قرض لی ہوئی مقدار سے کچھ زیادہ واپس فرماتے۔

حُسنِ خُلق

خُلق کے لغوی معنی ہیں خُو، عادت اور خصلت کے اور حُسنِ خُلق سے مراد ہے، خوش اخلاقی، ملنساری، مُروّت، اچھا برتاؤ، اچھا رویہ اور اچھے اخلاق۔

یوں تو حُسنِ خُلق کی ترکیب اخلاقِ حسنہ کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے لیکن بطورِ خاص اس کو ملنساری، ہمدردی، شیریں زبانی اور خوش مزاجی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سرورِ کائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی ذاتِ گرامی اخلاقِ حسنہ کا پیکرِ بے مثال تھی اور آپ کا ابرِ کرم مخلوق خدا کے ہر طبقے پر ہر آن جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔ جس ذاتِ اقدس کو خطاب کر کے خود ربِّ ذُوالجلالِ وَالاِکرام نے فرمایا ہو:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

یعنی آپ اخلاق کے نہایت اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔

اور جس کے اُسوہ حسنہ کو یہ کہہ کر تمام مسلمانوں کے لیے نمونہ قرار دیا ہو۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اس ذاتِ پاک کی شمیمِ اخلاق کی عطر بیزیوں کا احاطہ کرنا کسی انسان کے بس کی بات ہی نہیں ــــ لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقَّهٗ

اہلِ سِیَر نے آپؐ کے حُسنِ خُلق کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان کو پڑھ کر زبان بے اختیار آپؐ کی بارگاہِ عالی میں اِس طرح زمزمہ پیرا ہو جاتی ہے:

تو روحِ زمن، رنگِ چمن، ابرِ بہاراں
تو حُسنِ سخن، شانِ ادب جانِ قصیدہ
تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ

امام بخاریؒ نے "ادب المفرد" میں حضرت اُمّ الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبانی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ میزانِ عمل میں کوئی چیز حسنِ خُلق سے بھاری نہ ہوگی۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اور بہت سے دوسرے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو مدتوں حضورؐ کی خدمت میں رہے ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپؐ نہایت نرم مزاج، شیریں زبان، نکوسیرت اور خندہ رو تھے۔ لب ہائے مبارک پر ہمیشہ تبسم رہتا تھا۔ نرمی، وقار اور متانت سے گفتگو فرماتے تھے۔ ایک بات کو دوسری بات سے ملنے نہ دیتے تاکہ سُننے والے اچھی طرح سمجھ سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ خود سلام اور مصافحہ فرماتے۔ جب تک دوسرا شخص ہاتھ نہ چھوڑ دے آپؐ اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ کوئی شخص جُھک کر آپ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے۔

مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو آپؐ کے زانو کبھی شرکائے مجلس سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ مجلسِ نبوی میں جگہ کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے تھے ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی۔ ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو آپؐ خود اپنی جگہ سے سرک کر اس کو اپنے پاس بٹھا لیتے تھے یا اس کے بیٹھنے کے لیے اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔

حضورؐ کو کسی کی کوئی بات ناپسند ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں لوگ ایسا کہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ شخصِ مخصوص کی ذِلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت کو چوٹ نہ لگے۔

○ ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپؐ کو یہ دستور پسند نہ تھا لیکن ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے فرمایا کہ ان سے کہہ دینا کہ اس کو دھو ڈالیں۔

○ ایک مرتبہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا، یہ شخص اپنے قبیلے میں اچھی شہرت نہیں رکھتا خیر آنے دو۔ جب وہ آیا تو آپؐ نے نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی۔ جب وہ چلا گیا تو اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے عرض کی، یا رسولُ اللہ آپؐ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے پھر اس رِفق و ملاطفت کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بُرا وہ آدمی ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔

(صحیحین و سُنن ابی داؤد)

○ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں ضرورت پڑنے پر مدینہ کے ایک یہودی سے قرض لیا کرتا تھا۔ ایک سال اتفاق سے کھجوروں کی فصل خراب ہو گئی اور میں قرضہ واپس نہ کر سکا۔ اس پر پورا سال گزر گیا۔ بہار آئی تو یہودی نے قرض کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ (بدقسمتی سے) اس سال کی فصل سے بھی بہت کم کھجوریں حاصل ہوئیں۔ میں نے یہودی سے آئندہ سال کی مہلت مانگی مگر اس نے انکار کر دیا۔ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام واقعات عرض کیے۔ آپؐ چند صحابہ کو ساتھ لے کر یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور اس کو بہت سمجھایا کہ مہلت دے دو لیکن اس نے یہ کہہ کر صاف جواب دے دیا کہ ابوالقاسم میں ہرگز مہلت نہیں دوں گا۔ اب حضورؐ نخلستان میں تشریف لے گئے اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے

پاس تشریف لائے اور مہلت کے لیے اس سے دوبارہ گفتگو فرمائی لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ میں کسی صورت میں مہلت نہیں دوں گا۔ اس کا جواب سن کر آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ اپنے مسقّف چبوترے پر فرش بچھاؤ۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ آپؐ نے فرش پر کچھ دیر آرام فرمایا۔ بیدار ہوئے تو پھر یہودی کے پاس تشریف لے گئے اور تیسری بار اس سے مہلت کے لیے بات چیت کی لیکن وہ ظالم اب بھی نہ مانا۔ اب آپؐ سیدھے نخلستان پہنچے اور درختوں کے جھنڈ میں کھڑے ہو کر مجھ سے فرمایا:

"جابر! کھجوریں توڑنی شروع کرو۔"

میں نے کھجوریں اتارنی شروع کر دیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرضہ ادا کر کے بھی بچ رہیں۔

(صحیح بخاری باب الرطب التمر)

○ ۸ھ ہجری میں رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم غزوہ حُنَین سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک مقام پر نماز کا وقت آ گیا۔ آپؐ کے مؤذن نے اذان دی۔ اتفاق سے وہاں مکہ کے چند شوخ نوجوان بھی موجود تھے جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ اذان سن کر وہ تمسخر کے طور پر اذان کی نقل اتارنے لگے۔ ان میں سے ایک سولہ سالہ نوجوان ابو محذورہ کی آواز بہت بلند اور دلکش تھی حضورؐ نے ان نوجوانوں کو ڈانٹنے یا سزا دینے کے بجائے ابو محذورہ کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ میرے سامنے اذان کی نقل اتارو۔ چونکہ وہ اذان سے پوری طرح واقف نہ تھے اس لیے حضورؐ نے انہیں خود اذان کے کلمات بتائے۔ انہوں نے لسانِ رسالت سے جو کلمات سنے وہی دہرا دیئے۔ حضورؐ نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا اور برکت کے لیے دعا کی، ساتھ ہی ابو محذورہؓ کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔ حضورؐ نے انہیں ایک تھیلی مرحمت فرمائی جس میں

کچھ چاندی تھی۔ پھر آپؐ نے (خود ہی یا) ابو محذورہؓ کی خواہش پر ان کو مکہ معظمہ میں مسجد حرام کا مؤذن بنا دیا۔ (دار قطنی۔ بذل القوۃ)

○ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم رئیس خزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ واپس آنے لگے تو حضرت سعدؓ نے اپنا گدھا منگایا اور اس کی پشت پر چادر بچھائی پھر اپنے بیٹے حضرت قیسؓ کو حکم دیا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاؤ اور کاشانۂ نبوی تک آپؐ کے ہم رکاب رہو۔

حضورؐ گدھے پر سوار ہوئے تو قیسؓ پا پیادہ ساتھ ہو لیے۔ حضورؐ کے خلقِ عظیم نے گوارا نہ فرمایا کہ قیسؓ پیدل چلیں۔ ان سے فرمایا، میرے ساتھ سوار ہو جاؤ۔ ان کو پاسِ ادب مانع ہوا اور آپؐ کے ساتھ بیٹھنے سے عذر کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، سوار ہو جاؤ یا واپس جاؤ۔ حضرت قیسؓ کو آپؐ کے ساتھ بیٹھنے کی جرأت نہ پڑی اور وہ واپس چلے گئے۔ (سیر انصار جلد دوم)

○ حضرت عقبہ بن عامر جُہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالعموم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کھینچنے (یعنی اس کی لگام یا مہار پکڑ کر آگے چلنے) کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ چشمِ فلک نے عجیب منظر دیکھا۔ وہ ایک طویل سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ راستے میں پہاڑ کا ایک درّہ آیا۔ آپؐ نے حضرت عقبہؓ سے فرمایا، عقبہ آؤ اب تم اونٹ پر سوار ہو جاؤ۔ انہوں نے اسے بے ادبی سمجھا کہ وہ اونٹ پر سوار ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چل رہے ہوں اس لیے انہوں نے اونٹ پر سوار ہونے میں تامّل کیا لیکن جب حضورؐ نے دوبارہ زور دے کر انہیں اونٹ پر سوار ہونے کے لیے فرمایا، تو انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ اب عقبہؓ اونٹ پر سوار تھے اور حضورؐ اونٹ کی مہار پکڑے پاپیادہ چل رہے تھے۔

○ حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان اور مسجد

کے درمیان ایک نشیبی جگہ (وادی) تھی۔ بارش ہوتی تو وہاں بہت پانی جمع ہو جاتا تھا۔ حضرت عتبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بینائی میں فرق آگیا تھا اس لیے ان کے لیے اس پانی میں سے گزر کر مسجد تک پہنچنا سخت مشکل تھا۔ انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

"یا رسول اللہ! میں اپنے محلے کی مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھاتا ہوں لیکن جب بارش ہوتی ہے تو مسجد اور میرے مکان کے درمیان گہرا پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ نظر کی خرابی کی وجہ سے میرے لیے اس پانی میں سے گزر کر مسجد تک پہنچنا سخت مشکل ہوتا ہے اس لیے مجبوراً گھر میں نماز ادا کر لیتا ہوں۔ اگر آپ میرے گھر میں تشریف لا کر نماز پڑھ لیں تو میں اسی جگہ کو نماز کے لیے مخصوص کر لوں۔"

حضورؐ نے ان کی درخواست بخوشی منظور فرمالی اور دوسرے ہی دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لے کر حضرت عتبانؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ اہلِ محلہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی حضرت عتبانؓ کے گھر آگئے۔ حضورؐ نے حضرت عتبانؓ سے پوچھا، کہاں نماز پڑھوں؟ انہوں نے جگہ بتائی تو آپؐ نے وہاں تکبیر کہہ کر دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ آپؐ نے ان کی دعوت قبول کر لی اور کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئے۔ خزیرہ (ایک کھانا جو قیمے پر آٹا چھڑک کر تیار کیا جاتا ہے) دسترخوان پر رکھا گیا۔ محلے کے تمام لوگ کھانے میں آپؐ کے ساتھ شریک ہوئے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا، مالک بن دخشم نہیں آیا وہ منافق ہے۔ حضورؐ نے پوچھا کیا وہ نماز نہیں پڑھتا؟ لوگوں نے کہا، پڑھتا ہے لیکن اس کا میلان منافقوں کی طرف ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے مجھے بدگمانی سے منع فرمایا ہے کیونکہ ان کے اعمال ان کے حسنِ اعتقاد کی شہادت دیتے ہیں۔ جو شخص اللہ کی مرضی کے لیے کلمۂ توحید پڑھتا ہے اللہ اس پر آگ حرام کر دیتا ہے۔

(صحیح بخاری۔ اُسد الغابہ)

○ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ کچھ یہودی لوگ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے (ازراہِ شرارت السَّلامُ عَلَیْکُم کے بجائے) اَلسَّامُ عَلَیْکُم (یعنی تم کو موت آئے) کہا۔

یہ (حضرت عائشہؓ) نے (غضب ناک ہو کر) جواب دیا، تم ہی کو (موت) آئے اور تم پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہو۔

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا، اے عائشہ! (ایسا سخت جواب کیوں دے رہی ہو) اپنی زبان کو روکو، نرمی کا رویّہ اختیار کرو اور سختی اور درشت زبانی سے اپنے کو بچاؤ۔ (صحیح بخاری)

○ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن بندہ نہ زبان سے حملہ کرنے والا ہوتا ہے نہ لعنت کرنے والا اور نہ بدگو اور نہ گالی بکنے والا۔ (جامع ترمذی)

○ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ دوزخ کی آگ ہر ایسے شخص پر حرام ہے جو تیز مزاج نہ ہو، نرم ہو۔ لوگوں سے قریب ہونے والا (ملنسار) ہو اور نرم خو ہو۔ (جامع ترمذی، سُنَن ابوداؤد)

○ حضرت جابر رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی نیکی کی کسی صورت اور کسی قسم کو بھی حقیر مت سمجھے اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو اور یہ بھی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے کہ تم اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈال دو۔ (جامع ترمذی)

○ حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ ہے (یعنی نیکی کی ایک قسم ہے

جس پر ثواب ملتا ہے۔) (صحیح بخاری)

○ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسنِ خلق کی وجہ سے قائم اللیل اور صائم النہار کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

○ حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدخلقی اعمال کو ایسا ہی خراب کر دیتی ہے جیسے سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے۔ (کنز العمال)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ وہ کیا چیز ہے جس کی مداومت لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی۔ آپؐ نے فرمایا، اللہ کا ڈر اور خوش خلقی۔ (ترمذی شریف)

○ حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو (معاملہ اور برتاؤ میں اکھڑ اور سخت نہ ہو، بلکہ) عاجز ول کمزوروں کا سا اس کا رویہ ہو اور اس لیے لوگ اس کو کمزور سمجھتے ہوں (اور اللہ کے ساتھ اس کا تعلق ایسا ہو کہ) اگر وہ اللہ پر قسم کھائے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دکھائے اور کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھا کر باہر نکلتے تو مدینہ والوں کے خدام اپنے اپنے برتن لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ برتنوں میں پانی ہوتا تھا۔ سخت سرد موسم میں بھی آپؐ پانی میں اپنے دستِ مبارک ڈال کر برتن ان کو واپس کر دیتے۔ (اہلِ مدینہ اس پانی کو متبرک سمجھتے تھے)۔ (صحیح مسلم)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نرم مزاجی اور خوش خلقی اللہ تعالیٰ نے رسولِ رحمت

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی فطرتِ پاک ہی میں ودیعت کی تھی۔ سورۂ آلِ عمران میں آپ کو مخاطب کرکے یوں فرمایا گیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪

(آیۃ ۱۵۹)

(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تُندخُو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔)

اس ارشادِ ربانی سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کو دینِ حق کی طرف راغب کرنے میں رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی نرم مزاجی (خوش خُلقی، شیریں کلامی) نے بنیادی کردار ادا کیا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے عامۃ المسلمین کو بھی نہ صرف خوش خُلقی کی تلقین اور تاکید فرمائی بلکہ ان کو ایسی تمام باتوں سے بھی منع فرمایا جو باہمی تعلقات پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

"تم دوسروں کے بارے میں بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ جاسوسوں کی طرح کسی کے عیب ڈھونڈنے کی کوشش کیا کرو، نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو۔ نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بغض اور کینہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو بلکہ اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔"

حُسنِ تکلّم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو میں بے پناہ تاثیر و حلاوت کے ساتھ کمال درجے کی فصاحت و بلاغت بھی ہوتی تھی (اس کی تفصیل "افصح العرب" کے عنوان کے تحت بیان کی گئی ہے) اندازِ تکلم یہ تھا کہ آپؐ جلدی جلدی بات نہ کرتے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، اس قدر آہستہ کہ اگر کوئی آپؐ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے جملوں یا الفاظ کو گننا چاہتا تو گن لیتا۔ ایک ایک بات کو آپؐ تین تین مرتبہ فرماتے۔ جس بات پر زور دینا ہوتا، بار بار اس کو دہراتے۔ گفتگو کا ایک ایک جملہ اس طرح الگ ہوتا کہ سننے والے کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتا تھا۔ حافظہ کی تیزی عربوں کی نمایاں خصوصیت تھی وہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو نہایت آسانی سے یاد کر لیتے تھے۔ اسی کے نتیجے میں احادیث نبویؐ کا عظیم الشان ذخیرہ معرضِ وجود میں آیا۔ گفتگو کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اکثر آسمان کی طرف ہوتی تھی۔

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز قدرتی طور پر بلند تھی۔ آپؐ کی چچا زاد بہن حضرت اُمِّ ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے اور ہم لوگ اپنے گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے۔

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اوقات بازار جانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ بازار میں آپؐ کبھی آواز بلند نہ کرتے تھے اور نظریں جھکا کر چلتے تھے۔

(بخاری، مسلم، ابن ماجہ)

○ حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے۔ آپؐ کی گفتگو کا ایک ایک فقرہ الگ، صاف اور واضح ہوتا تھا۔ کوئی اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ اٹھاتے۔ کسی بات پر تعجب

کا اظہار کرنا ہوتا تو ہتھیلی کا رُخ پلٹ دیتے۔ دوران گفتگو میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور کبھی مسرّت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی کر لیتے۔ (شمائل ترمذی)

خندہ و تبسّم

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسی آتی تو آپ مسکرا دیتے تھے۔ کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آپؐ کسی بات پر (بعض موقعوں پر) اس قدر ہنسے کہ نواجذ (ڈاڑھ کے دانت) نظر آنے لگے لیکن حافظ ابن قیم اور بعض دوسرے ارباب سیر نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپؐ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں۔ (سیرۃ النبیؐ)

شرم و حیا

"شرم وحیا" اخلاق حسنہ کی ایک شاخ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی صفت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حیا ایمان کی علامت ہے اور ایمان جنّت کا ذریعہ ہے اور بے حیائی گندگی ہے اور گندگی دوزخ کا موجب ہے۔

(مشکوٰۃ شریف عن ابی بکرہؓ)

ایک اور حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اُمّت تک پہنچایا ہے کہ حیا اور ایمان ہمیشہ ساتھ اور اکٹھے رہتے ہیں جب ان دونوں میں سے کوئی ایک اٹھا لیا جائے تو دوسرا بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔

(شعب الایمان للبیہقیؒ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں شرم وحیا کی صفت بدرجہ کمال پائی جاتی تھی۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ جب آپؐ

کو کوئی چیز ناگوار ہوتی تھی تو اس کا اثر آپؐ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو جاتا تھا۔

(صحیح بخاری)

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کے متعلق کسی برائی کی اطلاع ملتی تو آپؐ اس کا نام لے کر یہ نہ فرماتے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ آپؐ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا کہتے ہیں یا ایسا کرتے ہیں۔ شرم و حیا کی وجہ سے ناپسندیدہ کام کرنے والے کا نام نہ لیتے۔

(سنن ابی داؤد)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی فحش بات زبان سے نہ نکالتے۔

(صحیح بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے زبانی بیعت لیتے۔ کسی (غیر) عورت کے ہاتھ کو آپؐ نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ (صحیح بخاری)

اگر کوئی خطا کار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پشیمانی کا اظہار کرتا اور عفوِ تقصیر کا خواستگار ہوتا تو آپؐ شرم و حیا سے گردن مبارک جھکا لیتے تھے۔

(شمائلِ کبریٰ بحوالہ ترمذی و شفا)

عرب میں گھروں کے اندر بیت الخلا نہیں تھے۔ لوگ رفع حاجت کے لیے باہر میدانوں میں جاتے تھے لیکن وہ کسی اوٹ میں نہیں بیٹھتے تھے بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جاتے تھے اور آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ایسا کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا اور اس قسم کی حرکت کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا موجب قرار دیا۔

(ابوداؤد و ابن ماجہ)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ رفع حاجت کے لیے شہر سے اس قدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ مکہ معظمہ میں جب تک آپؐ کا قیام رہا آپؐ حدودِ حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ

سے کم از کم تین میل تھا۔ (سیرۃ النبیؐ)

عرب میں برہنہ ہو کر لوگوں کے سامنے غسل کرنا عام بات تھی۔ کعبہ کا طواف بھی لوگ ننگے ہو کر کرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حیائی کے اس طریقے سے سخت نفرت تھی۔ آپؐ نے حیا کو دین اسلام کا خلق قرار دیا اور لوگوں کو سرِ عام ننگے ہو کر نہانے اور برہنہ ہو کر طواف کعبہ کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حمام سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ لوگوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ حمام میں نہانے سے میل دور ہو جاتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا، اچھا تو نہاتے وقت پردہ کر لیا کرو۔

سُنَنِ ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو مسلمانوں کو حمام میں غسل کرنے سے بالکل منع کر دیا تھا پھر مردوں کو پردے کی پابندی کی شرط کے ساتھ اجازت دے دی۔ البتہ عورتوں کے لیے حمام میں جا کر نہانے کی ممانعت برقرار رہی۔

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپؐ فرماتے تھے کہ

"جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی اور جگہ کپڑے اتارتی ہے اللہ اسے بے پردہ کر دیتا ہے۔"

(شمائل کبریٰ و سیرۃ النبیؐ بحوالہ ترغیب و ترتیب)

حلم و تحمل

اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب انسانوں سے بڑھ کر حلیم الطبع بنایا تھا اور آپؐ کو غیر معمولی قوت برداشت عطا فرمائی تھی۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا مگر جب آپؐ کسی کو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حرمت کو توڑتے دیکھتے تو محض اللہ کے لیے ضرور انتقام لیتے۔ (صحیحین۔ الشفاء للقاضی عیاضؒ)

مکہ میں مشرکین قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور بدزبانی کی انتہا کر دی تھی۔ کبھی آپؐ پر اختلال دماغ کی تہمت لگاتے کبھی آپؐ کو جادوگر کہتے، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ یہاں تک کہ آپؐ کو محمدؐ (تعریف کیا گیا) کے بجائے مُذَمَّم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے (نعوذ باللہ) لیکن آپؐ اس کے جواب میں نہایت صبر و تحمل سے کام لیتے تھے اور اپنے احباب سے صرف اسی قدر فرماتے، تمہیں تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے وہ مُذَمَّم کو گالیاں دیتے ہیں اور مُذَمَّم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمدؐ ہوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

○ دعوت حق کے ابتدائی سالوں میں مشرکین نے اسلام قبول کرنے والے سعید الفطرت لوگوں پر سخت ظلم توڑے۔ جو شخص بھی دعوت حق پر لبیک کہتا مشرکین اس کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ایسے ہی مظلوموں میں مشہور صحابی حضرت خباب بن الارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ جب کفار کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہتے ان کو کافی عرصہ گزر گیا تو ایک دن ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور وہ فریاد لے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت کعبہ شریف کی دیوار کے سائے میں ردائے مبارک

سر کے نیچے رکھے لیٹے ہوئے تھے۔ حضرت خبابؓ نے اپنی داستانِ اَلَم حضورؐ کو سنائی اور پھر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! آپؐ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو غارت کرے اور ہمیں ان کے مظالم سے نجات دے۔ ان کی باتیں سُن کر حضورؐ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ آپؐ کا چہرۂ اقدس (جلالی کیفیت سے) سرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا:

"(ابھی سے گھبرا گئے) تم سے پہلے تو ایسے لوگ بھی گزر چکے ہیں کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا۔ ان کے سروں پر آرے چلائے گئے۔ چیر کر بیچ سے دو کر دیے گئے لیکن انہوں نے اُف تک نہ کی اور دین کو نہ چھوڑا۔ اللہ اس دین کو ضرور کامیاب کرے گا اور تم دیکھو گے کہ اکیلا سوار صنعاء (یمن) سے حضرموت تک تنہا سفر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کسی کا ڈر نہ ہوگا۔"

حضورؐ کے ارشادات سُن کر حضرت خبابؓ خاموشی سے اپنے گھر چلے گئے اور ہجرتِ مدینہ تک راہِ حق میں ہر قسم کی سختیاں بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ جھیلتے رہے۔

○ نبوّت کے چوتھے سال جب رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اہلِ مکہ کو علانیہ حق کی طرف بُلانا شروع کیا تو گنتی کی چند سعادت مند روحوں کے سوا سب لوگ آپؐ کے دشمن بن گئے اور آپؐ کی مخالفت اور ایذا رسانی پر کمر باندھ لی۔ آپؐ کے قریبی ہمسایوں ابولہب، عُقبہ بن ابی مُعیط اور حکم بن عاص وغیرہ نے تو کمینگی کی انتہا کر دی۔ یہ لوگ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو گھر میں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ کبھی آپؐ نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اوپر سے بکری کا اوجھ یا کوئی اور چیز آپؐ پر پھینک دیتے۔ ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل ہر روز رات کو آپؐ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی

تاکہ آپؐ یا آپؐ کے اہلِ خانہ باہر نکلیں تو ان کے پاؤں میں کانٹے چبھ جائیں۔ آپؐ چھ سات سال تک ان لوگوں کی یہ ذلیل اور گھٹیا حرکتیں نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ ان کے جواب میں اگر آپؐ نے کبھی کچھ کیا تو زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرمایا:

"اے بنی عبدِ مناف! یہ کیسی ہمسائگی ہے؟"

(یعنی تم لوگ ہمسائگی کا حق خوب ادا کر رہے ہو)

(ابنِ ہشام، ابنِ جریر، بلاذری، بیہقی، ابنِ ابی حاتم)

○ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا چچا ابولہب اسلام کا بدترین دشمن اور نہایت گھٹیا ذہن کا مالک تھا۔ آپؐ جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے وہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں سے کہتا کہ یہ (رسولِ اکرمؐ) تم کو لات اور عُزّیٰ سے پھیر کر اس نئے دین اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ تبلیغِ حق کے سلسلے میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم باآوازِ بلند پکارتے جاتے تھے کہ لوگو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو فلاح پاؤ گے۔ ابولہب آپؐ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور آپؐ کو پتھر مارتا جاتا تھا یہاں تک کہ آپؐ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئی تھیں۔ ساتھ ہی وہ کہتا جاتا، یہ جھوٹا ہے اس کی بات نہ مانو۔

رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کی ظالمانہ اور گھٹیا حرکتوں کا کبھی کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ سب کچھ نہایت صبر و تحمل سے برداشت کرتے اور اپنے کام (تبلیغِ حق) میں مصروف رہتے تھے۔

(مُسندِ احمد، طبرانی، بیہقی، ابنِ حبان، طبری، نسائی)

○ ابولہب کی طرح بنو مخزوم کا سردار ابوجہل بھی دینِ حق کا سخت دشمن

تھا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ سنہ ۶ بعد بعثت کا ذکر ہے کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفا (بروایت دیگر حجون) کے پاس سے گزر رہے تھے (بعض روایتوں کے مطابق اس جگہ کے قریب آپؐ لوگوں کو دعوت توحید دے رہے تھے) کہ ابوجہل کا گزر اس طرف ہوا۔ آپؐ کو دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ آپؐ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا ساتھ ہی اُس نے دینِ حق کے بارے میں نہایت بُرے الفاظ استعمال کیے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ابوجہل نے آپؐ پر مٹی اور گوبر بھی پھینکا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر بکتا جھکتا چلا گیا اور حضورؐ بھی تشریف لے گئے۔ بنو تیم کے ایک رئیس عبداللہ بن جُدعان کی آزاد کردہ ایک لونڈی قریب ہی اپنے گھر میں بیٹھی یہ سارا واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اتفاق سے حضورؐ کے چچا (اور دودھ شریک بھائی) حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آتے ہوئے اس کے گھر کی طرف سے گزرے تو اُس نے کہا:

"ابو عمارہ! کاش تھوڑی دیر پہلے تم یہاں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ عمرو بن ہشام (ابوجہل) نے تمہارے بھتیجے کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا۔ نہایت سخت گالیاں دیں اور بُری طرح ستایا لیکن ابن عبداللہ نے کچھ جواب نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔"

حضرت حمزہؓ نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن اس واقعہ کا حال سُن کر وہ غضبناک ہو گئے اور حرم میں پہنچ کر ابوجہل کو خوب زدوکوب کیا پھر گھر جا کر رات بھر حضورؐ کی دعوت پر غور کرتے رہے۔ صبح اٹھ کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے کچھ گفتگو کے بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ یہ آپؐ کا صبر و تحمل ہی تھا جس نے حضرت حمزہؓ کو غیرت دلائی اور آستانۂ اسلام پر جھکا دیا۔ (الاصابہ، اُسد الغابہ، سیرۃ سرورِ عالمؐ)

○ حضرت بہز بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میری قوم کے کچھ لوگوں کو کسی الزام میں گرفتار کرکے محبوس کر دیا۔ اس پر میری قوم کا ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت خطبہ دے رہے تھے۔ اس نے آتے ہی (آپؐ کے خطبہ ختم کرنے کا لحاظ کیے بغیر) حضورؐ سے مخاطب ہو کر کہا، اے محمدؐ! آپؐ نے میرے ہم قوم ہمسایہ لوگوں کو کیوں قید میں ڈال رکھا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر وہ شخص بولا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ (دوسروں کو) شر اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور خود خلوت میں (نعوذ باللہ) وہی کام کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (لوگوں سے) فرمایا، یہ شخص کیا کہتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس آدمی کے درمیان حائل ہو گیا اور باتیں کرنے لگا مبادا کہ وہ شخص اپنی بات دہرائے اور حضورؐ اس کی بات سن لیں اور پھر اس کی بدزبانی کی وجہ سے میری قوم کے لیے ایسی بددعا کردیں کہ جس کے بعد وہ کبھی فلاح نہ پا سکے۔ مگر حضورؐ اس کی بات پوری توجہ کے ساتھ سننے لگے یہاں تک کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کیا کہتا ہے (غالباً اس شخص نے اپنی بات کو دہرایا یا بار بار کہا) پھر آپؐ نے فرمایا، کیا یہ لوگ میرے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں اور کیا یہ شخص ایسی الزام تراشی کرنے والے لوگوں میں سے ہے؟ خدا کی قسم اگر میں ایسا کروں (کہ کہوں کچھ اور کروں کچھ) تو ان دوسرے لوگوں کا گناہ مجھ پر ہو اور ان کو کچھ گناہ نہ ہو۔ یہ فرما کر آپؐ نے (اس شخص کو سزا دینے کے بجائے) حکم دیا کہ اس شخص کی قوم کے لوگوں کو قید سے رہا کر دیا جائے۔

(مُسند احمد بن حنبلؒ جلد دوم)

○ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑوں کا صرف

ایک ہی جوڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی دبیز اور بوسیدہ تھا۔ پسینہ آتا تو کپڑوں میں جذب ہو کر ان کو اور بوجھل کر دیتا جس سے آپؐ کو تکلیف ہوتی۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں مدینہ کے ایک یہودی نے شام سے کپڑا منگوایا۔ اس وقت کپڑا خریدنے کے لیے آپؐ کے پاس دام نہیں تھے۔ اُمّ المُؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عنہا نے عرض کیا، لباس کے لیے ایک جوڑے کا کپڑا اس سے قرض منگوا لیجیے۔ حضورؐ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا لیکن اس بدبخت نے کپڑا دینے کے بجائے یہ بکواس کی:

"میں سمجھ گیا اس طرح کپڑا منگوانے کا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی ہضم کر جائیں اور قیمت ادا نہ کریں۔"

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اس کے بیہودہ جواب کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے صرف اتنا فرمایا:

"وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ احتیاط کرنے والا اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔"

(جامع ترمذی باب البیوع)

○ ایک مرتبہ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کچھ مال تقسیم کیا۔ ایک شخص نے تقسیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

"اے اللہ کے رسول! اللہ سے ڈرو اور انصاف کرو۔"

یہ اعتراض انتہائی اشتعال انگیز تھا لیکن حضورؐ نے صبر و ضبط سے کام لیا اور صرف اتنا فرمایا:

"جب اللہ اور اس کا رسول انصاف نہ کرے گا تو اور کون انصاف کرے گا؟ اللہ تعالیٰ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام پر رحم فرمائے وہ اس سے بھی زیادہ ستائے گئے تھے (یعنی

موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان کے سامنے کئی مرتبہ اس سے بھی زیادہ گستاخانہ باتیں کی تھیں۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

○ ایک مرتبہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرضہ دیا، پھر بڑی سختی سے اس کی واپسی کا تقاضا کیا۔ صحابہ کرامؓ نے چاہا کہ اس کے گستاخانہ رویہ پر اسے تنبیہ کریں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اسے چھوڑ دو اس لیے کہ حق والے کو کہنے کا حق ہے۔"

(صحیح بخاری کتاب الوکالۃ)

○ ایک مرتبہ لبید بن عاصم یہودی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا۔ (آپؐ کو اس کی اس حرکت کا علم ہو گیا) لیکن آپؐ نے اسے کوئی سزا نہ دی بلکہ فرمایا:

"میں نہیں چاہتا کہ اس واقعہ کے ذریعے لوگوں میں (اس کی) بُرائی پھیلاؤں (یا بروایتِ دیگر آپؐ نے فرمایا) میں لوگوں میں شورش پیدا نہیں کرنا چاہتا)"

(صحیح بخاری کتاب الادب)

عفو و درگزر

دوستوں اور دشمنوں سب کی غلطیوں اور زیادتیوں سے چشم پوشی کرکے ان کو معاف کر دینا عفو و درگزر ہے۔ یہ ایک بہترین اخلاقی وصف ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا اجر و ثواب ہے۔ قرآنِ حکیم میں فرمایا گیا ہے:

"ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور

دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔

(سورۃ آل عمران آیۃ ۱۳۴)

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی میں عفو و درگزر کا وصف بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ کسی سے بدلہ لینا تو کجا آپؐ نے اپنے بدترین دشمنوں پر بھی قابو پا کر ان کو یکسر معاف فرما دیا۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں عفو و درگزر کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

○ کفارِ مکہ تیرہ سال تک سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور آپؐ کے نام لیواؤں کو ستاتے رہے۔ ظلم و ستم کا کوئی حربہ نہ تھا جو انہوں نے پرستارانِ حق پر نہ آزمایا ہو حتیٰ کہ وہ گھر بار اور وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور پھر مدینہ منورہ میں بھی آٹھ سال تک انہوں نے اہلِ حق کو اطمینان سے نہ بیٹھنے دیا۔ ۸ سنہ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو اسلام کے یہ بدترین دشمن مکمل طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر تھے اور آپؐ کا ایک اشارہ ان سب کو خاک و خون میں لوٹا سکتا تھا، لیکن ہوا کیا؟ آپؐ نے تمام جبارانِ قریش سے جو خوف اور ندامت سے سر نیچے ڈالے آپؐ کے سامنے کھڑے تھے، پوچھا:

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟"

انہوں نے دبی زبان میں جواب دیا:

"اے صادق، اے امین تم ہمارے شریف بھائی اور برادر زادے (بھتیجے) ہو۔ ہم نے تمہیں ہمیشہ رحم دل پایا ہے۔"

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان پر ایک شفقت بھری نگاہ

ڈالی اور فرمایا:

"جاؤ آج تم پر کچھ الزام نہیں، تم سب آزاد ہو۔"

(سیرۃ النبیؐ)

○ عمیر بن وہب قبولِ اسلام سے پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ غزوۂ بدر کے چند دن بعد وہ ایک زہر آلود تلوار لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادے سے مدینہ آئے لیکن پکڑے گئے۔ جب آپؐ کے سامنے پیش کیے گئے تو آپؐ نے معاف فرما دیا۔ آپؐ کی شانِ عفو نے ان کو اتنا متاثر کیا کہ فوراً حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

(اُسد الغابہ)

○ ۱۰ سنہ بعد بعثت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے تو اہلِ طائف نے آپؐ کے ساتھ سخت بدسلوکی کی۔ آپؐ پر پتھر برسائے اور اوباش لونڈوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ ان لوگوں نے عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو پس پُشت ڈال کر جو ظلمِ عظیم آپؐ پر کیا وہ ان کی شقاوتِ قلبی کا آئینہ دار تھا اور اس کی بنا پر وہ بدترین سزا کے مستحق تھے لیکن حضورِ پُرنورؐ کی شانِ رحمۃ للعالمینی ملاحظہ ہو کہ ۹ سنہ ہجری میں جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عرب پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا، اہلِ طائف کا ایک وفد بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوا تو آپؐ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس کی پذیرائی کی اور اہلِ وفد کو مسجدِ نبوی کے صحن میں خیمے نصب کرا کے ٹھہرایا۔ جب تک مدینہ منوّرہ میں اُن کا قیام رہا آپؐ نے اُن کی خاطر مدارات کا نہایت عمدہ انتظام کیا اور ایک دفعہ بھی اس بدسلوکی اور ظلم کی طرف اشارہ تک نہ کیا جو انہوں نے چند سال پہلے طائف میں آپؐ سے روا رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر واپس گئے۔ (سیرۃ النبیؐ)

○ ایک دفعہ ایک مُشرک حُضُور صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کو شہید کرنے کے ارادے سے مدینہ آیا۔ مسلمان اس کا عزم بد بھانپ گئے اور اسے گرفتار کر کے حُضُور صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کے سامنے پیش کیا۔ رُعبِ نُبُوَّت سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آپؐ نے فرمایا :

"ڈرو نہیں ! اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے بھی تو اللہ تمہیں اس پر قادر نہ کرتا۔"

یہ فرما کر آپؐ نے اسے آزاد کرنے کا حکم دیا۔

(مُسنَدِ احمد)

○ غزوۂ اُحُد میں حُضُور پُرنُور صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کو شہید کرنے کے لیے کفّار نے سرتوڑ کوشش کی، آپؐ کو زخمی کیا اور دو دندانِ مبارک شہید کر ڈالے۔ لیکن جب صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ :

"یا رسولؐ اللہ ! ان کے لیے بد دُعا کیجئے۔"

تو آپؐ نے فرمایا :

"الٰہی میری قوم کو ہدایت دے، وہ مجھے نہیں جانتے۔"

(سیرۃ النّبیؐ)

○ وحشیؓ بن حرب نے غزوۂ اُحُد میں حُضُور صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کے جاں نثار چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو شہید کیا تھا۔ ان کی اس حرکت سے حُضُور صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ مکّہ فتح ہوا تو وحشیؓ بھاگ کر طائف چلے گئے۔ پھر وہاں سے اہلِ طائف کے وفد میں شامل ہو کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر کے معافی کے خواستگار ہوئے اگرچہ ان کا جُرم بہت سنگین تھا لیکن آپؐ نے انہیں معاف فرما دیا اور صرف اتنا کہا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو کیونکہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے چچا

کی یاد آ جاتی ہے۔ (اُسدُ الغابہ)

○ ثمامہ بن اُثال یمامہ (نجد) میں آباد قبیلہ بنو حنیفہ کے سربرآوردہ رؤسا میں سے تھے۔ وہ اپنی اسلام دشمنی میں مشہور تھے اور مشرکین قریش سے گہرا ربط و ضبط رکھتے تھے۔ فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے آنحضُور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک فوجی دستہ گشت کے لیے نجد کی طرف بھیجا۔ اتفاق سے ثمامہ بن اثال اس دستے کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ انہیں مدینہ لا کر حضُور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ

" انہیں مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا جائے تاہم اس کے کھانے پینے کا اچھی طرح خیال رکھا جائے۔"

عشاء کی نماز کے بعد حضُورؐ ثمامہ کے پاس تشریف لائے اور ان سے پوچھا:

" کہو ثمامہ کیا ارادہ ہے؟ (یعنی اسلام کی مخالفت چھوڑو گے یا نہیں؟)

ثمامہ نے جواب دیا:

" اے محمدؐ! اگر مجھے قتل کرو گے تو میں واقعی قتل کیے جانے کے لائق ہوں (یا بروایتِ دیگر ایک خونی کو قتل کرو گے) اور اگر رہا کر دو گے تو مجھے احسان شناس اور شکر گزار پاؤ گے اگر زرِ فدیہ مطلوب ہو تو جو مانگو گے دوں گا۔"

یہ جواب سُن کر حضُور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ثمامہ کو اسی طرح چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ دوسرے دن بھی حضُورؐ اور ثمامہ کے درمیان ایسی ہی گفتگو ہوئی لیکن حضُورؐ نے کوئی فیصلہ نہ کیا، تیسرے دن پھر اسی قسم کی گفتگو ہو چکی تو حضُورؐ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو آزاد کر دو۔ حضُورؐ کے اس حُسنِ سلوک کا ثمامہ کی طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ مسجد سے باہر نکل کر

ایک درخت کی آڑ میں غسل کیا اور مسجد میں واپس آکر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے پھر یوں عرض پیرا ہوئے :

"یا رسول اللہ ! آج سے پہلے دنیا میں کوئی آدمی میرے نزدیک آپؐ سے بڑھ کر مبغوض نہ تھا لیکن اب آپؐ سے بڑھ کر مجھے کوئی محبوب نہیں کوئی دین آپ کے دین سے زیادہ میرے نزدیک بُرا نہ تھا، اب یہی دین مجھے سب سے پیارا ہے۔ کوئی شہر مدینہ سے زیادہ ناپسند نہ تھا، اب یہی شہر مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

(صحیح بخاری، دُرِّ منثور)

○ حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ قبولِ اسلام سے پہلے دینِ حق کے سخت دشمن تھے کئی بار مدینہ پر چڑھائی کرنے والے کافروں کی قیادت کی لیکن جب فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی وساطت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تو آپؐ نے نہ صرف ان کو معاف فرما دیا بلکہ یہ اعلان بھی کر دیا کہ جو ان کے گھر میں پناہ لے گا اسے بھی امان ہے۔

حضرت ابوسفیانؓ کی اہلیہ ہند بھی مسلمانوں کی سخت دشمن تھیں۔ انہوں نے غزوۂ اُحد میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا جگر چبایا تھا لیکن جب مکہ کی فتح کے بعد وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام قبول کیا تو آپؐ نے انہیں معاف فرما دیا اور اُحد کے واقعہ کا ذکر تک نہ کیا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

○ ہبارؓ بن الاسود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ آپؐ کی پیاری بیٹی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکے سے

ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں تو ہبار نے دوڑ کر اپنے نیزے سے حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اونٹ سے گرا دیا۔ ان کو ایسی سخت چوٹ آئی کہ اس واقعہ کے بعد بہت تھوڑا عرصہ زندہ رہیں ـــــ لیکن فتح مکہ کے بعد ہی ہبار جب بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر اسلام لائے اور معافی کے خواستگار ہوئے تو آپؐ نے انہیں معاف فرما دیا۔

(اُلاصابہ)

○ فرات بن حیان قبولِ اسلام سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے اور آپؐ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ سردارِ قریش ابو سفیان نے ان کو مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور کر رکھا تھا۔ ایک دفعہ وہ اسی کام کے لیے مدینہ گئے وہاں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ انہیں قتل کرنے کے لیے لے جا رہے تھے کہ انصار کے ایک محلے میں پہنچ کر بآوازِ بلند کہنے لگے:

"میں مسلمان ہوں۔"

ایک انصاری نے دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ فرات بن حیان اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔

آپؐ نے حکم دیا:

"فرات بن حیان کو چھوڑ دو۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ایمان کا حال ہم انہی پر چھوڑتے ہیں۔"

فرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حسنِ سلوک سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کچھ عرصہ کے بعد صدقِ دل سے مشرف بہ اسلام ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمامہ میں ایک زمین عطا فرمائی۔

(اُلاِصابہ)

○ اسلام کے بدترین دشمن ابوجہل کے بیٹے عکرمہ بھی اسلام دشمنی میں باپ کے مثنیٰ تھے۔ کئی لڑائیوں میں مسلمانوں کے خلاف بھرپور حصّہ لیا۔ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مکّہ پر پرچم اسلام بلند فرمایا تو عکرمہ یمن جانے کی نیّت سے بھاگ کر ساحلِ سمندر پر پہنچ گئے۔ اِدھر ان کی اہلیہ اُمِّ حکیم بنتِ حارث شرف اسلام سے بہرہ ور ہو گئیں۔ ان کو اپنے شوہر سے بے حد محبّت تھی۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس وعدہ کے ساتھ کہ میں اپنے شوہر کو بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر کر دوں گی، عکرمہ کے لیے امان کی درخواست کی۔ حضورؐ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور وہ شوہر کو واپس لانے کے لیے ساحلِ بحر کی طرف روانہ ہوئیں۔

اُدھر عکرمہ یمن جانے والی ایک کشتی پر سوار ہو چکے تھے۔ اللہ کی قدرت جب یہ کشتی ساحل سے کچھ دُور گئی تو اس کو طوفانِ باد نے آلیا اور وہ تند ہَوا کے تھپیڑے کھاتی واپس اسی جگہ آ گئی جہاں سے چلی تھی۔ عین اسی وقت حضرت اُمِّ حکیمؓ بھی ساحلِ بحر پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے شوہر کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ واپس جانے پر رضامند کر لیا۔ وہ جونہی عکرمہ کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئیں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرطِ مسرّت سے یہ فرماتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے:

مَرحَبًا بالراکب المہاجر

خوش آمدید اے ہجرت کرنے والے سوار

مَرحَبًا بالراکب المہاجر

خوش آمدید اے ہجرت کرنے والے سوار

عکرمہ نے صدقِ دل سے کلمۂ شہادت پڑھا اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

سے اپنے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ آپؐ نے اُسی وقت دستِ دعا اٹھائے اور بارگاہِ ربّ العزت میں یوں دُعا کی:

"الٰہی ہر وہ عداوت جو اس شخص نے
میرے ساتھ برتی، اس کی ہر وہ کوشش
اور لشکر کشی جو اس نے تیرے نور کو
بجھانے کے لیے کی اور اس کی ہر وہ بات
جو اس نے میرے رُوبرُو یا پسِ پشت میری
آبرو ریزی کے لیے کی، ان سب کو معاف
فرما دے۔"

(اس کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کے جانباز سپاہی بن گئے اور اپنے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے چند سال بعد جنگِ یرموک میں شہادت پائی۔)

(الاصابہ، اُسد الغابہ، المشاہد)

صدق و امانت

صدق یعنی راست گفتاری اور امانت یعنی امانت داری یا دیانت داری ایسی اعلیٰ اخلاقی صفتیں ہیں جن پر قول اور عمل کی دُرستی کا انحصار ہے اور جن کو رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایمان اور اسلام کا لازمہ قرار دیا ہے۔

اللہ کے رسولوں اور نبیوں میں دوسرے مکارمِ اخلاق کی طرح یہ دو صفتیں بھی بدرجۂ اُتم پائی جاتی تھیں۔ بالفاظِ دیگر اُن کی سیرت و کردار

کا لازمی حصہ ہوتی تھیں اور ان کی فطرت ہی میں ودیعت کی جاتی تھیں۔
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ صدق و امانت یہ تھی کہ آپؐ کی بعثت سے پہلے بھی آپؐ کی قوم کا ہر فرد آپؐ کے صدق و امانت کا معترف تھا اور آپؐ کو "صادق" اور "امین" کے لقب سے پکارتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قوم آپؐ کی دشمن بن گئی اور آپؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن اس حالت میں بھی کسی شخص کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ آپؐ کی صداقت و امانت میں شک کرے یا شخصی حیثیت سے آپؐ کو جھوٹا کہے مشرکین نے جتنی آپؐ کی تکذیب کی وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی یعنی وہ آپؐ کو صادق اور امین تو مانتے تھے لیکن نبی ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اس انکار کا سبب آبائی دین کے تعصب کے علاوہ ان کی جاہلانہ حمیت اور بدنیتی تھی۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر طرح طرح کے بہتان باندھے، آپؐ کو ساحر کہا، شاعر کہا، کاہن کہا، مجنون کہا لیکن کاذب کہنے کی کبھی ہمت نہ پڑی۔

○ ایک دن مشرکین قریش کے بڑے بڑے سردار ایک مجلس میں جمع تھے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں سب سے زیادہ جہاندیدہ سردار نضر بن حارث تھا۔ جب دوسرے سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تو اس نے یوں تقریر کی :

"اے قریش! تم محمدؐ کے بارے میں جو باتیں اور تدبیریں کر رہے ہو وہ سب بیکار ہیں۔ وہ تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا۔ وہ تم میں سب سے زیادہ صادق القول اور

سب سے بڑھ کر امین تھا۔ اب جب کہ
اُس کے بال سفید ہونے کو آ گئے، تم کہتے ہو
کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے،
مجنون ہے —— خدا کی قسم میں نے ایسے
تمام لوگوں کی باتیں سُنی ہیں۔ محمدؐ میں ایسی
کوئی بات نہیں واللہ نہ وہ ساحر ہے نہ کاہن
ہے، نہ شاعر ہے اور نہ مجنون۔ اس کے
مقابلے کے لیے کوئی اور بات سوچو۔"

(سیرۃ ابن ہشام جلد اوّل)

○ ابوجہل کی اسلام دشمنی کسی سے مخفی نہیں وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدترین دشمن تھا لیکن آپؐ کے راست باز ہونے کا اس کو بھی اعتراف تھا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تمہیں جھوٹا قرار نہیں دیتے مگر جو چیز تم لے کر آئے ہو اُسے جھٹلاتے ہیں

(جامع ترمذی۔ مستدرک حاکم)

○ ایک دفعہ ابوجہل اور اَخنَس بن شریق کی تخلیہ میں ملاقات ہوئی۔ اَخنَس نے اس سے کہا:

"اس وقت کوئی تیسرا آدمی یہاں موجود نہیں ہے مجھے سچ سچ بتاؤ کہ محمدؐ صادق ہیں یا کاذب؟"

ابوجہل نے جواب دیا:

"خدا کی قسم محمدؐ صادق ہیں وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے لیکن جب قُصَیّ کی اولاد لِواء،

حجابت اور سقایت کے ساتھ نبوّت بھی
سے جائے تو باقی قریش کے لیے کیا رہا۔"
(سیرۃ سرورِ عالمؐ بحوالہ تفسیر طبری)

○ صلح حدیبیہ (ذیقعدہ ۶ھ ہجری) کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل (قیصرِ روم) کو دعوتِ اسلام کا خط بھیجا۔ ہرقل اس زمانے میں شام میں آیا ہوا تھا اور مکّہ کے کچھ تاجر بھی اپنے کاروبار کے سلسلے میں شام میں موجود تھے۔ ان تاجروں میں سپہ سالارِ قریش ابوسفیانؓ بھی تھے۔ وہ ابھی حالتِ کفر میں تھے۔ ہرقل نے ابوسفیانؓ اور کچھ دوسرے مکّی تاجروں کو اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرے۔ اس سلسلے میں ہرقل اور ابوسفیانؓ کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ بہت مشہور ہے۔ اثنائے گفتگو میں ہرقل نے ابوسفیانؓ سے پوچھا:

"کیا تم نے مدّعیٔ نبوّت کو نبوّت کے دعوے
سے پہلے کبھی دروغ گو بھی پایا۔"

ابوسفیان اگرچہ اس وقت مشرکین کے سردار تھے لیکن انہوں نے بلاتامل جواب دیا:—— نہیں کبھی نہیں——

(صحیح بخاری)

گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین بھی آپؐ کے صادق ہونے کا برملا اعتراف کرتے تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت و دیانت پر اہلِ حق تو اہلِ حق، مشرکین کو بھی اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنا روپیہ پیسہ وغیرہ آپؐ ہی کے پاس امانت رکھتے تھے اور مکّہ میں کسی دوسرے کو

آپؐ سے بڑھ کر امین نہیں سمجھتے تھے۔ ہجرت کے موقع پر حضرت علی رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ کو پیچھے چھوڑنے سے حضور صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مقصد یہ تھا کہ وہ سب لوگوں کی امانتیں واپس کر کے مدینہ آئیں۔

(سیرۃ النبیؐ)

رحمتِ عالم صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پیکرِ صدق و امانت ہونے کے بارے میں مثالیں پیش کرنا محض تحصیل حاصل ہے کیونکہ آپؐ حق کے سوا کبھی کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ

(سورۃ النجم آیۃ ۳-۴)

(وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے)

○ ایک دفعہ ایک صحابی نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! کبھی کبھی آپ ہم لوگوں سے ہنسی مذاق بھی تو کر لیتے ہیں۔ (یعنی ہنسی مذاق میں کوئی خلافِ حقیقت بات منہ سے نکل سکتی ہے)

آپؐ نے فرمایا:

"فی الواقع میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔"

○ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہما حضور صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانِ مبارک سے جو کچھ سنتے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بعض اصحاب نے ان سے کہا کہ تم ہر بات لکھتے جاتے

ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غصے کے عالم میں کوئی بات فرما دیتے ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اس بات کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم لکھے جاؤ، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں
میری جان ہے میری زبان سے کبھی کوئی بات حق
کے سوا نہیں نکلی ہے۔"

(مسند احمد، ابوداؤد)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو راستبازی اور امانت داری کی بے حد تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

○ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"مومن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش
ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔"

(مسند احمد)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"جھوٹ بولنے سے رزق گھٹ جاتا ہے"

(صحیحین)

○ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم سچائی کو لازم پکڑ لو اور ہمیشہ ہی سچ بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی

کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے اور آدمی جب ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے اور سچائی ہی کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک صدیق کا درجہ پاتا ہے اور جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ نافرمانی (فسق و فجور) کا راستہ دکھاتا ہے اور نافرمانی دوزخ میں پہنچاتی ہے اور جب آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک کذاب قرار پاتا ہے۔" (صحیحین)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاید ہی کوئی خطبہ ایسا ہو جس میں آپؐ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کا عہد مضبوط نہیں اس کا دین نہیں۔ (مشکوٰۃ شریف)

○ حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عیب دار چیز فروخت کرے اور اس عیب کو ظاہر نہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں مبتلا رہتا ہے یا یہ کہ فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سچا اور امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہو گا۔ (جامع ترمذی، مسند دارمی، دارقطنی)

○ حضرت سفیان بن اسید حضرمی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی جھوٹی بات بیان کرو درانحالیکہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔ (سنن ابی داؤد)

○ حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے۔
(سُنَنِ ابی داؤد، سُنَنِ ابنِ ماجہ)

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کا مال جھوٹی قسم کھا کر مار لے گا وہ اللہ کے سامنے کوڑھی بن کر پیش ہو گا۔ (سُنَنِ ابی داؤد)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسبِ حلال پر بے حد زور دیا ہے اور روزی کمانے کے تمام پیشوں میں تجارت کو سب سے اچھا پیشہ قرار دیا ہے بشرطیکہ اس میں سچائی اور دیانت و امانت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔
فی الحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روزی کو حلال قرار دیا ہے جو اپنی محنت سے جائز طریقے اختیار کر کے حاصل کی گئی ہو۔ ان جائز طریقوں میں تجارت، محنت مزدوری، ملازمت، کھیتی باڑی، دستکاری، صنعت و حرفت وغیرہ سبھی چیزیں آجاتی ہیں لیکن ہر کام میں سچائی اور دیانت و امانت لازمی شرط ہے۔ غلے اور دوسری اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ کرنا، ذخیرہ اندوزی، کم تولنا کم ماپنا، کام چوری، عیب دار چیز گاہک کو عیب بتلائے بغیر بیچنا وغیرہ سب باتیں خیانت کے زمرے میں آتی ہیں، حضور نے ان کی سخت ممانعت فرمائی ہے کیونکہ یہ روزی کو حرام کر دیتی ہے۔

توکّل علی اللہ

اللہ پر توکّل کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا جائے۔
اس بھروسا کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے کام میں دل وجان سے لگا رہے۔ اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے مگر اپنی کوشش کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اور بھلائی کی امید رکھے۔ اس کے ساتھ اسے یہ یقین بھی ہو کہ کامیابی اس کی اپنی کوشش کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوتی ہے اور کوشش جو وہ کر رہا ہے اس لیے کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوشش کرنے کا حکم دیا ہے۔

توکّل کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اللہ پر بھروسا رکھے اور ہمت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے۔ اگر کوئی اس پر ظلم کرتا ہے تو اللہ کے بھروسے پر ظالم کا مقابلہ کرے۔ اگر مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر بھی اللہ پر بھروسا کرے اور یہ یقین کرے کہ اللہ اس کی مدد کرے گا۔

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا توکّل علی اللہ اتنا کامل اور قوی تھا کہ اس کی نظیر پیش کرنا ناممکن ہے۔ آپؐ پر بڑے بڑے کٹھن وقت آئے۔ مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹے لیکن آپؐ کا قلبِ اطہر کبھی اضطراب ویاس یا کسی قسم کے وسوسے اور خوف سے آشنا نہ ہوا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد میرا خزانہ ہے[1] چنانچہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے جس دَور اور جس پہلو پر نظر ڈالیں اس میں آپؐ کا توکّل علی اللہ پوری شان سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ بعثت کے بعد آپؐ نے تبلیغِ حق کا آغاز فرمایا تو مشرکین نے آپؐ کو ستانے

---

[1] رحمۃٌ للعالمین بحوالہ مدارج السالکین۔

اور آپؐ کے کام میں روڑے اٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن آپؐ نے کچھ پروا نہ کی اور کسی خوف اور ڈر کے بغیر لوگوں کو برابر اللہ کی طرف بلاتے رہے، صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ تنِ تنہا حرمِ کعبہ میں جاکر سب کے سامنے عباداتِ الٰہی بھی کرتے رہے۔ بعض دفعہ مشرکین نے حرم شریف میں آپؐ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا آپؐ کو اس کی اطلاع بھی مل گئی لیکن آپؐ وضو کر کے بے دھڑک حرم شریف میں تشریف لے گئے۔ حضورؐ کا عزم اور حوصلہ دیکھ کر مشرکین دم بخود ہو گئے اور انہیں آپؐ پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔ یہ عزم اور حوصلہ توکل علی اللہ کی بدولت تھا۔ (مُسندِ احمد)

مشرکین کے دباؤ سے مجبور ہو کر ایک دفعہ حضورؐ کے شفیق چچا جناب ابوطالب نے بھی آپؐ سے کہا، میرے بھتیجے اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو میں بوڑھا اور کمزور ہوں، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں۔ مناسب یہی ہے کہ تم اپنے دین کی تبلیغ سے کنارہ کش ہو جاؤ۔

حضورؐ نے اللہ کے بھروسے پر کسی تامل کے بغیر جواب دیا:

"عمِّ محترم! واللہ یہ لوگ (مشرکین) اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ پر چاند تو بھی میں تبلیغ حق سے باز نہیں آؤں گا یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کرے یا اس کام میں میری جان چلی جائے۔"

آپؐ کا توکل علی اللہ دیکھ کر شفیق چچا پر رقت طاری ہو گئی اور انہوں نے کہا، بھتیجے جو تمہارا دل چاہے کرو اور جو بات تم کو پسند ہے بے دھڑک کہو، خدا کی قسم میں تمہیں دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ (سیرۃ ابنِ ہشام)

جس رات کو آنحضورؐ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے مکہ سے ہجرت فرمائی، مشرکین نے آپؐ کے کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کر رکھا تھا لیکن آپؐ اللہ کے بھروسے پر سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیتیں پڑھتے ہوئے ان کے درمیان سے نکل کر حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر پہنچے اور انہیں ساتھ لے کر غارِ ثور میں جا ٹھہرے۔ دوسرے دن مشرکین آپؐ کو تلاش کرتے کرتے غار کے منہ پر پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے گھبرا کر عرض کیا:

"یارسول اللہ! اگر یہ ذرا جھک کر دیکھیں گے تو ہم ان کو نظر آ جائیں گے۔"

آپؐ نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے)

اور پھر واقعی اللہ نے آپؐ کی مدد فرمائی۔ مشرکین آپؐ کو نہ دیکھ سکے اور ناکام و نامراد واپس چلے گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے کے بعد بھی مشرکین مکہ، یہودِ مدینہ اور منافقین آپؐ کے خلاف سازشوں اور فتنہ انگیزیوں میں مشغول رہے جن کے نتیجے میں اہلِ حق اور کفار کے درمیان متعدد خونریز معرکے ہوئے۔ مصائب کے ہجوم اور تمام معرکوں میں، بقول علامہ شبلیؒ، آپؐ کے توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ نہ کبھی آپؐ دشمن کی تعداد کو خاطر میں لائے اور نہ کبھی آپؐ نے اس کے ساز و سامان اور عسکری قوت کی پروا کی۔

(سیرۃ النبیؐ)

ہجرتِ مدینہ کے ابتدائی زمانے میں صحابۂ کرامؓ رات کو آپؐ کے کاشانۂ اقدس کے گرد پہرہ دیا کرتے تھے تاکہ کوئی دشمن آپؐ کو گزند نہ پہنچا سکے۔ ایک رات جب کچھ صحابہؓ مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے آپؐ نے سرِ اقدس کاشانۂ اقدس سے باہر نکال کر فرمایا:

"لوگو! واپس جاؤ۔ میری حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔"

(جامع ترمذی)

اشیائے خورد و نوش، ضرورت وغیرہ کے معاملے میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا توکل علی اللہ مثالی تھا۔ خادمِ رسول اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے دن کے لیے کسی چیز کا ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

مطلب یہ کہ جو چیز آپ کے پاس ہوتی اسے کھلا پلا کر یا حاجت مندوں کو دے دلا کر اسی دن ختم کر دیتے اور اس کو اس خیال سے محفوظ نہ رکھتے کہ کل اس کی پھر ضرورت ہو گی یہ آپؐ کا غایت درجہ توکل تھا کہ جس اللہ نے آج دیا ہے وہ کل بھی دے گا۔

ایک اور حدیث میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپؐ ارشاد فرماتے تھے کہ اگر تم لوگ اللہ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تم کو اس طرح روزی دے گا جس طرح کہ پرندوں کو دیتا ہے۔ وہ صبح کو بھوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔
(ترمذی۔ ابن ماجہ)

اب توکل علی اللہ کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو:

ابن ابی حاتمؒ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی خواہش ہو کہ وہ سب انسانوں سے بڑھ کر طاقتور ہو جائے، اسے چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے اور جس شخص کی خواہش ہو کہ سب سے زیادہ غنی ہو جائے اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس پر زیادہ بھروسا رکھے بہ نسبت اس شے کے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ معزز ہو جائے اسے چاہیے کہ اللہ عزّ وجلّ سے ڈرے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آنحضورؐ نے خود بھی توکل علی اللہ کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا اور اُمّت کو بھی نہایت بلیغ پیرائے میں اس کا درس دیا۔

ایفائے عہد

ایفائے عہد یا وعدہ پورا کرنا صدق و دیانت ہی کی ایک شاخ ہے۔ اسی طرح وعدہ خلافی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ قرآنِ حکیم میں ایفائے عہد کا حکم اس طرح دیا گیا:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا

(سورۃ بنی اسرائیل۔ آیۃ ۳۴)

(عہد کی پابندی کرو۔ بے شک عہد کے بارے میں تم کو جوابدہی کرنی ہوگی)

رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عہد کی نہایت سختی سے پابندی فرماتے تھے۔ وعدہ خلافی سے آپؐ کو شدید نفرت تھی اور آپؐ نے اس کو نفاق قرار دیا تھا حضورؐ نے جب کبھی کسی سے کوئی وعدہ کیا اس کو ہر حالت میں پورا کیا اگرچہ بعض اوقات ایسا کرتے ہوئے آپؐ کو بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔ حضورؐ دوسرے لوگوں کو بھی عہد شکنی سے بچنے اور وعدہ پورا کرنے کی سخت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت عبداللہ بن ابی الحمسا رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت سے پہلے آپؐ سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا۔ کچھ حساب میں نے کر دیا اور کچھ باقی رہ گیا۔ میں نے آپؐ سے وعدہ کیا کہ تھوڑی دیر بعد اسی جگہ آکر باقی حساب کر دوں گا آپؐ یہیں ٹھہریں۔ حضورؐ نے وہیں ٹھہرنے کا وعدہ کر لیا لیکن میں اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین دن کے بعد مجھے یاد آیا تو دوڑا دوڑا اسی جگہ پہنچا جہاں آپ کو بٹھا کر گیا تھا۔ دیکھا کہ آپؐ اسی جگہ موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈالا تمہارے انتظار میں تین دن سے میرا یہیں قیام ہے۔ (سُنَنِ ابی داؤد)

بیعتِ عقبہ کبیرہ (۱۳ھ بعدِ بعثت) میں مسلمانانِ یثرب نے مکہ آکر

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب (مدینہ) تشریف لانے کی دعوت دی لیکن بیعت سے پہلے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا:

"یا رسول اللہ! اس وقت ہمارے اور یہود کے مابین معاہدے ہیں جو بیعت کے بعد فسخ ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اقتدار اور قوت پا کر ہمیں چھوڑ دیں۔"

اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا:

"بلکہ میرا خون تمہارا خون اور میرا ذمہ تمہارا ذمہ ہے۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ تم جس سے لڑو گے میں بھی اس سے لڑوں گا تم جس سے صلح کرو گے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔"

گویا آپؐ نے انصار کے ساتھ عہد کیا کہ میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہوگا اور پھر آپؐ نے یہ عہد اس طرح نباہا کہ سخت نامساعد حالات میں بھی اور غلبہ و نصرت کے وقت بھی آپؐ نے انصار کا ساتھ نہ چھوڑا یہاں تک کہ سفرِ آخرت بھی مدینہ منوّرہ میں اختیار فرمایا۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد مشرکین کے مقابلے میں ایک تہائی سے بھی کم تھی اور آپؐ کو ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی لیکن چشمِ فلک نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ حضرت حسیل الیمانؓ اور ان کے فرزند حضرت حذیفہؓ مکہ سے مدینہ آ رہے تھے کہ راستے میں لشکرِ قریش نے انہیں گرفتار کر لیا اور اس شرط پر رہا کیا کہ وہ لڑائی میں مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں گے۔ انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا اور ساتھ ہی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کافروں کے خلاف ضرور لڑیں گے انہوں نے مجبوری میں ان کے خلاف نہ لڑنے کا عہد کیا تھا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا، ہرگز نہیں تم اپنا وعدہ ضرور پورا کرو اور لڑائی کے میدان سے واپس جاؤ۔ ہم (مسلمان) ہر حال میں وعدہ پورا کرنے کے پابند ہیں۔ ہم کو صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کے قبولِ اسلام سے پہلے مشرکین قریش نے انہیں اپنا قاصد بنا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجا۔ آپ کے روئے انور پر نظر ڈالتے ہی ان کے دل کی حالت بدل گئی اور اس سے کفر و شرک کا زنگ آناً فاناً دُور ہو گیا۔

انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ، اب میں مشرکین کے پاس واپس نہ جاؤں گا۔"

آپؐ نے فرمایا، نہیں تم قاصد ہو اور میں قاصد کو روک کر عہد نہیں توڑ سکتا۔ تم اس وقت واپس جاؤ۔ اگر وہاں بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت رہی تو میرے پاس آجانا۔ چنانچہ اس وقت تو حضرت ابو رافعؓ واپس چلے گئے لیکن جلد ہی ہمیشہ کے لیے مدینہ آکر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(سُنن ابی داؤد)

صلحنامہ حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکّہ کا کوئی شخص اسلام قبول کرکے مدینہ جائے گا تو اہلِ مکّہ کے مطالبے پر مسلمان اسے واپس بھیج دیں گے۔ ابھی یہ شرطیں معرضِ تحریر میں آئی ہی تھیں کہ قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو کے فرزند ابوجندلؓ زخمی حالت میں حدیبیہ پہنچ گئے۔ والد نے انہیں اسلام لانے کے جرم میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر قید کر رکھا تھا وہ کسی طرح قید خانے سے بیڑیوں سمیت نکل آئے تھے۔ ان کی ٹانگیں بیڑیوں کی رگڑ سے زخمی ہو گئی تھیں۔ مسلمان انہیں اس حالت میں دیکھ کر تڑپ اٹھے اور حضرت ابوجندلؓ کو اپنی پناہ میں لینے کے لیے بے تاب ہو گئے لیکن حضورؐ نے ابوجندلؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے ابوجندل! صبر کرو ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔ اس وقت تم مکّہ واپس جاؤ۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی تمہاری رہائی کی کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔"

(صحیح بخاری۔ سیرۃ ابن ہشام)

حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وعدہ بھی ایک طرح کا قرض ہے (لہٰذا اس کو ادا کرنا چاہیئے)۔ (معارف الحدیث بحوالہ معجم اوسط للطبرانی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کو ایفاء نہ کرے، جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ (صحیحین)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو قوم عہد کرکے دھوکا دیتی ہے اس پر دشمن غالب آجاتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی سے جھگڑا مت کرو اور نہ اس سے ٹھٹھا کرو اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کرو جس کو پورا نہ کرسکو۔ (جامع ترمذی)

عیادت و تعزیت

رحمتِ عالم صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم مخلوقِ خدا کے سب سے بڑھ کر ہمدرد اور غمخوار تھے۔ بیماروں کی عیادت اور مرنے والوں کے رشتہ داروں کے پاس جاکر تعزیت کرنا آپؐ کا معمول تھا۔ جب آپ کسی کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو بیمار کو تسلّی و تشفّی دیتے اس کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے اِنْ شَاءَ اللہ صحت یاب ہو جاؤ گے پھر اس کی صحت کے لیے دُعا کرتے۔ (صحیح بخاری)

کبھی آپؐ مریض سے دریافت فرماتے، کیا تمہارا دل کوئی چیز کھانے کو چاہتا ہے؟ اگر وہ کسی چیز کا نام لیتا اور وہ اس کے لیے مضر نہ ہوتی تو آپؐ اس کے مہیّا کرنے کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ (زاد المعاد)

حُضور صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنے صحابہؓ کو بھی بیماروں کی عیادت کی بہت تاکید فرماتے تھے اور ان کو بشارت دیتے تھے کہ جب کوئی صبح کو کسی کی بیمار پُرسی کے لیے جاتا ہے تو فرشتے شام تک اس کی مغفرت کے لیے دُعا مانگتے ہیں اور جب کوئی شام کو کسی کی عیادت کرنے جاتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کے لیے بخشش کی دُعا کرتے ہیں۔

(جامع ترمذی و سُنَن ابی داؤد)

حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہ تعالیٰ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، اللہ عَزَّ وَجَلَّ قیامت کے دن کہے گا۔ اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تھا تو تُو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ کہے گا اے میرے رَبّ میں تیری عیادت کیسے کرتا تُو تو رَبُّ الْعَالَمِیْن ہے۔ اللہ فرمائے گا، کیا تجھے علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا تو تُو نے اس کی عیادت نہیں کی ۔۔۔ کیا تجھے خبر نہ تھی کہ اگر تو اس کی عیادت

کو جاتا تو اس کے پاس مجھے پاتا۔ (صحیح مسلم)

اس حدیث پاک سے عیادت کے اجر و ثواب کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرۃ طیبہ میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ عیادت و تعزیت کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ واقعات یہ ہیں:

○ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ سعدؓ بن عبادہ کی بیمار پرسی کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم دس سے زیادہ آدمی تھے۔ نہ تو ہمارے پاؤں میں جوتے تھے نہ چمڑے کے موزے تھے، نہ ہمارے سروں پر ٹوپیاں تھیں اور نہ جسم پر کرتے تھے۔ اسی حالت میں شور زمین میں ہم چلتے رہے یہاں تک کہ سعدؓ بن عبادہ کے پاس پہنچے۔ ان کے اہل خانہ ان کے پاس سے ہٹ گئے اور رسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وَسَلَّم اور ہم ان کے قریب گئے اور بیمار پرسی کی۔ (صحیح مسلم)

○ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر آپؐ پر رقت طاری ہو گئی اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ آپؐ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے۔

(بخاری کتاب الجنائز)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت کیا کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے (اسے تسلی دی) اور اس سے کہا کہ تو اسلام قبول کر لے۔ (یہ سن کر) اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو وہیں اس کے پاس تھا۔ اس نے کہے

(باپ) نے کہا، تو ابو القاسمؐ (حضورؐ کی کنیت) کی بات مان لے۔
چنانچہ وہ (لڑکا) حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے یہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے، اس اللہ کی حمد جس نے اسے آتشِ جہنم سے بچالیا۔

(صحیح بخاری)

○ ایک دفعہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیمار ہوگئے۔ ان کا گھر کافی فاصلے پر تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے پاپیادہ تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لے کر ان کی عیادت کو گئے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیماری کی شدت سے بیہوش تھے۔ آپؐ نے پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی سے ان کے منہ پر چھینٹے مارے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوش میں آگئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! اپنا ترکہ کس کو دوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ۔

(صحیح بخاری۔ سنن ابی داؤد)

○ ۱۰ھ ہجری میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو جن ہزارہا صحابہ نے آپؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا، ان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ وہ مکہ میں سخت بیمار ہوگئے۔ حضورؐ نے ان کی عیادت کس طرح فرمائی اس کا حال انہوں نے خود اس طرح بیان کیا ہے:

"میں مکہ میں سخت بیمار ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میں مال چھوڑتا ہوں اور میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں ایک تہائی مال اپنی بیٹی کے لیے چھوڑنے اور دو تہائی مال کو صدقہ کر دینے کی وصیت کرسکتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا، ایک تہائی صدقہ کرنے کی وصیت کر سکتے ہو لیکن ایک تہائی بھی زیادہ ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنا دستِ مبارک میری پیشانی پر رکھا پھر اس کو میرے چہرے اور پیٹ پر پھیرا اور دعا کی کہ اے اللہ سعد کو شفا دے اور اس کی ہجرت کو کامل کر۔ (حضورؐ کی یہ دُعا قبول ہو گئی)۔

آپؐ کے دستِ مبارک کی ٹھنڈک میں آج تک اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔" (صحیح بخاری کتاب المرضیٰ والطب)

اس ضمن میں کچھ اور روایتیں بھی ملتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا علاج طبیب العرب حارث بن کلدہ ثقفی سے کرایا۔ اس نے ان کے لیے ایک حریرہ تجویز کیا جس کے استعمال سے وہ صحت یاب ہو گئے۔

○ حضرت قُرّہ بن ایاس رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ نبی اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو کچھ صحابہؓ آپؐ کی مجلس میں باقاعدہ حاضری دیتے تھے۔ ان صحابہؓ میں سے ایک صاحب کا ایک چھوٹا بچّہ تھا۔ یہ بچّہ حُضُورؐ کے پاس آپؐ کی پُشت کی جانب سے آتا تو آپؐ اس کو اپنے سامنے بٹھا لیتے۔ خدا کا کرنا وہ بچّہ فوت ہو گیا۔ اس کے والد کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ کئی دن تک مجلس نبوی میں حاضر نہ ہو سکے۔ نبی صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا کہ وہ فلاں شخص کئی دن سے نظر نہیں آیا، کیا بات ہے؟

لوگوں نے عرض کیا، ان کا چھوٹا بچّہ جسے آپؐ نے دیکھا ہوا ہے، فوت ہو گیا ہے۔ شاید وہ اسی کے غم کی وجہ سے نہیں آسکے۔

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان صاحب سے ملاقات فرمائی اور اس بچّے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا، وہ فوت ہو گیا ہے۔

آپؐ نے ان کو تسلی دی اور پھر فرمایا۔

"بتاؤ تم کس بات کو پسند کرتے ہو؟ آیا یہ بات کہ وہ بچّہ زندہ رہے یا یہ کہ وہ بچّہ پہلے جائے اور جنّت کا دروازہ تمہارے لیے کھولے اور جب تم پہنچو تو وہ تمہارا استقبال کرے۔"

اُن صاحب نے عرض کیا:

"اے اللہ کے نبیؐ! مجھے تو یہ بات پسند ہے کہ وہ مجھ سے پہلے جنّت میں جائے اور میرے لیے جنّت کا دروازہ کھولے۔"

حضورؐ نے فرمایا، یہ بچّہ تمہاری زندگی میں اس لیے مرا ہے کہ تمہارے لیے جنّت کا دروازہ کھولے۔ (نسائی شریف)

○ حضرت عبداللہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہوئے تو حضورؐ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ وہ بیماری کی شدّت کی وجہ سے بے ہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے ان کو پکارا لیکن ان کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ ان کی اس حالت سے حضورؐ کو معلوم ہو گیا کہ اب اُن کا وقتِ آخر ہے۔ آپؐ نے فرمایا، افسوس اے ابوالربیع (حضرت عبداللہؓ کی کنیت) اب تمہارے لیے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

یہ سُن کر حضرت عبداللہؓ کے گھر کی خواتین کی چیخیں نکل گئیں اور وہ رونے لگیں۔ لوگوں نے ان کو رونے دھونے سے منع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، اس وقت رونے دو البتہ مرنے کے بعد رونا نہیں چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی نے عرض کیا، مجھ کو امید تھی کہ میرے والد کو شہادت نصیب ہوگی کیونکہ انھوں نے جہاد کی پوری تیاری کرلی تھی۔

آپؐ نے فرمایا، ان کو اپنی نیّت کا ثواب مل چکا۔

(سُنن ابی داؤد)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی بیمار ہوئے تو آپؐ ان کی

عیادت کے لیے کئی دفعہ تشریف لے گئے۔ قضائے الٰہی سے انہوں نے رات کے وقت وفات پائی۔ لوگوں نے اس خیال سے ان کے انتقال کی خبر حضورؐ کو نہ دی کہ اندھیری رات میں آپؐ کو ان کے جنازے پر آنے میں تکلیف ہوگی اور خود ہی ان کو دفن کر دیا۔ صبح کو آپؐ کو خبر ہوئی تو شکایت کی کہ مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ پھر ان کی قبر پر جا کر نمازِ جنازہ پڑھی۔

(صحیح بخاری کتاب الجنائز)

○ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اقصائے یمن کا امیر بنا کر بھیجا تھا۔ وہاں کے اثنائے قیام میں ان کا ایک بیٹا فوت ہو گیا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے ان کو تعزیتی خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام ہے۔ تم پر سلامتی ہو۔ میں اللہ کا شکر گزار اور اس کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اما بعد! اللہ تعالیٰ تمہیں اجرِ عظیم دے اور ہمیں تمہیں شکر کی توفیق بخشے۔ ہماری جانیں، مال اور اہل و عیال سب اللہ کی خوشگوار نعمتیں ہیں اور یہ ہمارے پاس اللہ کی طرف سے امانت ہیں۔ جب تک یہ تمہارے پاس رہیں تمہارے لیے مسرت کا باعث ہوں اور ان کے چلے جانے سے اللہ اجرِ عظیم سے نوازے۔ تمہارے لیے اللہ کی رحمت اور ہدایت ہو اگر اجرِ آخرت کی نیت سے صبر کیا۔ پس تم صبر کرو اور دیکھو تمہاری بے قراری اور بے صبری سے کوئی مرنے والا لوٹ کر نہیں آسکتا اور نہ غم دور ہو سکتا ہے اور جو سانحہ پیش آیا ہے اسے پیش آنا ہی تھا۔

(المعجم الکبیر طبرانی)

مہمان نوازی

اکرامِ ضیف یا مہمان نوازی عربوں کی قومی خصوصیات میں شامل ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ صفت ان میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھی۔ رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مہمان نوازی کو جزوِ ایمان قرار دے کر اس صفت کو اور بھی نکھار دیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جو شخص اللہ اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ مہمان کی آؤ بھگت کرے اس کو اپنے مکان میں اتارے، عمدہ کھانا ہو سکے تو کھلائے۔ اس کا حال احوال پوچھے۔ مہمان داری کا تین دن تک حق ہے اس سے زیادہ کرے گا تو ثواب پائے گا۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابوشریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی تکریم کرے۔ ایک دن اور ایک رات تو زیادہ خاطر تواضع کرے اور ویسے ضیافت تین دن تک کرے اس کے بعد مہمان کی خدمت پر صدقہ کا ثواب ملے گا اور مہمان کو اس قدر ٹھہرنا جائز نہیں کہ گھر والے کا حرج ہونے لگے۔ (متفق علیہ)

خود رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مہمان نوازی میں سب لوگوں سے افضل اور ممتاز تھے۔ حضور ؐ کے پاس نہایت کثرت سے مہمان آتے تھے۔ ان کو ٹھہرانے کا انتظام مختلف جگہوں پر کیا جاتا تھا۔ ان میں مسجدِ نبوی کا صحن بھی شامل تھا۔ بعض موقعوں پر اس میں مہمانوں کے قیام کے لیے خیمہ لگا دیا جاتا تھا اور حضور ؐ خود بہ نفسِ نفیس ان کی خاطر داری فرماتے تھے۔ یوں بھی آپ ؐ کسی مہمان کو بغیر کچھ کھلائے پلائے نہ جانے دیتے تھے۔ مہمانوں

میں مسلمان اور کافر ہر طرح کے لوگ ہوتے آپؐ سب کی یکساں مہمان نوازی کرتے۔
بعض اوقات ایسا ہوتا کہ اچانک مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود ہوتا وہ سب ان کی مہمانداری میں صرف ہو جاتا اور خود حضورؐ اپنے اہلِ خانہ سمیت فاقہ کرتے۔ (صحیح مسلم۔ مُسنَد احمد)

سُننِ ابی داوُد میں ہے کہ آپؐ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مہمانوں کی خبرگیری فرمایا کرتے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ)

رحمت عالم صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّمَ نے مدینہ مُنوّرہ میں جو پہلی درسگاہ قائم کی اس کے طلبہ اصحاب صُفّہ کہلاتے تھے وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے وہی ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتے تھے لیکن ان کے سب سے بڑے کفیل خود رسول اکرمؐ تھے۔ اکثر آپؐ ہی ان کو اپنے مہمان بنایا کرتے تھے۔ کبھی دفعہ ان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی تھی اس وقت آپ ان کی کفالت عارضی طور پر مختلف صحابہ میں بانٹ دیا کرتے تھے مگر سب سے زیادہ تعداد کی میزبانی خود فرماتے تھے۔ حضرت عبدالرّحمان بن ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ اصحاب صُفّہ غریب لوگ تھے۔ ایک بار نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا، جس کے گھر میں دو آدمیوں کا کھانا ہے تو وہ یہاں سے تیسرے کو لے جائے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو تو پانچویں اور چھٹے آدمی کو ساتھ لے جائے۔
چنانچہ میرے والد ابوبکرؓ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو گھر لائے اور نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّم اپنے ساتھ دسؔ آدمیوں کو لے گئے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

آنحضورؐ صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّمَ کے گھر میں ایک بہت بڑا پیالہ تھا۔ یہ زیادہ مقدار میں کھانا (روٹی کھجور سالن وغیرہ) رکھنے کے کام آتا تھا۔ یہ اس قدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھا سکتے تھے۔ دوپہر کے وقت

یہ پیالہ گھر سے باہر لایا جاتا اور اصحاب صُفّہ اس کے گرد بیٹھ جاتے۔ اگر آدمی بہت زیادہ ہو جاتے تو آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اکڑوں بیٹھ جاتے تاکہ لوگوں کے لیے کچھ اور جگہ نکل آئے۔ (سُنَن ابی داؤد)

○ ایک دفعہ مسلمانوں کے محسن نجاشی شاہِ حبشہ نے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں ایک وفد بھیجا۔ آپؐ نے اس وفد کو اپنا مہمان بنایا اور خود بہ نفسِ نفیس ارکانِ وفد کی مہمانداری کی۔

صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا:

" یارسولؐ اللہ! آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں ان کی خدمت کے لیے ہم موجود ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

" نہیں۔ ان لوگوں نے میرے ساتھیوں کی مہمانداری کی تھی جب وہ مکّہ سے ہجرت کر کے حبش گئے تھے اس لیے ان کی خدمت میں خود کروں گا۔" (الشفاء۔ قاضی عیاضؒ)

○ ایک مرتبہ ایک کافر حضور کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ رات کو سوتے ہوئے اس کے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی اور بستر ہی میں پاخانہ نکل گیا۔ صبح کو شرمندگی کے باعث حضورؐ کے تشریف لانے سے پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ راستے میں یاد آیا کہ جلدی میں تلوار وہیں بھول آیا ہوں۔ تلوار لینے کے لیے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سرورِ کائناتؐ خود بستر کو دھو رہے ہیں۔ صحابہؓ عرض کرتے ہیں یارسولؐ اللہ! ہم یہ کام کیے دیتے ہیں، لیکن آپؐ فرماتے ہیں:

" نہیں نہیں وہ شخص میرا مہمان تھا اور مجھے ہی یہ کام کرنا چاہیے۔"

پھر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظر اس شخص پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا:

" بھائی تم اپنی تلوار یہیں بھول گئے تھے، اسے لے جاؤ۔"

حضورؐ کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ کر اس شخص کے دل سے کفر و شرک کا زنگ

دور ہو گیا اور وہ اسی وقت مُشرّف بہ اسلام ہو گیا۔

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں ایک کافر مہمان آیا۔ آپؐ نے اس کو ایک بکری کا دودھ پلایا، وہ سیر نہ ہوا۔ آپؐ نے دوسری بکری کا دودھ پلایا، وہ بھی اس کے لیے کافی نہ ہوا۔ آپؐ نے تیسری چوتھی حتیٰ کہ سات بکریوں کا دودھ اسے پلا دیا تب کہیں جا کر وہ سیر ہوا۔ اس سارے عرصے میں آپ ہشاش بشاش رہے۔ نہ آپؐ نے حیرت کا اظہار فرمایا اور نہ آپؐ کی جبین مبارک پر شکن آئی۔ دوسرے دن وہ صبح کو پھر حاضر ہوا اور حضورؐ کے دست مبارک پر مُشرّف بہ اسلام ہو گیا۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کے لیے پھر ایک بکری کا دودھ منگایا۔ اس نے یہ دودھ پی لیا لیکن جب آپؐ نے اس کے سامنے دوسری بکری کا دودھ رکھا تو اس نے کچھ پیا اور کچھ یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اب پیٹ میں گنجائش نہیں ہے۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا، مومن ایک آنت میں کھاتا پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔ مطلب یہ کہ مومن صبر و قناعت کے ساتھ کھاتا ہے اور کافر حرص اور بے صبری کے ساتھ۔ (جامع ترمذی)

○ حضرت مغیرہ بن شعبہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہٗ کہتے ہیں کہ ایک شام مجھے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مہمان بننے کا شرف نصیب ہُوا۔ آپؐ نے میرے لیے گوشت کا ایک ٹکڑا بھنوایا۔ پھر آپؐ نے ایک چھُری لی اور اس سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر مجھے دینے لگے۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ حضرت بلالؓ نے آکر نماز کی اطلاع دی۔ آپؐ نے چھُری ہاتھ سے رکھ دی اور فرمایا، اللہ بلال کا بھلا کرے اس کو کیا جلدی ہے (کچھ دیر انتظار کیا ہوتا) یہ فرما کر آپؐ نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ (سُنَنِ ابی داوٗد۔ کتاب الطہارت)

○ یوں تو فتح مکہ سے پہلے ہی مختلف علاقوں سے عربوں کے وُفُود بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونے لگے تھے لیکن فتح مکہ کے بعد تو عرب کے کونے کونے سے وُفُود

کا تانتا بندھ گیا۔ ان وفود کی آمد کے مقاصد مختلف ہوتے تھے بعض نعمت اسلام سے بہرہ ور ہونے کے لیے حاضر ہوتے، بعض احکام دین سیکھنے اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زیارت و بیعت کا شرف حاصل کرنے کے لیے اور بعض صلح وامن کے معاہدے کرنے کے لیے حاضر ہوتے۔ ان وفود کے ارکان کی تعداد معین نہ تھی۔ کبھی کوئی وفد ایک یا دو تین آدمیوں پر مشتمل ہوتا تھا اور کبھی کسی وفد کے ارکان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی تھی۔ رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ان وفود کا استقبال نہایت خندہ پیشانی سے کرتے اور ان کے کھانے پینے اور ٹھہرنے کا مناسب بندوبست فرماتے تھے۔
جب وہ مدینہ منورہ سے واپس جانے لگتے تو ان کے تمام ارکان کو کچھ دے دلا کر رخصت فرماتے مثلاً زرِ نقد، چاندی، کھجوریں یا جس قبیلے کا وفد ہوتا اس قبیلے کے لیے کوئی جاگیر یا کسی اور قسم کا انعام۔ (طبقات ابنِ سعد)

۹ھ ہجری میں نجران سے ساٹھ آدمیوں پر مشتمل عیسائیوں کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ اس میں نجران کے بڑے بڑے شرفاء اور معززین شامل تھے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان لوگوں کو مسجدِ نبوی کے صحن میں خیمے لگوا کر ٹھہرایا اور ان کو اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ یہ لوگ خاصی مدت تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بڑے اہتمام سے ان کی مہمان داری کرتے رہے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو حضورؐ نے مباہلہ کی دعوت دی لیکن وہ اس کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جب وہ جانے لگے تو حضورؐ نے ان کے لیے ایک وثیقہ اور ایک فرمان لکھوا دیا جن کے مطابق ان کو معمولی جزیہ کے عوض نہ صرف مال جان، عزت آبرو اور عبادت گاہوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی بلکہ عقیدے کی آزادی بھی دی گئی اور کئی دوسری مراعات سے بھی نوازا گیا۔ (سیرۃ النبیؐ)

خشیتِ الٰہی اور رِقّتِ قلبی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ جلّ شانہٗ کے محبوبِ خاص تھے۔ خاتم الانبیاء اور افضل الرُّسل تھے، صاحبِ کوثر اور صاحبِ قابَ قوسین تھے لیکن اپنے تمام فضائل کے باوجود آپؐ پر خشیتِ الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فکرِ آخرت سے اکثر مغموم رہتے تھے اور دن بھر میں ستّر یا سَو دفعہ استغفار فرماتے تھے۔ ؎ (نشر الطیب)

○ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کچھ میں نے دیکھا وہ تم نے نہیں دیکھا اور جو کچھ میں نے سُنا ہے وہ تم نے نہیں سُنا ـــــ خدا کی قسم جو کچھ میں جانتا ہوں اگر وہ تم جان لو تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ (صحیحین)

○ اگر کبھی آپؐ ہوا میں آندھی یا طوفان کے آثار دیکھتے یا سیاہ بادل دیکھتے تو مضطرب ہو جاتے کہ کہیں یہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ نہ ہو اور اگر آپؐ کوئی ضروری کام کر رہے ہوتے تو اس کو چھوڑ دیتے اور قبلہ رُو ہو کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے۔ "الٰہی تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں۔" (سُنن ابن ماجہ)

○ ایک دن ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپؐ کے اضطراب کا کیا سبب ہے؟ آپؐ نے فرمایا، عائشہ! تجھے کیا معلوم کہ قومِ ہُود والی مصیبت، ہمیں نہ پیش آجائے۔ اُس قوم نے بادل دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کر دے گا لیکن حقیقت

؎ اربابِ سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کثرت سے استغفار فرمانا یا تو تعلیمِ اُمّت کے لیے تھا یا خود اُمّت کے لیے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا۔

میں وہ عذابِ الٰہی تھا۔ (صحیحین)

○ ایک دفعہ دیہاتی (صحرا نشین) عربوں کا مسجدِ نبوی میں اس قدر ہجوم ہوا کہ آپؐ نے سخت دباؤ محسوس کیا جس سے آپؐ کو بہت تکلیف ہوئی۔ صحابہ مہاجرین نے یہ کیفیت دیکھی تو ان لوگوں کو بزور پرے ہٹایا اور حضورؐ پسینے سے تربتر حضرت عائشہؓ کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت اتفاق سے آپؐ کی زبان مبارک سے ان لوگوں کے لیے بددعا نکل گئی لیکن پھر فوراً قبلہ رُخ ہو کر ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا کی:

"الٰہی میں ایک انسان ہوں اگر تیرے کسی بندے کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا نہ دیجیو۔"

(سیرۃ النبی بحوالہ مسندِ احمد)

قرآن حکیم کی متعدد سورتوں میں قیامت کا ذکر تفصیل سے آتا ہے جب کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازیں یا کسی اور موقع پر ان سورتوں میں سے کسی کی تلاوت فرماتے یا کسی دوسرے سے ان کی تلاوت سنتے تو آپؐ پر گریہ طاری ہو جاتا۔ (ایسی کچھ مثالیں "عبادتِ نبوی" کے عنوان کے تحت مذکور ہیں) ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر حضورؐ کی ریش مبارک یا سرِ اقدس کے چند سفید بالوں پر پڑی تو انہوں نے عرض کی:

"یا رسولؐ اللہ! آپؐ کے بال پکنے لگے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"مجھے سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۂ عَمَّ یَتَسَاءَلُوْن اور سورۂ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔"

(ترمذی شریف)

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں ایک پڑاؤ پر کچھ لوگوں کو بیٹھے پایا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا،

تم کون ہو ؟ انہوں نے عرض کیا ، ہم مسلمان ہیں ۔ قریب ہی ایک عورت بیٹھی چولھا سلگا رہی تھی ۔ پاس ہی اس کا ننھا بچہ کھیل رہا تھا ۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو وہ اپنے بچے کو اٹھا کر آپؐ کی خدمت میں آئی اور بولی ، آپؐ اللہ کے رسول ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا ، ہاں بے شک ۔ اس نے پوچھا ، ایک ماں اپنے بچے پر جس قدر مہربان ہے کیا اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے ؟ آپؐ نے فرمایا ، ہاں بے شک اللہ اپنے بندوں پر ماں سے بڑھ کر مہربان ہے ۔

عورت نے کہا ، ماں تو اپنے بچے کو (ہرگز) آگ میں نہیں ڈالتی پھر اللہ اپنے بندوں کو آگ میں کیسے ڈالے گا ؟

یہ سن کر آپؐ رونے لگے پھر سر اٹھا کر فرمایا ، اللہ اسی بندے کو آگ میں ڈالے گا جو اللہ کا نافرمان اور سرکش ہے اور اس کو ایک نہیں کہتا ۔

(سُنَنِ ابن ماجہ)

حضورؐ کے مزاجِ مبارک پر خشیتِ الٰہی کے اثر کے علاوہ اس میں انتہا درجے کی نرمی اور درد مندی تھی ۔ کوئی دردناک اور عبرت دلانے والا واقعہ دیکھتے یا کسی عزیز کی وفات کا سانحہ پیش آتا تو آپؐ کا دل بھر آتا اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا ۔ کتبِ سیَر میں آپؐ کی رقیق القلبی کے بے شمار واقعات ملتے ہیں ۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں :

○ ایک دفعہ حضورؐ کسی جنازہ میں شریک تھے ۔ قبر کی کھدائی شروع ہوئی تو آپؐ اس کے کنارے بیٹھ گئے ۔ اس وقت آپؐ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے ریش مبارک بھیگ گئی اور زمین بھی نم ہو گئی ۔ پھر فرمایا ، بھائیو اس دن کے لیے سامان کر رکھو ۔ (سُنَنِ ابن ماجہ)

اپنے فرزند حضرت ابراہیمؓ ، اپنے ایک نواسے اور اپنی بیٹیوں کی وفات پر جس طرح آپؐ اشکبار ہوئے اس کا ذکر " اولاد سے محبت " کے عنوان

کے تحت کیا گیا ہے۔

○ ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بیمار ہو گئے۔ آپؐ بعض صحابہ کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے حضرت سعدؓ کی حالت دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی، اور آپ اشکبار ہو گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر دوسرے سب لوگ بھی رو پڑے۔

○ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے اپنے دورِ جاہلیت کا ایک دردناک واقعہ بیان کیا کہ انہوں نے اپنی ایک ننھی بچی کو کس بے دردی سے زندہ زمین میں گاڑ دیا۔ یہ واقعہ سن کر آپؐ بے اختیار رونے لگے یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہو گئی۔ (مسندِ دارمی)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جاں نثار صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ نہایت قیمتی لباس پہنتے تھے۔ پاؤں میں بھی نہایت قیمتی جوتا ہوتا تھا۔ ہر وقت خوشبوؤں میں بسے رہتے تھے۔ سر پر لمبی زلفیں تھیں اور بڑے بن ٹھن کر رہتے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں اس حال میں دیکھا کہ جسم پر موٹے کھردرے کپڑے ہیں اور ان میں بھی پیوند لگے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ آبدیدہ ہو گئے۔ (ترمذی شریف)

○ جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وفات پائی تو آپؐ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپؐ ان کے گھر تشریف لے گئے اور میت کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ (شمائل ترمذی)

رہبانیت سے اجتناب

رہبانیت کا مطلب ہے ترکِ دنیا یا ترکِ لذّات۔ دوسرے لفظوں میں عائلی زندگی اور دنیا سے الگ تھلگ ہو کر کسی غار یا عبادت گاہ میں گوشہ نشین ہو کر عبادت میں مصروف رہنا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عیسائیوں میں رہبانیت کا بہت رواج تھا۔ بعض عیسائی عورتیں اور مرد رہبانیت اختیار کر کے گرجوں میں گوشہ نشین ہو جاتے تھے اور بظاہر تجرّد کی زندگی گزارتے تھے لیکن یہ طرزِ زندگی قانونِ فطرت کے خلاف تھا اس لیے ان میں شرمناک اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں زہد و قناعت کو ایک اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صفت قرار دیتے تھے وہاں رہبانیت کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس سے اجتناب کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ زہد و قناعت تو یہ ہے کہ انسان دنیا میں رہ کر دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے اس قدر دل نہ لگائے کہ آخرت کی طرف سے غافل ہو جائے۔ زہد گناہوں سے بچنے اور سادہ زندگی گزارنے کا نام ہے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کے لیے اللہ کا شکر کرنے اور حرص نہ کرنے کا نام قناعت ہے۔ رہبانیت بالکل دوسری چیز ہے جو کفرانِ نعمت اور فرائض سے فرار کا نام ہے اس لیے آپ نے اس کی سختی سے ممانعت فرما دی۔

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ پر تشریف لے گئے۔ جو صحابہؓ آپؐ کے ہمراہ تھے ان میں سے ایک کا گزر اتفاق سے ایک ایسے غار پر ہوا جہاں صاف اور شیریں پانی کا ایک چشمہ تھا اور آس پاس پھلدار درخت اور دوسرے پودے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا:

> "یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جس میں رشتۂ حیات قائم رکھنے کے لیے سب چیزیں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ترکِ دنیا

کرکے اس غار میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں یہودیت اور نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا بلکہ ابراہیمی دین لے کر آیا ہوں جس میں آسانی اور سہولت ہے۔"

(مسند احمد بن حنبلؒ ج ۵)

○ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مقرب صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ قوائے شہوانیہ کو فنا کر کے رہبانیت اختیار کریں اور دنیا کی نعمتوں کو ترک کر دیں۔ آپؐ کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انہیں بلا کر فہمائش کی کہ جو شخص جان بوجھ کر اپنے قوائے شہوانیہ فنا کرے گا (خصی بنے گا) وہ میری اُمت سے نہیں ہے۔ تمہیں میری ذات کو اپنے لیے اسوہ بنانا چاہیے، میں گوشت بھی کھاتا ہوں اور اپنی بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔

حضورؐ کی فہمائش پر حضرت عثمانؓ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

(صحیح بخاری)

○ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عبادتِ الٰہی سے بہت شغف تھا۔ رات رات بھر نمازیں پڑھتے رہتے اور دن کو عموماً روزے سے رہتے۔ عبادت کے لیے انہوں نے گھر میں ایک حجرہ مخصوص کر لیا تھا۔ بیوی بچوں کی طرف سے بے نیاز ہو کر اسی میں معتکف رہتے تھے۔ حضورؐ کو ان کے اس طرزِ عمل کی خبر ہوئی تو آپؐ ان کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے مخصوص حجرے کی چوکھٹ پکڑ کر دو یا تین مرتبہ فرمایا:

"عثمان! اللہ تعالیٰ نے مجھے رہبانیت کے لیے دنیا میں نہیں بھیجا۔ اس کے نزدیک دینِ حنیف تمام ادیان سے بہتر ہے، یہ آسان بھی ہے اور سہل بھی۔"

(طبقات ابنِ سعد)

مُسندِ ابی داؤد میں ہے کہ حضور کو حضرت عثمانؓ کی مسلسل شب بیداری اور مسلسل روزے رکھنے کا حال معلوم ہوا تو آپؐ نے انہیں بلوا بھیجا، جب وہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا :

"عثمان! کیا تم کو میری سُنّت پر عمل کرنا پسند نہیں ہے؟"

انہوں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ربّ العزّت کی قسم ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کی سُنّت تو میرے لیے مشعلِ راہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تو سنو، میں سوتا بھی ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، عثمان اللہ سے ڈرو، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ اس لیے تم روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو۔"

○ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص بڑے عابد و زاہد تھے۔ ان کا ذوقِ عبادت اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ساری ساری رات نوافل پڑھنے میں گزار دیتے اور اکثر مسلسل روزے سے رہتے۔ یوں وہ اپنے اہل و عیال اور تمام دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ان کے والد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہ رسالت میں اپنے بیٹے کی راہبانہ زندگی کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا بھیجا جب وہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان سے پوچھا، کیا تم نے دن کو ہمیشہ روزہ رکھنے اور رات بھر نمازیں پڑھنے کو اپنا معمول بنا رکھا ہے؟

انہوں نے عرض کیا، جی ہاں یا رسولؐ اللہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"یہ طریقہ چھوڑ دو۔ روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو۔ رات

کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمانوں ملاقاتیوں کا بھی تم پر حق ہے۔ جو ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھے اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں۔ ہر مہینے میں تین دن کے نفلی روزے رکھ لینا (رمضان المبارک کے فرض روزوں کے علاوہ) ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے اس لیے تم ہر مہینے بس تین روزے رکھ لیا کرو اور مہینے میں ایک قرآن (تہجد میں) ختم کر لیا کرو۔"

حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔"

حضورؐ نے فرمایا، تو پھر تم داؤد علیہ السلام کی طرح ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار (یعنی روزہ کا ناغہ) کرو اور تہجد میں سات دنوں میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیا کرو۔"

حضرت عبداللہؓ نے ارشادِ نبویؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! میں ایک جوان آدمی ہوں مجھے اپنے نفس سے ڈر ہے کہ کہیں گناہ میں ملوث نہ ہو جاؤں اور شادی کرنے کی استطاعت بھی نہیں ہے پس آپؐ مجھے خصی ہونے کی اجازت دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات سن کر سکوت فرمایا۔ جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دو تین مرتبہ اپنی درخواست کا اعادہ کیا تو آپؐ نے فرمایا، اللہ کا حکم ٹل نہیں سکتا (مطلب یہ کہ تمہیں اپنے نفس پر قابو پانا چاہیے تمہارے خصی ہونے سے اللہ کا حکم نہیں ٹل سکتا جو اس کو منظور ہے وہ ہو کر رہے گا اس لیے خصی ہونے

کا کیا فائدہ؟)

کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مالدار خاتون سے شادی ہو گئی۔

○ حضرت کہمس الہلالی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے دور کسی جگہ کے رہنے والے تھے، ان تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مبلغ کے ذریعے توحید کی دعوت پہنچی تو انہوں نے اسے فوراً قبول کر لیا اور پھر مدینہ پہنچ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام کی اطلاع دی۔ اس کے بعد وہ واپس اپنے وطن چلے گئے اور ہمہ تن عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ ساری رات جاگ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے اور دن کو روزہ رکھتے۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں نہایت لاغر ہو گئے۔ کوئی ایک سال بعد دوبارہ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے تو آپؐ کو ان کا حلیہ بدل جانے کی وجہ سے پہچاننے میں دشواری ہوئی میاں سے پوچھا، تم کون ہو؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! میں کہمس الہلالی ہوں، پچھلے سال حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

آپؐ نے فرمایا، یہ تمہاری کیا حالت ہے۔ اس قدر کمزور کیسے ہو گئے ہو؟

انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہاں سے واپس جا کر میں مسلسل روزے رکھتا رہا ہوں اور راتیں میں نے جاگ کر عبادت کرتے ہوئے گزاری ہیں۔

آپؐ نے فرمایا، تم کو اس قدر تکلیف اٹھانے کا کس نے حکم دیا تھا مہینہ میں صرف ایک روزہ کافی ہے۔

انہوں نے عرض کیا، مجھ میں اس سے زیادہ روزے رکھنے کی طاقت ہے۔

ارشاد ہوا، خیر تین سہی۔

(طبقات ابن سعد)

○ ایک دفعہ چند صحابہ ازواجِ مطہراتؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں پوچھا۔ ان

صحابہؓ کا خیال تھا کہ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسلم ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے ہوں گے لیکن جب اُمّہات المؤمنینؓ نے ان کو بتایا کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم سوتے بھی ہیں اور گھر کے کام کاج وغیرہ میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو وہ بولے کہ ہمیں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم سے کیا نسبت، آپؐ کی تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کردی ہے۔ پھر ان میں سے ایک صاحب نے کہا، میں تو اپنے شب و روز نمازیں پڑھنے میں گزاروں گا، دوسرے نے کہا، میں ہمیشہ مسلسل روزے سے رہا کروں گا۔ تیسرے نے کہا، میں عمر بھر شادی نہ کروں گا۔ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسلم ان کی باتیں سن رہے تھے، آپؐ نے تینوں کو اپنے سامنے بلایا اور ان سے فرمایا:

"واللہ! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں تاہم میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو شخص میرے طریقے پر نہیں چلتا وہ میری جماعت سے خارج ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ بحوالہ صحیح بخاری، کتاب النکاح)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زُہد و قناعت

زُہد کے معنی ہیں دنیا کی لذّتوں اور راحتوں میں دل نہ لگانا بلکہ راحتِ آخرت کے لیے انہیں مُطلق یا بڑی حد تک ترک کر دینا اور قناعت کے معنی ہیں کھانے پینے کی چیزوں میں صرف اشیائے ضروریہ پر اکتفا کرنا اور مال سامان وغیرہ جمع کرنے کی حرص نہ کرنا۔ قناعت کی نسبت ایک حدیث میں آیا ہے کہ قناعت ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔ جو شخص فقر و اِفلاس میں مبتلا ہو اس کا زُہد و قناعت اختیار کرنا مجبوری کے سبب سے ہوتا ہے لیکن جس شخص کو دنیا کی تمام نعمتیں مُیسّر ہوں یا اس کے ادنیٰ اشارے پر مہیا ہو سکتی ہوں وہ اگر زہد و قناعت اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی حقیقی زہد و قناعت ہے اور اس کی خوشنودی کا باعث ہے۔ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے زہد و قناعت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز کیا تھا۔ آپؐ نے تنگ دستی کا زمانہ بھی دیکھا اور وہ زمانہ بھی جب لاکھوں مربع میل کا علاقہ آپؐ کے زیرِ نگیں تھا۔ تمام عَرَب میں آپؐ کا حکم نافذ تھا۔ یمن سے سرحدِ شام تک آپؐ کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، لاکھوں انسان آپؐ کے ایک اشارے پر اپنی ہر شے حتیٰ کہ جان تک آپؐ پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ملک کے کونے کونے سے اس قدر خراج آتا تھا کہ مسجدِ نبوی کے صحن میں اس کا بہت بڑا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ اس میں سونا چاندی اور دوسری بیش قیمت اشیاء بھی ہوتی تھیں لیکن حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ہر زمانے میں اور ہر حال میں صبر و شکر اور قناعت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ تاریخِ عالم

میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

صحیحین کی ایک حدیث میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے جو کی روٹی سے بھی متواتر دو دن اپنا پیٹ نہیں بھرا یہاں تک کہ آپؐ اس دنیا سے اٹھا لیے گئے۔

ایک اور حدیث میں آپ فرماتی ہیں کہ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ مہینہ مہینہ بھر ہمارے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی۔ پوچھا گیا پھر آپؐ کا گزارہ کیسے ہوتا تھا۔ فرمایا، چند کھجوریں کھا کر اوپر سے پانی پی لیا کرتے تھے۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی راتیں مسلسل اس حالت میں گزر جاتی تھیں کہ آپؐ کے گھر والے فاقے سے ہوتے تھے کیونکہ رات کا کھانا نہیں پاتے تھے تو ان کا رات کا کھانا بس جو کی روٹی ہوتی تھی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ اے اللہ محمدؐ اور اس کے متعلقین کی روزی بقدر کفاف ہو یعنی نہ اتنی تنگی ہو کہ اپنے کام بھی نہ انجام دے سکیں اور نہ اتنی فراغت کہ کل کے لیے ذخیرہ رکھا جا سکے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں دنیا سے اٹھا اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرما۔ (ابن ماجہ۔ ترمذی اور بیہقیؒ نے اس کو حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا، اللہ کے راستہ میں مجھے اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا اور ایک دفعہ تیس دن رات مجھ پر اس حال میں گزرے کہ میرے اور بلال کے لیے کھانے کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی جاندار کھا سکے سوائے اس شے کے جو بلال نے اپنی بغل میں دبا رکھی تھی۔ (جامع ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؐ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے۔ سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا، بھوک کی وجہ سے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مسجد میں لیٹے ہوئے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدل رہے ہیں۔ (صحیح مسلم)

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی تمام ازواج مطہراتؓ کے گھروں میں اکثر فقر و فاقہ کی کیفیت رہتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شخص نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کے ہاں پیغام بھیجا کہ کچھ کھانے کے لیے بھیج دو۔ جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں۔ آپؐ نے دوسرے گھر سے کھانا طلب کیا وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ مختصر یہ کہ جب دوسرے تمام گھروں سے بھی یہی جواب آیا تو پھر ایک صحابی اس شخص کو اپنے گھر لے گئے۔ (صحیحین)

اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک مرتبہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا بستر دوہرا کر کے بچھا دیا۔ آپؐ اس کی نرمی کے سبب سے ایسے سو گئے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی اذانِ فجر سے پہلے بیدار نہ ہوئے۔ آپؐ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا:

"اے حفصہ! تو نے آج کپڑا دوہرا کر کے میرے نیچے بچھا دیا اس کی نرمی نے مجھے آج شب کی نماز سے روک لیا اور میں فجر تک سوتا رہا۔ اے حفصہ! میرا دنیا سے کیا واسطہ اور نرم بستروں سے میرا کیا کام!" (الفاروق)

جس طرح سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی غذا بے حد سادہ تھی اسی طرح آپؐ کا لباس بھی بے حد سادہ ہوتا تھا بعض اوقات آپؐ کے موٹے اور کھردرے لباس میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ کئی مرتبہ ان کھردرے کپڑوں سے آپؐ کا جسم مبارک چھل جاتا تھا۔ آپؐ کے خادم حضرت انس بن مالک رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم حج کے لیے گئے تو میں نے دیکھا کہ جو چادر آپؐ نے اوڑھ رکھی تھی اس کی قیمت چار درہم سے زیادہ نہ تھی۔

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فقر و زہد اور قناعت کی متعدد مثالیں "رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شانِ جہانبانی" کے عنوان کے تحت بھی بیان کی گئی ہیں، یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعات پڑھ کر بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب فدک خیبر وغیرہ کی آمدنی اور مالِ غنیمت کے خمس سے آپؐ کو حصہ مل جاتا تھا تو پھر آپؐ کے فقر و زہد کا کیا سبب تھا۔ علامہ شبلی نعمانی رحؒ نے "سیرۃ النبیؐ" میں اس کا یہ جواب دیا ہے:

"بے شبہ آپؐ بقدرِ نفقہ آمدنی میں سے لے لیتے باقی فقراء اور اہلِ حاجت کو دے دیتے تھے لیکن آپؐ اپنے لیے جو رکھ لیتے وہ بھی اہلِ حاجت کی نذر ہو جاتا تھا۔"

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کفالتِ عامہ، جود و سخا، ایثار اور مہمان نوازی وغیرہ کے واقعات پڑھ کر ثابت ہو جاتا ہے کہ علّامہ شبلی رحؒ نے آپؐ کے فقر و زہد کا جو سبب لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

جمالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

ہر مسلمان کا یہ پختہ عقیدہ اور اس بات پر کامل ایمان ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ نے اس دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول بھیجے ان کو جہاں عصمت اور باطنی کمالات سے نوازا وہاں ان کو ہر قسم کے جسمانی عیوب و نقائص سے بھی پاک رکھا۔ کسی بھی قوم اور کسی بھی خطۂ ارض میں کوئی ایسا پیغمبر مبعوث نہیں ہوا جو اندھا، کانا، لولا لنگڑا، بدصورت یا کریہہ المنظر ہو۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے سبھی فرستادے ظاہری حسن و جمال اور مردانہ وجاہت سے متصف تھے۔ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی تمام کمالات و صفات کی جامع اور اس شعر کا مصداق اور مظہرِ اتم تھی:

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں یقیناً آپؐ کا ظاہری حسن و جمال بھی شامل ہے۔ جن مقدس ہستیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں، انھوں نے جن الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپائے اقدس بیان کیا ہے ان سے آپؐ کے بے مثل جمالِ عالم افروز کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے اس سے پہلے کہ ان میں سے چند ایمان افروز بیانات یہاں نقل کیے جائیں، اس روح پرور موضوع پر دربارِ رسولؐ کے شاعر حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے یہ دو شعر پڑھیے:

وَاَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي ۔۔۔ وَاَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ ۔۔۔ كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

یعنی آپؐ سے حسین تر میری آنکھ نے نہیں دیکھا ۔۔۔ اور آپؐ سے بہتر کسی ماں نے نہیں جنا
آپؐ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ۔۔۔ گویا آپؐ اپنی مرضی کے مطابق پیدا ہوئے

ان دو شعروں میں گویا ایسی تمام روایتوں کا خلاصہ اور عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے جو اس موضوع پر کُتُبِ حدیث میں ملتی ہیں۔ اب جمالِ خیر البشر صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں چند مستند احادیث ملاحظہ فرمایئے:

⊙ حضرت علی بن ابی طالب رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نہ تو دراز قامت تھے اور نہ پستہ قد بلکہ متوسط قامت کے تھے۔ آپؐ کا سر (مبارک) بڑا تھا اور ریش (مبارک) گنجان۔ ہاتھ اور پاؤں پُر گوشت۔ رنگ آپؐ کا سرخ و سفید تھا۔ ہڈیوں کے جوڑ موٹے (مضبوط) تھے۔ آپؐ کے جسم (مبارک) پر بال نہ تھے صرف ایک لمبی دھاری یا لکیر بالوں کی سینہ سے ناف تک چلی گئی تھی۔ چلتے وقت آپؐ قدم پوری قوّت سے اٹھاتے اور آگے کی جانب جُھکے ہوئے ہوتے گویا آپؐ بلندی سے نیچے اتر رہے ہیں۔ آپؐ جیسا خوبصورت انسان نہ آپؐ سے پہلے دیکھا اور نہ آپؐ کے بعد۔ آپؐ پر اللّٰہ کی رحمت ہو۔

(مشکوٰۃ شریف بحوالہ ترمذی)

سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے وصال کے سالہا سال بعد جلیل القدر صحابی ابنِ صحابی حضرت عمّار بن یاسر رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہما کے پوتے ابو عبیدہ بن محمدؒ ایک دن مدینہ منوّرہ کی ایک بزرگ خاتون رُبَیّعؓ بنتِ مُعَوِّذ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے پوچھا:

"امّاں جان! رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حُلیہ مبارک کیسا تھا؟"

حضرت رُبَیّعؓ جو سالہا سال تک رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کر چکی تھیں، بے ساختہ بولیں:

يَا بُنَيَّ لَوْ رَأَيْتَهُ رَأَيْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً

"اے بیٹے! اگر تم اُن (رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو دیکھتے تو یوں سمجھتے گویا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔" (مُسند دارمی، اُسدُ الغابہ)

○ حضرت جابر بن سَمُرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو چاندنی رات میں دیکھا۔ آپؐ نے سرخ دھاری دار لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ میں کبھی چاند کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کی طرف۔ آپؐ مجھ کو چاند سے کہیں بڑھ کر حسین وجمیل نظر آتے تھے۔ (شمائلِ ترمذی، مُسندِ دارمی)

○ حضرت براء بن عازِب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا روئے انور صفائی اور چمک میں تلوار کی مانند تھا؟ انہوں نے فرمایا، نہیں بلکہ چاند کی مانند تھا۔ (صحیح بخاری)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے زیادہ خوبصورت کسی کو نہیں دیکھا۔ آپؐ سامنے ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب چمک رہا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

○ حضرت براء بن عازب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سب آدمیوں سے خوب صورت تھے۔ میں نے آپؐ کو سُرخ چادر اوڑھے دیکھا تھا جتنی آپؐ پر سجتی تھی کسی پر نہ سجتی تھی۔ (صحیح بخاری)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نہ تو حدِ اعتدال سے زیادہ لمبے تھے اور نہ پستہ قد اور آپؐ نہ تو بالکل سفید رنگ کے تھے اور نہ گندم گوں (بلکہ سرخ وسفید تھے) اور آپؐ کے سر کے بال نہ تو زیادہ بل کھائے ہوئے تھے اور نہ بالکل سیدھے۔ (صحیحین)

○ حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہندؓ بن ابی ہالہ سے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حلیۂ مبارک کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا، رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نہایت

خوبصورت اور بارعب تھے۔ آپؐ کا چہرہ اس طرح چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔ آپؐ کا قد پست قامت آدمی سے لمبا اور دراز قد آدمی سے چھوٹا تھا۔ سر مبارک بڑا تھا۔ بال زیادہ گھنگھریالے نہ تھے اگر درمیان سے مانگ نکالی جاتی تو علیحدہ علیحدہ رہتے ورنہ نہیں۔ بال بڑھ جاتے تو کانوں کی لوؤں تک پہنچ جاتے۔ چہرہ کا رنگ چمکدار تھا، پیشانی کشادہ تھی۔ بھویں لمبی لیکن باہم ملی ہوئی نہ تھیں۔ دونوں بھوؤں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصّے کی حالت میں نمایاں ہو جاتی تھی۔ ناک مبارک سیدھی اور موزوں تھی، جس سے نور کی شعاع نکلتی ہوئی معلوم ہوتی۔ ریش مبارک گھنی تھی، رخسار ہموار تھے۔ دہن مبارک کشادہ اور ہونٹ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ دندان مبارک چمکدار اور ان کے درمیان (ذرا ذرا سا) فاصلہ تھا۔ گردن مبارک لمبی اور چاندی کی طرح سفید تھی۔ تمام اعضاء متناسب تھے اور ان کا اعتدال آشکارا تھا۔ شکم اور سینہ مبارک ہموار تھے، سینہ مبارک فراخ تھا، دونوں کندھوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ہڈیوں کے جوڑ مضبوط تھے۔ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک پتلی سی لکیر تھی۔ اس کے علاوہ سینہ اور شکم بالوں سے صاف تھے۔ بازوؤں، کندھوں اور سینہ کے اوپر والے حصّے پر بال اُگے ہوئے تھے۔ بازو لمبے، ہتھیلیاں چوڑی، ہاتھ اور پاؤں نرم تھے۔ آہستہ چلتے تو یوں معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کی طرف اتر رہے ہیں (عموماً) آپؐ تیز قدم اٹھاتے تھے۔ جب مڑتے تو پوری طرح مڑ جاتے۔ نگاہیں جھکی ہوئی ہوتیں۔ نظر آسمان کی طرف ہونے کی نسبت زمین کی طرف زیادہ ہوتی تھی۔ (اُسد الغابہ)

۱۳ سنہ نبوّت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ کے پہلے تین شب و روز غارِ ثور میں گزرے۔ غار سے نکلنے کے بعد آپؐ نے سفر کا دوبارہ آغاز فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور

حضرت عامر بن فُہَیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما آپؐ کے ہمرکاب تھے۔ اثنائے سفر میں قُدَیْد کے علاقہ سے گزرتے ہوئے اس مقدس قافلے کا گزر ایک صحرائی (بدوی) خاتون اُمِّ معبد عاتکہ بنت خالد کے خیمے پر ہوا۔ پختہ عمر کی یہ باوقار اور باعفت خاتون بنو خزاعہ کی شاخ بنی کعب سے تعلق رکھتی تھیں اور اُن لوگوں کی میزبانی کیا کرتی تھیں جو ان کے پاس سے گزرتے تھے۔ اُن دنوں خشک سالی کی وجہ سے سارا علاقہ بُری طرح متاثر تھا۔ ان مقدس مسافروں نے خیمے کے سامنے بیٹھی ہوئی اُمِّ معبد سے فرمائش کی کہ دودھ، گوشت، یا کھجوریں جو کچھ بھی تمہارے پاس ہو ہمیں دو ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔

اُمِّ معبد نے کہا اس وقت میرے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے اگر ہوتی تو بخدا آپ لوگوں کو پیش کرنے میں ہرگز تامل نہ کرتی۔ ہمیں تو قحط سالی نے مار ڈالا ہے اور ہم دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ اتنے میں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظر ایک مریل بکری پر پڑی جو خیمے کے ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ حضورؐ نے پوچھا، اُمِّ معبد یہ بکری کیسی ہے؟

اُمِّ معبد نے کہا، یہ اپنی لاغری اور کمزوری کی وجہ سے چل نہیں سکتی اس لیے دوسری بکریوں کے ساتھ چرنے کے لیے نہیں جا سکی۔

حضورؐ نے پوچھا، کیا یہ کچھ دودھ دے سکتی ہے۔

اُمِّ معبد نے کہا، کمزوری کی وجہ سے اس کا دودھ خشک ہو چکا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا، اگر اجازت دو تو ہم اس کا دودھ دوہ لیں۔

اُمِّ مَعْبَد نے کہا، اگر آپ اس میں کچھ بھی دودھ پائیں تو ضرور نچوڑ لیں۔

بکری کو حضورؐ کے پاس لایا گیا۔ آپؐ نے اس کے پاؤں باندھے اور پھر اس کے تھنوں پر (بروایتِ دیگر پیٹھ پر بھی) ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی:

"الٰہی اس عورت کی بکریوں میں برکت دے۔" اور ساتھ ہی اللہ لے کر دودھ دوہنا شروع کر دیا۔ اللہ کی شان اس خشک تھیری والی

بکری سے اتنا دودھ نکلا کہ اُمِّ معبد سمیت سب نے سیر ہو کر پیا۔ آپؐ نے دوبارہ اسے دوہا تو ایک بڑا برتن لبالب بھر گیا۔ آپؐ نے اسے اُمِّ معبد کے حوالے کیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُمِّ معبد کا شوہر ابو معبد اپنا ریوڑ لے کر واپس گھر آیا تو دودھ سے بھرا ہوا برتن دیکھ کر حیران رہ گیا، بیوی سے پوچھا، یہ دودھ کہاں سے آیا، گھر میں تو کوئی شیر دار جانور نہ تھا؟

اُمِّ معبد نے کہا، خدا کی قسم ایک مبارک ہستی یہاں سے گزری ہے اس نے یہ کچھ کیا۔ پھر اس نے سارا واقعہ بیان کیا۔

شوہر نے کہا، ذرا اس کا حلیہ تو مجھے بتا!۔

اب اُمِّ معبد یوں گویا ہوئیں:

وہ میں نے ایک ایسا مرد دیکھا جس کا حُسن و جمال نمایاں تھا۔ نہایت متناسب الاعضاء، چہرہ ملیح تھا۔ بدن نہ بھاری تھا نہ نحیف، خوبرو اور خوش اندام، آنکھیں سیاہ و فراخ، پلکیں لمبی تھیں۔ آواز گونج دار مگر کرخت نہ تھی۔ سیاہ چشم سرگیں، ابرو نہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے اور نہ بالکل ملے ہوئے بلکہ درمیان میں ہلکے ہلکے بال تھے اور ابروؤں کے کنارے باریک تھے۔ بال نہایت سیاہ تھے۔ گردن میں درازی تھی، ڈاڑھی گھنی تھی۔ خاموش ہوتا تو بہت باوقار دکھائی دیتا۔ بولتا تو معلوم ہوتا کہ اس کی آواز گرد و پیش پر چھا گئی ہے۔ گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی (یعنی مسلسل اور مربوط) بہت میٹھی، واضح اور الفاظ کی کمی بیشی سے مبرا۔ دور سے دیکھنے میں نہایت زیبندہ و دلکش، قریب سے نہایت شیریں اور حسین۔ میانہ قد نہ اتنا دراز کہ آنکھیں وحشت زدہ ہو جائیں اور نہ اتنا پست کہ آنکھوں کو حقیر معلوم ہو، زیبندہ نہال

کی تازہ و شاداب شاخ۔ ساتھیوں میں سب سے زیادہ زیبندہ منظر اور والا قدر، ساتھی ایسے جو اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کی بات بڑی توجہ سے سنتے اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے۔ وہ مخدوم و مُطاع تھا، نہ ترش رُو تھا اور نہ درشت کلام۔ نہ ادھوری بات کرنے والا تھا اور نہ ضرورت سے زیادہ بولنے والا۔"

ابومعبد یہ سنتے ہی بول اٹھا کہ خدا کی قسم یہ تو وہی صاحب قریش تھے جن کا ذکر ہم سنتے رہے ہیں۔ میں ان سے ملتا تو ان سے درخواست کرتا کہ مجھے اپنا ساتھی بنالیں اب میں ضرور ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ (بعثت کے بعد آنحضورؐ عرب میں "صاحبِ قریش" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔)

اُمِّ معبدؓ کے اسلام کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ اُسی وقت شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئیں۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حُضُور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ہجرتِ مدینہ کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنے شوہر ابومعبد کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں اور پھر دونوں میاں بیوی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر مُشرّف باسلام ہو گئے۔

سفرِ ہجرت میں آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اُمِّ معبدؓ کے ہاں کچھ دیر قیام کا واقعہ ابنِ سعدؒ، ابنِ خزیمہؒ، طبرانیؒ، بیہقیؒ، بزارؒ، حاکمؒ بغویؒ، ابنِ عبدالبرؒ اور کئی دوسرے اربابِ علم نے مختلف سندوں سے بیان کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی اپنی تاریخ میں اس کو درج کیا ہے۔

اُمِّ معبدؓ نے جن الفاظ میں آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حلیہ شریف بیان کیا ہے، قریب قریب سبھی کتابوں میں (الفاظ یا ترتیبِ الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ) جمالِ نبوی کا نقشہ اسی طرح کھینچا گیا ہے۔ ایک

صحرائی خاتون کا یہ حسنِ کلام حقیقت اور بے ساختگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

○ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دانتوں میں ہلکی سی درز تھی۔ جب آپؐ گفتگو فرماتے تو محسوس ہوتا کہ ان دانتوں کے درمیان سے نور نکل رہا ہے۔ (مُسند دارمی)

○ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بات پر خوش ہوتے تو آپؐ کا چہرۂ مبارک اس طرح کھل (چمک) اٹھتا جیسے چاند کا ٹکڑا ہے۔ (بخاری و مسلم)

○ حضرت جابر بن سَمُرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیاں سُبک اور نازک تھیں۔ آپ کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے بلکہ مسکرایا کرتے تھے۔ جب میں آپؐ کی طرف دیکھتا تو اپنے دل میں کہتا کہ آپؐ سرمہ لگائے ہوئے ہیں حالانکہ آپؐ سرمہ لگائے نہ ہوتے تھے۔ (ترمذی شریف)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روشن اور چمکتا ہوا رنگ تھا اور آپؐ کا پسینہ گویا موتی تھے۔ جب آپؐ راستہ چلتے تو آگے کی جانب (قدرے) جھکے رہتے اور میں نے دیبا اور کسی ریشمی کپڑے کو آپؐ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم نہ پایا اور میں نے کوئی مشک اور عنبر ایسا نہیں سونگھا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ اطہر کی سی خوشبو ہو۔ (صحیحین)

○ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی راہ سے گزرتے تو آپؐ کے بعد جو شخص اس راہ سے گزرتا اسے معلوم ہو جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے تشریف لے گئے

ہیں کیونکہ وہ راہ آپؐ کے جسم مبارک یا پسینہ کی خوشبو سے مہکی ہوتی۔ (ترمذی شریف)

○ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرتا تھا یا میرا جسم آپؐ کے جسد اطہر سے چھو جاتا تو میں اس کا اثر بعد میں اپنے ہاتھ میں پاتا اور میرا ہاتھ کستوری سے زیادہ خوشبو دار رہتا۔ (سراپائے اقدس از حکیم غلام نبی)

○ حضرت اُم سُلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لایا کرتے تھے اور دوپہر کو استراحت فرمایا کرتے تھے آپؐ کو پسینہ زیادہ آیا کرتا تھا، میں آپ کے پسینہ کو جمع کر لیتی اور اپنے عطر میں ملا لیتی۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پسینہ جمع کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا، اُم سُلیم! یہ کیا کرتی ہو؟

میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ آپؐ کا پسینہ ہے ہم اس کو اپنی خوشبو میں ملاتے ہیں اور آپ کا یہ پسینہ بہترین خوشبو ہے"۔

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ صحیحین)

○ حضرت ابو الطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ سفید ملیح تھا اور آپؐ متناسب الاعضاء تھے۔ (صحیح مسلم)

○ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام لانے سے قبل جب پہلی دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھے، واللہ یہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ (ترمذی شریف)

○ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خضاب کرتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں اتنی سفیدی ہی نہیں آئی تھی کہ خضاب لگانے کی نوبت پہنچتی۔ (ترمذی شریف)

○ ایک اور روایت میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں کہ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے سفید بالوں کو گننا چاہتا تو گن لیتا تھا۔ (مشکوٰۃ شریف بحوالہ بخاری ومسلم)

○ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت کو آپؐ کے شانہ کے قریب دیکھا جو کبوتر کے انڈے کی مانند تھی اور اس کا رنگ آپؐ کے جسم اطہر جیسا تھا۔

(صحیح مسلم)

○ حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روٹی اور گوشت کھایا۔ پھر میں آپؐ کے پیچھے گیا اور مہر نبوت کو دیکھا جو دونوں شانوں کے درمیان بائیں شانہ کی نرم ہڈی کے پاس مٹھی کی مانند تھی اور اس پر مسوں کے مانند تل تھے۔

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسلم)

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظافت پسندی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی روحانی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے انسانیت کے منتہائے کمال کا مظہر تھی اور ہر اعتبار سے اطہر و مُطہّر اور اطیب و مُطیّب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس طرح بے مثال حسن و جمال اور وجاہت و صباحت سے نوازا تھا اسی طرح آپ کے مزاج مبارک میں کمال درجے کی نظافت، نفاست اور نزاہت بھی ودیعت کی تھی۔ قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ (التوبہ آیۃ ۱۰۸)

(اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر تھی اور آپ کو بارگاہِ الٰہی میں درجۂ محبوبیت حاصل تھا۔ آپ نے طہارت، پاکیزگی، صفائی اور ستھرائی کو اس قدر اہمیت دی کہ اسے ایمان کا جزو بنا دیا۔ اس موضوع پر آپ نے سینکڑوں سال پہلے جو کچھ ارشاد فرمایا، آج کا ترقی یافتہ سائنسی دور بھی اس کی حکمت اور افادیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس دور میں جسم کی صفائی کے لیے غسل اور وضو کو اور دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کو ضروری قرار دیا تو آج کے دور میں بھی غسل اور دانتوں کی صفائی کی اہمیت برقرار ہے۔ اگر اس دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف شجر کاری کا حکم دیا اور دوسری طرف گھروں، گلی کوچوں اور عام گزرگاہوں وغیرہ کو کوڑا کرکٹ اور نجاست سے پاک رکھنے کا حکم دیا تو آج کے سائنس دان بھی ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے انہی باتوں پر زور دے رہے ہیں۔

جہاں تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات کا تعلق تھا تو طہارت

اور صفائی ستھرائی کا جس قدر التزام آپؐ فرماتے تھے، کسی دوسرے کے لیے اس کی برابری کرنا محال تھا۔ غسل اور وضو تو خیر طہارت یا عبادت کا لازمہ ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالوں اور دانتوں کی نگہداشت اور صفائی کا بھی خاص اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں کثرت سے تیل ڈالا کرتے تھے اور ڈاڑھی میں بہت کنگھی کیا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ)

○ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر میں (کنگھی سے) مانگ نکالا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری و مسلم)

○ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات اور دن میں جب سو کر اٹھتے تو وضو کرنے سے پہلے مسواک (ضرور) کرتے۔

(مسند احمد، سنن ابی داؤد)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میری امت پر یہ امر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز سے پہلے وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (صحیحین)

○ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسواک منہ کو پاک کرتی ہے اور اللہ کو راضی کرتی ہے۔

(مسند احمد۔ دارمی)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسواک کرنا اس قدر مرغوب تھا کہ آپ نے وفات سے کچھ دیر پہلے مسواک طلب فرمائی تو اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے دانتوں سے نرم کر کے پیش کی۔ آپؐ نے بخار کی تلخی اور کمزوری کے باوجود اسے نہایت خوبی سے استعمال کیا۔

صحیحین میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ پانچ

چیزیں فطرت انسانی میں داخل ہیں۔ ختنہ کرانا، زیرِ ناف بال صاف کرنا، ناخن تراشنا، لبوں کے بال کٹانا اور بغلوں کے بال صاف کرنا۔ (ان پانچوں باتوں کا تعلق طہارت اور پاکیزگی سے ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ پاک و طیب ہے۔ پاکیزگی اور صفائی کو پسند کرتا ہے۔ تم اپنے صحنوں کو پاک و صاف رکھو اور (کوڑا کرکٹ جمع رکھنے میں) یہود کی مشابہت نہ کرو۔

(جامع ترمذی)

○ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے لیے ہمارے یہاں تشریف لائے تو آپؐ کی نظر ایک پراگندہ حال شخص پر پڑی جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، کیا اس آدمی کو کوئی ایسی چیز نہیں مل سکتی تھی جس سے یہ اپنے سر کے بالوں کو ٹھیک کر لیتا۔

اور اسی مجلس میں آپؐ نے ایک اور آدمی کو دیکھا جس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، کیا یہ آدمی کوئی ایسی چیز (صابن وغیرہ) نہیں پا سکتا تھا جس سے یہ اپنے کپڑے دھو کر صاف کر لیتا۔ (مشکوٰۃ)

ایک دن بہت سے کاروباری لوگ مسجدِ نبوی میں میلے کچیلے کپڑوں میں چلے آئے۔ اس زمانے میں مسجدِ نبوی بہت تنگ تھی۔ ساری مسجد میں بو پھیل گئی۔ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا، کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ نہا کر آتے۔

(صحیح بخاری)

اس کے بعد غسلِ جمعہ ایک حکمِ شرعی بن گیا۔ (سیرۃ النبیؐ)

○ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص مسجد میں آیا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل بکھرے ہوئے تھے تو آپؐ نے اپنے ہاتھ سے اس کو اشارہ

فرمایا جس سے آپؐ کی مراد یہ تھی کہ جاؤ اور سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو درست کرکے آؤ۔ چنانچہ وہ گیا اور اپنے بالوں کو درست کرکے واپس آیا تو آپؐ نے فرمایا، کیا یہ (یعنی تمہارا سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سنوار کر آنا) اس سے بہتر نہیں ہے کہ آدمی کے بال اس طرح بکھرے ہوئے ہوں گویا وہ (زشت یعنی میں) شیطان ہے۔ (مؤطا امام مالکؒ)

○ ابو الاحوص رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس حالت میں کہ میں نے ناکارہ گھٹیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپؐ نے مجھ سے پوچھا، کیا تیرے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا، ہاں یا رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا، کس قسم کا مال ہے؟ میں نے عرض کیا، سب طرح کا مال اللہ تعالیٰ نے عنایت کیا ہے، گائیں بیل بکریاں، اونٹ گھوڑے اور غلام۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تجھے مال دیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور کرامت کا اثر تیرے وجود پر بھی ہونا چاہیے۔

(مسند احمد و سنن نسائی)

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ کوئی شخص سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خستہ حالی کی زندگی گزارے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے۔ ایسا کرنا بخل میں داخل ہے جو نحوست کی نشانی ہے۔ انسان کو اپنی حیثیت کے مطابق لباس پہننا چاہیے۔ نمود و نمائش کے لیے نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر۔ لوگوں کو دکھانے یا ان پر رعب ڈالنے کے لیے اعلیٰ لباس پہننا جائز نہیں۔

○ عربوں کی عادت تھی کہ وہ راستوں میں بلا تکلف بول و براز کرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ ایک نہایت قبیح حرکت تھی اور آپؐ لوگوں کو اس سے نہایت سختی سے منع فرماتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کی عام گزرگاہوں پر نجاست ڈالے وہ ملعون ہے۔ اس پر خدا کی، خدا کے فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔
(مُسندِ بیہقی)

○ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، گزرگاہ عام، سایہ دار درخت اور وہ مقام جہاں قافلے پڑاؤ ڈالتے ہوں، ان تینوں جگہوں پر قضائے حاجت کرنا لعنت کا موجب ہے۔
(مُسندِ احمد)

مسجدوں کو پاک صاف رکھنا آپؐ نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات دیکھتے جس سے مسجد کی پاکیزگی اور تقدس پر حرف آتا ہو تو سخت ناراض ہوتے البتہ کسی سے ناواقفیت یا جہالت کی بناء پر مسجد کے تقدس کے منافی کوئی حرکت سرزد ہو جاتی تو اسے نرمی سے سمجھا دیتے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ ایک دفعہ آپؐ نے مسجد کی دیواروں پر جگہ جگہ تھوک کے دھبے دیکھے۔ اس وقت آپؐ اپنے دستِ مبارک میں کھجور کی ایک ٹہنی پکڑے ہوئے تھے۔ آپؐ نے اسی ٹہنی سے تمام دھبے کھرچ ڈالے پھر ناراضی کے لہجے میں لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا، کیا تم پسند کرو گے کہ کوئی تمہارے سامنے آ کر تمہارے منہ پر تھوک دے۔ سن رکھو کہ جب کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اور ملائکہ اس کے داہنی طرف ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کو مسجد میں سامنے یا ادھر اُدھر تھوکنا نہیں چاہیے۔ (شمائلِ کبریٰ بحوالہ ترغیب و ترہیب مُنذری)

ایک اور موقع پر حضورؐ نے مسجد کی دیوار پر تھوک کا دھبہ دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ روئے انور سرخ ہو گیا۔ ایک انصاری خاتون نے اس دھبے کو مٹا ڈالا اور اس جگہ خوشبو لا کر مَلی۔ نیک بخت خاتون کا یہ کام دیکھ کر حضورؐ بہت خوش ہوئے اور ان کی تحسین فرمائی۔ (نسائی کتاب المساجد)

○ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک جگہ بلغم لگا ہوا ہے۔ آپؐ نے اسے لکڑی سے کھرچ دیا (دُور کر دیا) اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا، تم میں سے کس کو یہ بات پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے منہ پھیرے؟ پھر آپؐ نے فرمایا، عبیر لاؤ (عبیر ایک قسم کی خوشبو ہوتی ہے) ایک انصاری نوجوان دوڑ کر گھر گئے اور خوشبو لے آئے، حضورؐ نے یہ خوشبو لکڑی کے سرے پر لگائی اور جس جگہ سے بلغم دور کیا تھا، وہاں مَل دی۔ (ابو داؤد)

○ ایک صاحبؓ رسولؐ نے عین نماز میں (جبکہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے۔ نماز کے بعد جب اُن صاحبؓ کو کسی نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے تو وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا آپؐ نے یہ حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں تم نے اللہ اور پیغمبر کو اذیت دی۔ (سیرۃ النبی بحوالہ ترغیب و ترہیب)

○ مساجد کی حُرمت کے پیشِ نظر حضورؐ نے حکم دیا کہ (ناسمجھ) بچوں اور فاتر العقل (دیوانے) آدمیوں کو مسجدوں کے اندر نہ جانے دیا جائے، اور نہ وہاں کسی قسم کی خرید و فروخت کی جائے۔ آپؐ نے یہ حکم بھی دیا کہ جمعہ کے دن مساجد میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں۔

(سیرۃ النبی بحوالہ ابن ماجہ)

○ پیاز لہسن اور مُولی کی بُو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کراہت فرماتے تھے اس لیے حکم دیا تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں۔ صحیح بخاری میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ جو شخص پیاز لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے (شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ

اگر یہ چیزیں خوب پکا کر کھائی جائیں یہاں تک کہ ان کی بو ختم ہو جائے تو ان کو کھا کر مسجد میں جانا جائز ہے۔)

○ درختوں کے گوناگوں فوائد کو زمانۂ قدیم سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے سائنسدانوں نے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے جن چیزوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ان میں درخت سرِ فہرست ہیں۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے سینکڑوں سال پہلے لوگوں کو شجرکاری کا حکم دیا تھا۔

○ حضرت ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر قیامت برپا ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک پودا ہو اور وہ اس کو لگانے کی قدرت رکھتا ہو تو چاہیے کہ اس کو لگا دے۔

(ادب المفرد، امام بخاریؒ)

○ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان ایسا پودا بوتا ہے جس سے کسی انسان یا چوپائے کو غذا میسر آسکے تو یہ اس کے حق میں صدقہ کا حکم رکھتا ہے (یعنی پودا بونے والے کو صدقہ دینے کا ثواب ملے گا۔) (صحیح بخاری)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے راستوں (گلی کوچوں سڑکوں اور عام گزرگاہوں) میں نہ صرف غلاظت پھیلانے یا نجاست پھینکنے سے منع فرمایا ہے بلکہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ راستہ سے تکلیف پہنچانے والی ہر چیز کو دور کر دینا نہایت اچھا عمل ہے۔ (ابن ماجہ)

ایک اور حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ کسی شخص نے راستے سے ایک کانٹے دار ٹہنی دور کر دی اللہ تعالیٰ نے اسی عمل پر اس کو بخش دیا

(صحیح بخاری و صحیح مسلم عن ابو ہریرہؓ)

○ پاکیزگی اور صفائی ستھرائی کے سلسلے میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اور احکام ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جب تم میں سے کوئی شخص سو کر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے جب تک تین بار ہاتھ نہ دھو ڈالے کیونکہ اس کو معلوم نہیں کہ رات کو اس کا ہاتھ کہاں رہا۔ (صحیحین عن ابوہریرہؓ)

(۲) سونے سے پہلے ہاتھ صاف کر لو۔ (ابن ماجہ)

(۳) سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لیا کرو۔ (صحیح بخاری)

(۴) جوتے اتار کر کھانا کھاؤ۔ (مشکوٰۃ)

(۵) کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھ دھو لو۔ (ترمذی و ابوداؤد)

(۶) پانی میں پھونک نہ مارو۔ (ترمذی)

(۷) کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرو۔ (صحیح بخاری)

(۸) نہانے کی جگہ پیشاب نہ کرو۔ (ابوداؤد)

(۹) کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

(۱۰) پیشاب کی چھینٹوں سے بچو۔ (مستدرک حاکم۔ طبرانی)

(۱۱) کسی برتن میں پیشاب نہ کرو۔ (ترغیب ترہیب)

(۱۲) مٹی کبھی نہ کھاؤ۔ (ابونعیم)

(۱۳) حرام اور خبیث (نجس) دواؤں سے (بیماری کا) علاج نہ کرو۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

(۱۴) برتنوں کو (جن میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو) ڈھک کر رکھا کرو۔ (بخاری و مسلم)

(۱۵) "ستر" کو داہنا ہاتھ نہ لگاؤ اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجا کرو۔ (بخاری و مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو بہت پسند تھی

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بدبو سے سخت نفرت تھی اور خوشبو آپؐ کو بہت پسند تھی۔

○ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مردانہ خوشبو پسند تھی اور آپؐ مشک اور عنبر استعمال فرمایا کرتے تھے۔ (نسائی)

○ ایک خاص قسم کی خوشبو جس کو سکہ کہتے ہیں، ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہتی تھی جس گلی کوچے سے آپؐ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا۔ (سیرۃ النبیؐ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کا ہدیہ کبھی واپس نہیں کرتے تھے (یعنی ہمیشہ قبول فرما لیتے تھے۔ (صحیح بخاری)

○ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو خوشبودار پھول (ہدیہ کے طور پر) دیا جائے وہ اس کو واپس نہ کرے اس لیے کہ وہ بہت ہلکا احسان ہے اور خوشبو اچھی شے ہے۔ (صحیح مسلم)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ مردوں کو ایسی خوشبو استعمال کرنی چاہیے جس کی خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے جو پھیلے نہیں مگر اس کا رنگ نظر آئے۔ (شمائل ترمذی)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں کبھی کبھی خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں کبھی اگر اور کبھی کافور ہوتا۔ (سیرۃ النبیؐ بحوالہ نسائی)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانوروں پر رحم

محسنِ انسانیت، صاحبِ خُلقِ عظیم سیدُ الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس مجسّم خیر و برکت اور رحمت و شفقت تھی۔ اس پر نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ کسی ثبوت کی کیونکہ خود خالقِ کون و مکان نے آپؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ چنانچہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیں، اس میں خیر ہی خیر اور رحمت ہی رحمت نظر آئے گی۔ حضورؐ کی رحمت اور شفقت کسی ایک طبقے یا جنس کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ آپؐ کا ابرِ رحمت جس طرح دوست، دشمن، بوڑھے، بچے، عورت، مرد، مسلم اور غیر مسلم پر جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا اسی طرح آپؐ کے رحم وکرم کے دریائے زخّار سے بے زبان جانور، حیوان، پرندے اور کیڑے مکوڑے بھی سیراب ہوتے تھے۔ دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب جانوروں کو شدید مظالم کا تختۂ مشق بنایا کرتے تھے۔ کسی جانور کو باندھ کر اس پر نشانہ بازی کی مشق کرنا، زندہ اونٹ کی کوہان اور زندہ دُنبے کی چکتی کاٹ کر کھا جانا اور جانوروں کو آپس میں لڑانا ان کے عام مشغلے تھے۔ کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کی سواری کا جانور اس کی قبر پر باندھ دیا جاتا۔ اس کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیتے اور وہ یونہی بھوکا پیاسا مر جاتا۔ اسی طرح جانوروں کو اور کئی طریقوں سے بھی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ سب باتیں پرلے درجے کی شقاوت اور قساوت کے مترادف تھیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے

جانوروں کے لیے آیۂ رحمت بن کر مبعوث ہوئے۔ آپؐ نے ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا اور ان پر کسی قسم کا ظلم کرنے یا کسی قسم کی سختی کرنے سے منع فرما دیا۔ اس سلسلے میں آپؐ نے جو احکام صادر فرمائے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

زندہ جانوروں کے اعضاء ہرگز نہ کاٹو، جانوروں کو باندھ کر ان پر نشانہ نہ لگاؤ، جانوروں کو آپس میں لڑانے سے باز رہو، جانوروں کو بھوکا پیاسا کبھی نہ رکھو، جانوروں کے منہ پر نہ مارو اور نہ اس پر داغ دو، بلا ضرورت کسی جانور کو مت ذبح کرو، جانور کو ذبح کرتے وقت اچھا طریقہ اختیار کرو، ہر شخص کو چھری تیز کر لینا اور ذبیحے کو آرام پہنچانا چاہیے، ہر جانور سے وہی کام لو جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے یعنی بیل کو زراعت کی بجائے سواری کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں جانوروں پر رحم و شفقت کے بے شمار واقعات ملتے ہیں ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بے زبان جانوروں پر آپؐ اس قدر مہربان اور شفیق تھے کہ ان پر کسی قسم کا ظلم یا سختی ہوتے دیکھنا آپؐ کو کسی صورت میں گوارا نہ تھا۔ ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ کو یہ کہانی سنائی کہ ایک مسافر کو راستے میں سخت پیاس لگی۔ اتفاق سے اس کو کچھ فاصلے پر ایک کنواں نظر آیا۔ اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا۔ باہر نکلا تو اسے ایک کتا نظر آیا، جو پیاس سے سخت بے قرار بلکہ مرنے کے قریب تھا اور گیلی مٹی چاٹ رہا تھا۔ وہ شخص پھر کنوئیں میں اترا۔ اپنے موزے میں پانی بھر لایا اور کتے کو بھی پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ نیکی اتنی پسند آئی کہ اس نے کہ اس شخص کو بخش دیا۔

یہ کہانی سن کر صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! کیا جانوروں سے اچھا سلوک کرنے پر بھی ثواب ملتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا، ہاں، ہر جاندار سے اچھا سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ اور سنو کہ جو مسلمان کوئی درخت لگائے یا کھیتی باڑی کرے اور اس سے انسان اور حیوان فائدہ اٹھائیں تو وہ اس کے لیے صدقہ یا ثواب کا کام بن جاتا ہے۔ (صحیح بخاری)

○ ایک مرتبہ رسولِ پاک صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک گدھے کو دیکھا جس کے منہ کو کسی نے داغ دیا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، آپؐ نے فرمایا، اللہ کی اُس پر پھٹکار جس نے اس کے ساتھ یہ سُلوک کیا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ)

○ ایک مرتبہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صحابہؓ کو بتایا کہ ایک عورت نے بلّی باندھ رکھی تھی اس کو نہ تو کچھ کھلاتی تھی اور نہ آزاد کرتی تھی کہ اِدھر اُدھر منہ مار کر اپنا پیٹ بھر لے یہاں تک کہ وہ بلّی مر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو اس ظلم کے بدلے میں دوزخ میں بھیج دیا۔ (مُسندِ احمد)

○ ایک دفعہ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے اونٹ کو تیز چلا رہا تھا۔ اونٹ بیمار تھا اور اس پر بھاری بوجھ لدا ہوا تھا لیکن اس کا مالک اس کو بار بار چابک مارتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا، اپنے جانور پر رحم کیا کرو۔ یہ اونٹ بیمار اور کمزور ہے اس پر ظلم مت کرو۔ (سیرۃ النبیؐ)

○ ایک دفعہ ایک صاحب اس حالت میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان کے ہاتھ میں کسی پرندے کے بچے تھے جو چوں چوں کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا، یہ بچے کیسے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! میں ایک جھاڑی کے قریب سے گزرا تو ان بچوں کی آواز سنی۔ میں ان کو جھاڑی سے نکال لایا۔ ان کی ماں نے دیکھا تو بے قرار ہو کر میرے سر پر چکر لگانے لگی"۔ آپؐ نے فرمایا، "فوراً جاؤ اور

ان بچوں کو وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو۔" (مشکوٰۃ)

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے۔ راستے میں ایک جگہ قیام فرمایا تو ایک صاحب نے ایک چڑیا کے گھونسلے سے اس کا انڈا اٹھا لیا۔ چڑیا بے قرار ہو کر ان کے سر پر منڈلانے لگی۔ آپؐ نے پوچھا، کس نے اس چڑیا کا انڈا اٹھا کر اس کو تکلیف پہنچائی۔

وہ صاحب بولے، یا رسول اللہ! میں نے انڈا اٹھایا ہے۔

آپؐ نے فرمایا، "یہ انڈا وہیں رکھ دو!"

انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ اب چڑیا خوش ہو گئی اور آرام سے گھونسلے میں بیٹھ گئی۔ (ادب المفرد)

○ ایک دن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک اونٹ بھوک سے بلبلا رہا تھا اور اس کا پیٹ زمین سے لگا ہوا تھا۔ آپؐ نے بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک کو بلا کر فرمایا:

"اس جانور کے بارے میں تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟" (ابوداؤد)

○ ایک مرتبہ آپؐ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک اونٹ پر آپؐ کی نظر پڑی جو بھوک کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ کو بہت دکھ ہوا اور آپؐ نے فرمایا، "لوگو! ان بے زبانوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔" (ابوداؤد)

○ ایک مرتبہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر فرما رہے تھے۔ بہت سے صحابہؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ راستے میں ایک جگہ آپؐ نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں کسی ضروری کام کی خاطر آپؐ تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ سے باہر تشریف لے گئے۔ آپؐ کی غیر حاضری میں ایک صاحب نے کھانا تیار کرنے کے لیے ایسی جگہ چولھا بنا کر آگ جلائی جہاں زمین پر یا درخت پر

چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ آپؐ واپس تشریف لائے تو آپؐ کی نظر چولہے اور چیونٹیوں پر پڑی، آپؐ نے پوچھا، "یہ چولھا کس نے بنا کر آگ جلائی ہے؟"

اُن صاحب نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ! یہ کام میں نے کیا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا، بجھاؤ بجھاؤ —— مقصد یہ تھا کہ چیونٹیوں کو ایذا نہ پہنچے یا وہ جل نہ جائیں۔ (مُسندِ احمد)

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ! میں نے اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے حوض بنوائے ہیں۔ کبھی کبھی دوسروں کے بھولے بھٹکے اونٹ بھی وہاں آجاتے ہیں کیا انہیں پانی پلانے سے مجھے ثواب ملے گا؟"

فرمایا، "ہر پیاسے اور جاندار سے اچھا سلوک کرنے کا ثواب ملتا ہے۔" (ابنِ ماجہ)

خیر البشر ﷺ کی شانِ جود و سخا

رضائے الٰہی کی خاطر اپنے مال کو دوسروں کی بھلائی کے لیے بے دریغ صرف کرنا سخاوت یا جود و سخا ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ حاجت مندوں کے لیے دل کو تنگ کیے بغیر مال و دولت صرف کرتے ہیں اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں وہی کامیاب ہیں۔ ایک حدیثِ پاک میں ہے کہ جنّت سخیوں کا گھر ہے۔ فی التحقیقت سخاوت ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی انسانی صفت ہے اور یہ صفت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی فطرت میں ودیعت کی گئی تھی۔ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سحابِ جود و کرم مخلوقِ خدا پر ہر آن جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی سائل آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے در پر آیا ہو اور وہ خالی ہاتھ واپس گیا ہو۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کچھ مانگا گیا ہو اور آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اس کے جواب میں "لا" (نہیں) فرمایا ہو (صحیح بخاری)

اس حدیث کا مفہوم کسی نے کیا خوب ادا کیا ہے کہ:

نرفت لا بہ زبان مبارکش ہرگز
مگر با شہد ان لا الٰہ الا اللہ

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے اور رمضان المبارک کے مہینے میں تو

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سخاوت انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔" (صحیح بخاری)
اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کبھی کچھ نہ ہوتا تھا تو دوسروں سے قرض لے کر بھی سائل کی ضرورت پوری فرماتے تھے۔
حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لیے کوئی چیز نہ اٹھا رکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے فرمایا:

"اے ابوذرؓ مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس کوہ اُحد کے برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے میرے پاس ایک اشرفی بھی بچ رہے سوائے اس کے جو ادائے قرض کے لیے ہو۔" (صحیح بخاری)

صحیح بخاری میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَخَازِنٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي

(میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے)
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جود و سخا صرف زندوں تک محدود نہیں تھی بلکہ مرنے والے بھی اس سے محروم نہیں ہوتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو مسلمان قرض چھوڑ کر مرے گا میں اسے ادا کروں گا اور جو مسلمان ورثہ چھوڑے گا اس کو اس کے وارث سنبھالیں گے۔
خواجۂ دوسرا صلی اللہ علیہ وسلم کے جود و کرم اور بخشش و عطا کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

○ ایک دفعہ ایک بدو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ دو پہاڑوں کے درمیان دُور تک آپؐ کی بکریوں کے ریوڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی

"اے محمد (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) یہ بکریوں کے ریوڑ مجھ کو دے دو۔"

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے بلا تامل وہ سب کے سب اس کو دے دیئے۔ اس عدیم النظیر سخاوت کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے قبیلے سے جا کر کہا:

"بھائیو! اسلام قبول کر لو، محمد (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) اتنے فیاض ہیں کہ اپنے مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے۔" (صحیح مسلم)

○ ایک بار حضور (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد خلافِ معمول گھر تشریف لے گئے اور پھر فوراً واپس تشریف لے آئے۔ صحابہؓ کو تعجب ہوا۔ آپ (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) نے فرمایا، گھر میں کچھ سونا پڑا رہ گیا تھا، مجھے خیال آیا کہ رات کو بھی گھر میں پڑا نہ رہے۔ اہلِ خانہ سے کہہ آیا ہوں کہ اسے رات ہونے سے پہلے راہِ خدا میں دے دیں۔ (صحیح بخاری)

○ ایک بار ایک سائل کو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے آدھا دستق غلّہ قرض لے کر دیا۔ جب قرض خواہ اپنا قرض واپس لینے آیا تو آپ (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) نے اسے پورا ایک وسق غلّہ دیا اور فرمایا، آدھا قرض کا ہے اور آدھا میری طرف سے ہدیہ۔

○ ایک مرتبہ چند انصارؓ نے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم سے کچھ مانگا۔ آپؐ نے بلا تامل دے دیا۔ انھوں نے پھر مانگا، آپؐ نے اور عنایت فرمایا۔ وہ بار بار سوال کرتے رہے اور آپؐ ہر بار عطا فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کے پاس جو کچھ تھا وہ سب انہیں دے دیا۔ اب انہوں نے سوال کیا تو فرمایا:

"تم لوگ اطمینان رکھو میرے پاس جو کچھ ہوگا اسے تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا۔" (صحیح بخاری)

○ ایک مرتبہ ایک سائل حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی خدمت میں آیا، فرمایا، بیٹھو خدا دے گا۔ پھر ایک اور سوالی آیا، پھر تیسرا آیا۔ آپ (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) نے سب کو بٹھا لیا۔ اس وقت انہیں دینے کے لیے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کے

پاس کچھ نہ تھا۔ اتنے میں ایک صاحب حاضر ہوئے، انہوں نے چار اوقیہ چاندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، آپ نے ایک ایک اوقیہ چاندی تو ان تینوں سائلوں میں تقسیم فرما دی اور ایک اوقیہ کی بابت آواز دی کہ کوئی حاجت مند ہو تو آ گے آئے لیکن کوئی لینے والا نہ اٹھا۔ رات ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چاندی اپنے سرہانے رکھ لی۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دیکھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نیند نہیں آتی۔ اٹھتے ہیں اور نماز پڑھنے لگتے ہیں۔

انہوں نے پوچھا، "یا رسول اللہ نصیبِ دشمناں آپ کی طبیعت ناساز تو نہیں"

فرمایا، "نہیں"

انہوں نے پھر پوچھا، "کوئی خاص حکمِ الٰہی نازل ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ بے قرار ہیں؟" فرمایا، "نہیں"

اُمّ المومنین رض نے عرض کیا، "پھر آپ آرام کیوں نہیں فرماتے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرہانے کے نیچے سے چاندی نکالی اور حضرت عائشہ رض کو دکھا کر فرمایا،

"یہ ہے جس نے مجھے بے قرار کر رکھا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہ میرے پاس ہی ہو اور مجھے پیغامِ اجل آ جائے۔" (شمائلِ کبریٰ)

○ ایک بار بارگاہِ رسالت میں نوّے ہزار درہم آئے۔ سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک چٹائی پر رکھ دیا۔ جو سائل آتا ان میں سے اسے عطا فرماتے یہاں تک کہ سب درہم ختم ہو گئے۔ پھر ایک سائل آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب میرے پاس کچھ نہیں رہا لیکن تم میرے نام پر قرض لے لو میں اسے ادا کر دوں گا۔ حضرت عمرِ فاروق رض بھی وہاں موجود تھے انہوں نے ازراہِ اخلاص عرض کیا:

"یا رسول اللہ! اللہ استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"

ان کی بات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ پھر ایک انصاری صاحب رسول

نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ آپؐ بے دریغ خرچ کریں اللہ آپؐ کو محتاج نہیں کرے گا۔"

یہ سن کر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بشاش ہو گئے اور فرمایا:

"ہاں مجھے ایسا ہی حکم دیا گیا ہے۔" (مسلم وترمذی)

○ غزوۂ حنین میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا وہ سب تقسیم فرما کر آپ (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) واپس آ رہے تھے۔ راہ میں بدوؤں کو خبر ملی کہ ادھر سے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم گزرنے والے ہیں۔ وہ آس پاس سے بھاگے آئے اور آپؐ سے لپٹ پڑے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو۔ صحابۂ کرامؓ نے ان کو بزور ہٹانا چاہا لیکن آپ (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے سختی سے منع فرما دیا اور خود ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ بدوؤں نے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ردائے مبارک پکڑ لی یہاں تک کہ کشاکش میں ردائے مبارک آپؐ کے جسمِ اطہر سے اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بڑی ملائمت کے ساتھ انہیں سمجھایا کہ خدا کی قسم اگر جنگل کے ان درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تم کو دے دیتا تم مجھ کو نہ بخیل پاتے نہ دروغ گو نہ نامرد۔ (صحیح بخاری)

○ ایک دن ایک خاتون نے کچھ کھجوروں اور چند ککڑیوں کا ہدیہ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں پیش کیں۔ یہ دونوں چیزیں ایک طشتری میں رکھی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے یہ ہدیہ قبول فرما لیا۔ اتنے میں کسی جگہ سے خراج آیا۔ آپؐ نے دونوں ہاتھوں میں زرِ نقد بھر کر ان خاتون کو عطا فرمایا۔

(مدارج النبوۃ)

○ ایک دفعہ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کسی مہم پر تشریف لے جا رہے تھے۔ آپؐ کے ہم رکاب لشکر میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی شامل تھے۔ ان کی سواری کا اونٹ بہت کمزور تھا اس لیے وہ لشکر سے

پیچھے رہ رہ جاتے تھے۔ جب کسی جگہ لشکر پڑاؤ ڈالتا تو وہ بعد میں آکر اس سے ملتے تھے۔ ایک بار جب وہ اسی طرح پیچھے رہ گئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے آکر ملے اور فرمایا:

"جابر کیا حال ہے؟"

انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میرا اونٹ خستہ و درماندہ ہو گیا ہے اس لیے پیچھے رہ جاتا ہوں۔

یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری سے اترے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اتر پڑے۔ حضورؐ کے دستِ مبارک میں ایک چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس چھڑی سے اونٹ کو ایک کونچا دیا۔ پھر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اب اپنے اونٹ پر سوار ہو جاؤ۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سوار ہوئے تو اب اونٹ کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ سے بھی آگے نکل جاتا تھا۔ حضرت جابرؓ اس کو بار بار روکتے تھے لیکن اس کی رفتار کم نہ ہوتی تھی۔

حضورؐ نے فرمایا، جابر تم یہ اونٹ بیچتے ہو؟

انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ آپ ہی کا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: "نہیں بیچ ڈالو۔"

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دو مرتبہ یہی جواب دیا کہ حضورؐ اسے ہدیۃً قبول فرمائیں لیکن جب آپ نے تیسری مرتبہ بھی اصرار فرمایا کہ اسے بیچ ڈالو تو انہوں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! اگر مرضئ مبارک یہی ہے تو فلاں شخص کا مجھ پر ایک اوقیہ سونا قرض ہے آپ اس ایک اوقیہ سونے کے عوض اسے لے لیں۔"

آپؐ نے فرمایا، "میں نے لے لیا۔"

مدینہ پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

"بلال! جابر کو ایک اوقیہ سونا دے دو اور کچھ زیادہ دو۔"

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ بلال نے مجھے ایک اوقیہ سونے کے علاوہ ایک قیراط مزید سونا دیا[1] جب میں قیمت لے کر چلا تو آپ نے مجھے بلایا اور فرمایا:

"اپنا اونٹ لے جاؤ (میری طرف سے ہدیہ ہے) اور (سونے کی صورت میں) قیمت بھی تمہیں دی۔" (بخاری و مسلم)

ایک اوقیہ کا وزن ۳۴ گرام (پونے تین تولہ)
اور ایک قیراط کا وزن ۱/۴ گرام ہوتا ہے۔

رحمتِ عالم ﷺ کی شانِ ایثار

اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی رُخ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دینِ اسلام میں ابدی ہدایات و احکام موجود نہ ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام دینِ اسلام ہی کے پیغامبر اور مبلغ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو بے شمار احسانات فرمائے ہیں ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی اصلاح و فلاح کے لیے رسالت و نبوّت کا مقدس سلسلہ جاری فرمایا اور جب بھی انسانوں کو آسمانی ہدایات کی ضرورت ہوئی اُن میں کوئی نبی یا رسول اپنی ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔

انبیاء و مُرسلین کا یہ سلسلہ ہزاروں سال جاری رہا یہاں تک کہ خاتم النبیین سیّدنا حضرت محمّد مصطفےٰ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم پر اس سلسلے کو ختم فرما دیا گیا اور آپؐ کے ذریعہ وہ آخری اور مکمل تعلیم و ہدایت بھیج دی گئی جو قیامت تک بنی نوعِ انسان کے لیے کافی ہے۔

آج سے ساڑھے چودہ سَو سال پہلے دنیا کئی بار بننے اور بگڑنے کے بعد ایک ایسے مقام پر کھڑی تھی جب دینِ حق اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور اس کی اخلاقی زندگی پر موت طاری ہو چکی تھی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور ریگ زارِ عرب میں پیغمبرِ آخرالزماںؐ کا ظہور ہوا۔ اس ظہور کا مقصد کیا تھا؟ بنی نوعِ انسان کو ان کا بھولا ہوا سبق

یاد دلانا، خدائے واحد کا نام بلند کرنا اور انسان کے فضائل اخلاق کی تکمیل کرنا۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور آپ کے فدائیوں کا حسنِ کردار اور حسنِ عمل ہی تھا کہ مسلمان ایک قلیل مدت میں سیاسی اور تمدنی لحاظ سے قریب قریب ساری دنیا پر چھا گئے۔ ان کے اقتدار کا علَم صدیوں تک لاکھوں مربع میل پر لہراتا رہا اور وہ دنیا بھر کو اخلاق و تمدن کا درس دیتے رہے۔ الحمدللہ کہ آج بھی مسلمان بیسیوں آزاد ملکوں کے مالک ہیں اور ان کی تعداد قرنِ اول کے مسلمانوں کی تعداد سے ہزاروں گنا زیادہ ہے لیکن آج کے مسلمان ــ اور قرنِ اول کے مسلمان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج کے مسلمان نے اسلام کے تصورِ اخلاق کو نظر انداز کر کے تہذیبِ مغرب کی نقالی کو اپنا شعار بنا لیا ہے جب کہ قرنِ اول کا مسلمان قرآنی اخلاق کی تصویر اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا دل و جان سے پیرو تھا۔ قرنِ اول کے مسلمانوں کی ہیبت سے دشمنانِ حق لرزتے تھے لیکن ان کے حسنِ کردار کے اثر سے پتھر بھی موم ہو جاتے تھے۔ اگر ہم آج بھی اسلامی اخلاق کو مضبوطی سے اپنا لیں اور اسی کے مطابق اپنی اور آئندہ نسلوں کی سیرتوں کی تعمیر کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم دینی و دنیاوی کامرانیوں سے ہمکنار نہ ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کا تصورِ اخلاق کیا ہے، بعض لوگوں کے نزدیک اسلامی اخلاق یہ ہے کہ صوم و صلوٰۃ اور دوسری عبادات کی پابندی کی جائے اور دنیوی امور میں کم سے کم دلچسپی لی جائے۔ کچھ دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول رہنا اسلامی اخلاق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اخلاق زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے اور ایک مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو کا داخلی نگران اور خارجی معیار ہے۔ خلوت ہو یا جلوت، گھر ہو یا میدان، تجارت ہو یا سیاست، امن ہو یا جنگ، تنگ دستی ہو یا آسودہ حالی، سفر ہو یا قیام ہر حالت میں ایک مسلمان

کے لیے اسلامی ضابطۂ اخلاق کی پابندی اس کی دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضامن ہے۔ اسلامی اخلاق کا دوسرا نام قرآنی اخلاق ہے اور قرآنی اخلاق وہ ہے جس کا نمونہ سرورِ کائنات خیر البشر رحمت عالم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی ہے جس کی شان میں فرمایا گیا "بلا شبہ آپ اخلاق کے نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں۔" اور پھر مسلمانوں کو بتایا گیا:۔ "بلا شبہ تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین طریق زندگی (نمونہ) ہے۔"

خیرِ مجسم رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی سعادت کو ان پر موقوف بتلایا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اخلاقِ حسنہ اختیار کرے۔ قرآنِ کریم اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھیں تو اخلاقِ حسنہ کا دائرہ بڑا وسیع نظر آئے گا۔ اس کے چند عنوانات یہ ہیں:

رحم وکرم، سخاوت، احسان، ایثار، نرمی، خوش کلامی، راست بازی، ایفائے عہد، صبر وتحمل، تواضع، دیانت داری، شرم وحیا، صلۂ رحمی، سادگی، والدین کی خدمت، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، ایک دوسرے کو سلام کرنا، مہمان نوازی، عیادت، تعزیت، لین دین میں خوش معاملگی وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت ہمیں اخلاقِ حسنہ کے جس عنوان پر گفتگو کرنا ہے وہ ہے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ ایثار۔

ایثار دراصل سخاوت اور احسان کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ سخاوت یہ ہے کہ اپنے مال کو دوسروں کے لیے اس طرح بے دریغ خرچ کیا جائے کہ صرف اُن کی بھلائی پیشِ نظر ہو اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ اپنی طرف سے بھلائی کی جائے۔ خواہ اس طرح کہ اُس کو

کوئی چیز بطور تحفہ دی جائے یا اس کا کوئی کام کر دیا جائے۔ اس کو آرام پہنچایا جائے یا اس کا کوئی ایسا کام کیا جائے جو اس کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث ہو اور یہ سب کچھ اللہ کی رضا کی خاطر کیا جائے۔ سخاوت اور احسان دونوں اعلیٰ درجے کی اخلاقی صفتیں ہیں۔ ان کا مفہوم بڑا وسیع ہے جس میں ماں باپ کی خدمت کرنا، اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرنا، مسافروں کی مدد کرنا۔ رشتہ داروں، ہمسایوں، غریبوں، بیواؤں کی حاجتیں پوری کرنا۔ مہمانوں کی خوش دلی سے خدمت کرنا، رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ لینا، نادار قرضداروں کا قرض ادا کر دینا یا اسے معاف کر دینا۔ دین اور وطن کے دشمنوں کے مقابلے میں مجاہدین کی اعانت کرنا اور سامانِ حرب و ضرب کی فراہمی میں حصہ لینا، سب کچھ شامل ہے۔ فی الحقیقت سخاوت، احسان، انفاق، صدقہ اور بذل و عطا سب مترادف الفاظ ہیں۔ ہر کارِ خیر اور فیضِ رسانی ان کے مفہوم میں داخل ہے۔ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کے لیے بے حد و حساب اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کو بار بار سخاوت اور احسان کی تعلیم و ترغیب دیا کرتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنی ساری مخلوق سے زیادہ محبت ان بندوں سے ہے جو اس کی عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان کریں۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جس کسی نے میرے کسی اُمتی کی کوئی حاجت پوری کر دی اس کا دل خوش کرنے کے لیے تو اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے میرے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اللہ اس کو جنّت میں داخل فرمائے گا۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، "تم میں سے کوئی احسان کی کسی صورت اور کسی قسم کو بھی حقیر نہ سمجھے۔ پس اگر اپنے بھائی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہ پائے تو اتنا ہی کرے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے ملاقات کرے، اور جب تم گوشت خریدو یا ہانڈی پکاؤ تو اس میں شوربہ بڑھا دیا کرو۔ پھر چمچہ بھر اس میں سے اپنے پڑوسی کے لیے بھی نکال کر دو۔"

سخاوت اور احسان کی صورتوں میں انسان اپنی ضرورتوں کے لیے کچھ نہ کچھ بچا لیتا ہے لیکن ایثار و قربانی یہ ہے کہ مال یا وقت صرف اپنی ضرورت کے لیے ہو لیکن دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے اور اس میں خواہ اپنا نقصان ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اسے خوش دلی سے گوارا کر لیا جائے۔ مثلاً آپ کے پاس کچھ مال ہے جو صرف آپ کی اپنی ضرورت کے لیے کافی ہے یا ذرا سا وقت ہے جس میں آپ کو اپنا ایک ضروری کام پورا کرنا ہے مگر ایک دوسرا حاجت مند آپ کے سامنے آتا ہے جسے آپ کے مال یا وقت کی بے حد ضرورت ہے۔ اگر اس کو یہ میسر نہیں آتا تو اس کا سب کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے۔ آپ نے اسے دیکھا تو بے قرار ہو گئے۔ اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال دیا اور اس حاجت مند کی بھلائی میں اپنا سارا مال یا وقت صرف کر دیا۔ یہ تھا آپ کا اشرف المخلوقات ہونا۔ ایثار شرافت کے کمال اور خیر خواہی کا وہ اعلیٰ جذبہ ہے جو خود کو بھوکا رکھ کر دوسرے کا پیٹ بھرنے اور اپنی ضرورت کاٹ کر دوسرے کی ضرورت پوری کرنے پر انسانی نفس کو آمادہ کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی مصیبتوں کو دور کرنے کے لیے اسی طرح تگ و دو کرتا ہے جس طرح اپنی ذات پر آئی ہوئی مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ایثار کی یہ تعریف فرمائی ہے:

"وہ دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج یا تنگی ہو" (سورۃ الحشر آیۃ ۹)

سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاقِ حسنہ میں ایثار کا وصف سب سے نمایاں تھا اور اس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا۔ آپؐ کھانا کھانے کا قصد فرماتے یا پینے کی کوئی چیز لائی جاتی اور اتنے میں کوئی سائل آجاتا تو آپؐ فوراً وہ چیزیں اس محتاج کو دے دیتے اور خود بھوکے پیاسے رہتے۔

ایک دن قبیلہ بنی غفار کا ایک شخص آپؐ کے یہاں مہمان ہوا۔ اس دن رات کے کھانے کے لیے آپؐ کے گھر میں صرف بکری کا دودھ تھا۔ آپؐ نے دودھ مہمان کو پلا دیا اور خود فاقے سے رہے حالانکہ اس سے پہلی شب بھی آپؐ فاقہ سے تھے۔

ایک مرتبہ ایک غریب اور تنگ دست صحابی نے شادی کی۔ دعوتِ ولیمہ کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو اپنے گھر سے آٹے کی ٹوکری منگا کر ان کی نذر کر دی حالانکہ اس دن آٹے کی اس مقدار کے سوا حضورؐ کے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔

ایک مرتبہ آپؐ کی چادر پھٹ گئی۔ ایک خاتون نے آپؐ کی خدمت میں ہدیتہً نئی چادر پیش کی۔ آپؐ کو چادر کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے آپؐ نے قبول فرما کر اوڑھ لی، اسی وقت ایک صحابی نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! یہ چادر تو بہت اچھی ہے یہ تو مجھے عنایت فرما دیجئے۔"

آپؐ نے فرمایا، "بہت اچھا" اور بلا تامّل وہ چادر اتار کر ان کو دے دی۔

ایک نومسلم یہودی عالم مخیرق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوۂ اُحد میں شہادت پائی۔ شہادت سے پہلے وہ وصیت کر گئے کہ میرے بعد میرے سات مملوکہ باغوں کے مالک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہوں گے۔ اس وقت حضورؐ کو اپنے ذاتی مصارف کے لیے ان باغوں کی اشد ضرورت تھی لیکن آپؐ نے ان کی تمام آمدنی راہِ خدا میں وقف کر دی۔ جو کچھ حاصل ہوتا تھا آپؐ غربا و

مساکین میں تقسیم فرما دیتے تھے اور اپنے پاس ایک درہم بھی نہ رکھتے تھے۔
ایک مرتبہ ایک قبیلہ کے لوگوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر بھوک اور افلاس کی شکایت کی اور آپؐ سے مدد چاہی۔ اس وقت آمدنی کی تمام مدّیں خالی تھیں اور حضورؐ کے پاس بھی کوئی چیز نہ تھی لیکن آپؐ نے ایک یہودی سے قرض لے کر ان لوگوں کی ضرورت پوری کی اور وہ خوش خوش واپس گئے۔
حضورؐ کو اپنی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بے حد محبّت تھی۔ وہ آتیں تو آپؐ کھڑے ہو کر ان کی پیشانی چومتے اور اپنی جگہ پر بٹھلاتے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ تنگ دستی کی وجہ سے چکی پیستی تھیں۔ یہاں تک کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ گھر کے دوسرے کام کاج بھی انجام دیتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی غزدہ سے مالِ غنیمت میں حضورؐ کے پاس کچھ لونڈیاں آئیں۔ حضرت فاطمہؓ نے حضورؐ سے ایک لونڈی کے لیے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا:

"اے میری بیٹی تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن ابھی تک اصحابِ صُفّہ کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ وہ بے چارے بڑی مصیبت میں ہیں جب تک ان کا انتظام نہ ہو جائے میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔"

ایک مرتبہ حضرت عقبہؓ بن عامر حضورؐ کے شریکِ ہم سفر تھے۔ دونوں کے پاس ایک ہی اونٹ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد حضورؐ نے حضرت عقبہؓ سے فرمایا، عقبہ اب تم اونٹ پر سوار ہو جاؤ میں پیدل چلتا ہوں۔ انہوں نے بہتیرا عذر کیا لیکن حضورؐ نے انہیں سواری پر بٹھا کر چھوڑا اور خود پاپیادہ چلنے لگے۔ غرض اس قسم کے بیسیوں واقعات حضورؐ کی سیرتِ طیّبہ میں ملتے ہیں۔
جس طرح حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایثار کو اپنا شعار بنا رکھا تھا اسی طرح آپؐ صحابہؓ کو بھی ایثار کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور اسے پسند

نہیں فرماتے تھے کہ کوئی مسلمان اپنے کھانے میں اپنے نادار اور مفلوک الحال مسلمان کو شریک نہ کرے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کا کھانا دو کو، دو کا چار کو اور چار کا کھانا آٹھ کو کفایت کرتا ہے۔

فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہو کر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی مجسمہ سخاوت و ایثار بن گئے تھے۔ مکی صحابہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار مدینہ نے اپنے دیدہ و دل ان کے سامنے فرشِ راہ کر دیئے اور اپنے ایثار و اخلاص کے ایسے نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے کہ دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مہاجرین اپنا گھر بار، مال جائیداد سب کچھ مکہ میں چھوڑ آئے تھے اور بالکل بے سرو سامان تھے۔ انصار نے اپنا تمام مال و متاع اور جائیداد غرض اپنی ایک ایک چیز شمار کر کے آدھی آدھی ان کو دے دی۔ اس ملکوتی جذبہ کی انتہا یہ تھی کہ جب انصار نے اپنے نصف نخلستان اور زمینیں مہاجر بھائیوں کو پیش کیں تو انہوں نے فنِ باغبانی اور زراعت سے نا آشنا ہونے کے باعث ان کے لینے میں عذر کیا، لیکن انصار نے کہا کہ یہ نخلستان اور زمینیں ہم آپ کو ضرور دیں گے۔ ان میں کھیتی باڑی ہم خود کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ آپ کو دے دیا کریں گے۔ مہاجرین نے احسان مندی کے ساتھ اپنے انصار بھائیوں کی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ جنگِ خیبر تک مہاجرین نخلستانوں کی آمدنی لیتے رہے۔ فتح خیبر کے بعد یہ نخلستان انہوں نے شکریہ کے ساتھ انصار کو واپس کر دیئے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی تو جہاں دوسرے صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ نے زیادہ سے زیادہ مالی قربانی دی وہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے گھر کی سوئی تک راہِ حق میں پیش کر دی۔ جب حضورؐ نے پوچھا کہ ابوبکر گھر میں بھی کچھ چھوڑ آئے ہو تو عرض کیا، "یا رسول اللہ! اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے نام کے سوا کچھ

نہیں چھوڑا اور یہی میرے لیے کافی ہے۔"

ایک دن ایک پریشان حال شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے بھوک ستا رہی ہے۔ حضورؐ نے ازواج مطہرات سے پوچھ بھیجا کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے۔ سب طرف سے جواب آیا کہ آج فاقہ ہے۔ اب حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف دیکھا اور پوچھا کوئی ہے جو اس اللہ کے بندے کو اپنا مہمان بنائے۔ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے عرض کی:

"یا رسولؐ اللہ! اس کو میں مہمان بناؤں گا۔"

یہ کہہ کر فوراً گھر گئے اور بیوی کو مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔ انھوں نے کہا۔ بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا پکا ہے۔ اس کے سوا خدا کی قسم گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تم بچوں کو بہلا کر بغیر کھانا کھلائے سلا دینا۔ ہم ان کا کھانا مہمان کے آگے رکھ دیں گے۔ تم چراغ درست کرنے کے بہانے سے اٹھ کر اسے بجھا دینا۔ اندھیرے میں ہم یونہی منہ چلاتے رہیں گے اور مہمان کھانا کھائے گا۔

غرض اس طرح مہمان کو کھانا کھلا کر دونوں میاں بیوی اور بچوں نے رات فاقہ سے کاٹی۔ صبح کو جب یہ نرالے میزبان حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

"رات کو اپنے مہمان کے ساتھ تمہارے برتاؤ سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوا۔"

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک دن روزے سے تھیں اور گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اتنے میں ایک سائلہ نے آواز دی۔ انھوں نے لونڈی کو حکم دیا کہ یہ روٹی اس کو دے دو۔ لونڈی نے کہا، شام کو افطار کس چیز سے کیجیے گا۔ انھوں نے فرمایا۔ اللہ مالک ہے تم روٹی اس کو دے دو۔

ایک دفعہ حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ اے اللہ کے سچے رسولؐ کی بیٹی! ایک مسکین کے لیے کھانا دیجئے۔

سیّدہ فاطمہؓ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا، "اے سلمان خدا کی قسم آج ہم سب کو تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی، جاؤ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور کہو فاطمہ بنت محمدؐ کی یہ چادر رکھ لو اور اس مسکین کو تھوڑا سا غلّہ دے دو۔

جنگ یرموک میں تین مجاہدین سخت مجروح ہو کر حالتِ نزع میں تھے۔ ایک شخص ایک مجاہد کے پاس پانی لایا اور انہیں پلانا چاہا۔ انھوں نے دیکھا کہ دوسرے زخمی مجاہد بحسرت پانی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ بولے۔ پہلے انہیں پلاؤ۔ دوسرے کے پاس آیا تو انھوں نے دیکھا کہ تیسرے مجاہد کی نگاہ بھی پانی کی طرف ہے۔ بولے انہیں پلاؤ۔ ان کے پاس پانی آیا تو وہ کہنے لگے، پہلے دوسروں کو پلاؤ۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ گیا اور سب نے تشنگی کے عالم میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

یہی تھا وہ جذبۂ ایثار جو آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نام لیواؤں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگر آج یہ جذبہ ہمارے اندر بھی پیدا ہو جائے تو معاشرے میں بہارِ تازہ آجائے اور زمین اللہ کے نور سے جگمگا اٹھے۔

محنت کشوں کے والی

(صلی اللہ علیہ وسلم)

سُنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُہٗ (ابن ماجہ)

یعنی مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دیا کرو

کسی کو اُجرت اور مزدوری دے کر اپنا کام کرانے یا استعمال کے لیے کسی کو اپنی چیز دے کر اس کا کرایہ لینے کو شریعت اور فقہ کی زبان میں اجارہ کہتے ہیں اور یہ اُن معاملات میں سے ہے جن پر انسانی تمدن کی بنیاد قائم ہے۔ کتبِ حدیث میں اس موضوع پر بے شمار احادیث ملتی جن میں سے ایک حدیث ابھی بیان کی گئی ہے۔ اس حدیثِ پاک سے چار باتیں واضح ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ محنت مزدوری کرنا کوئی عیب یا عار کی بات نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ کوئی مزدور یا محنت کش قابلِ تحقیر نہیں بلکہ واجب التکریم ہے۔

تیسری یہ کہ مزدور کی مزدوری اس کا حلال اور جائز حق ہے۔

اور چوتھی یہ کہ مزدور کا محنتانہ یا اس کی مزدوری کا معاوضہ کسی تاخیر کے بغیر ادا کر دینا چاہیئے

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ نے خود بھی محنت مزدوری کی ہے۔ بچپن میں معمولی معاوضہ پر

دوسروں کی بکریاں چرائی ہیں اور جوانی میں اُجرت پر طویل پُر صعوبت سفر کرکے دوسروں کا مالِ تجارت فروخت کیا ہے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی بکریوں کے ریوڑ چرائے ہیں اور خوشدلی سے محنت مزدوری کی ہے۔

قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝ (سُورَۃُ البَلَد، آیۃ ۴)

یعنی ہم نے یقیناً انسان کو محنت مشقت میں پیدا کیا ہے۔

گویا انسان کی زندگی اور محنت لازم و ملزوم ہیں اور محنت مزدوری زندگی کا تقاضا اور فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے تاہم انسانوں کے مراتب اور معاشی حالات میں فرق ہوتا ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے آجر بنایا ہے اور کسی کو اجیر، کسی کو کام لینے والا بنایا ہے اور کسی کو کام کرنے والا۔ رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بنی نوعِ انسان کو جو تعلیم دی ہے اس میں ایک طرف محنت کی عظمت واضح کی ہے اور دوسری طرف محنت کش کا احترام اور قدر کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ حضورؐ کے نزدیک محنت کش کی کیا قدر و قیمت تھی؟ اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک صحابی کے ہاتھوں پر سیاہی دیکھی۔ آپؐ نے اُن سے پوچھا، تمہارے ہاتھوں پر یہ سیاہی کیسی ہے؟ انہوں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ میں پتھروں پر کدال چلاتا ہوں اور اس سے اپنے بال بچّوں کے لیے روزی کماتا ہوں۔ یہ سیاہی اسی گینتی کی ہے۔" یہ سن کر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اُن صحابی کے ہاتھ چوم لیے۔

محنت کی یہی عظمت تھی کہ بڑے بڑے عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ روزی کمانے کے لیے محنت مشقت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کپڑا کاندھے پر ڈال کر بیچا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اجرت پر پانی کھینچ کر باغ سینچتے تھے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کمانیں بنایا کرتے تھے۔

حضرت خباب بن الارتؓ لوہار کا کام کرتے تھے، حضرت سلمان فارسیؓ مدائن کے گورنر تھے لیکن چٹائیاں بنا کر اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ وعلیٰ ہذا القیاس......

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آجر اور مزدور کے تعلقات کو اُخوت اور مروّت کی بنیاد پر استوار کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین قسم کے انسان ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور اُن کو مغلوب و مقہور کر کے چھوڑوں گا۔ اُن میں سے ایک وہ شخص ہو گا جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہو مگر اس کے مطابق اس کو اُجرت نہ دیتا ہو۔

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے منع فرمایا کرتے تھے کہ مزدور اور اجیر کو اس سے اجرت طے کیے بغیر کام پر لگایا جائے۔

اس ممانعت میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ آجر اور مزدور کے درمیان کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بھی سخت ناپسند تھی کہ مزدور سے اس کی طاقت سے بڑھ کر کام لیا جائے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری میں آپؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ خادموں (یا مزدوروں) پر کسی کام کا ایسا بوجھ نہ ڈالو جو انہیں ہلکان کر دے اور اگر کبھی مجبوراً تمہیں ایسا کرنا پڑے تو پھر تم خود ان کے شریک ہو کر ان کی مدد کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں مزدور کی مزدوری کام ختم ہونے پر فوراً ادا کرنے کا حکم دیا ہے وہاں یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ اگر کوئی مزدور کسی ناگہانی سبب یا ناراضی وغیرہ کے سبب اپنی اجرت وصول کیے بغیر چلا جاتا ہے اور آجر اس کی اجرت کسی کاروبار میں لگا دیتا ہے

جس میں منافع ہوتا ہے تو آجر مزدور کے مطالبے پر اس کو اُجرت کے ساتھ منافع بھی دینے کا پابند ہوگا۔ (صحیح بخاری کتاب الاجارات)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، مالدار کا مال داری کے باوجود دوسرے کے حق کی ادائیگی میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔ (السنن بیہقی کتاب الامارۃ)

اس حدیث سے عام طور پر قرض کی واپسی مراد لی جاتی ہے مگر مزدور کی اُجرت کی ادائیگی رسولِ اکرمؐ کے اس ارشاد کی روشنی میں قرضِ حسنہ کی ادائیگی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

"مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔"

سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کمائی کو سب سے اچھی قرار دیتے تھے جو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہو۔ مُسندِ احمد میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا گیا کہ یا رسولؐ اللہ! کون سی کمائی سب سے پاک اور اچھی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا اور ہر تجارت جو پاکبازی کے ساتھ ہو۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت مقدام بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ کسی نے کبھی کوئی کھانا اس سے بہتر نہیں کھایا جو اس نے اپنے ہاتھوں کی محنت سے کما کے کھایا اور اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کام کرکے کھاتے تھے۔

گویا رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک تحصیلِ معاش کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے کام (یا محنت) کرکے روزی کمائے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے محنت مشقت کرکے روزی

لگانے والے کو اللہ کا حبیب قرار دیا ہے۔

کاشت کاری اور باغ بانی میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور کاشتکاروں اور باغبانوں کو کسی تردد کے بغیر محنت کش کہا جا سکتا ہے ان کی محنت کے نتیجے میں ان کو غلہ اور پھل تو یقیناً حاصل ہو گا، اس کے علاوہ ایک اور بہت بڑا نفع بھی ان کو ملے گا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا، جو کوئی صاحب ایمان بندہ درخت کا پودا لگائے یا کاشت کرے پھر اس میں سے پرندے کھائیں یا آدمی یا کوئی جانور کھائے تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہو گا۔

اس حدیثِ پاک میں باغ لگانے والوں اور کاشت کاروں کے لیے کتنی عظیم بشارت ہے کہ ان کے درخت کا پھل یا کھیت سے حاصل ہونے والا غلہ کوئی پرندہ، انسان یا جانور کھائے تو ان کو "فی سبیل اللہ صدقہ" کا ثواب ہو گا۔

حافظ نورالدین علی الہیثمیؒ نے "مجمع الزوائد" میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے اُعْطُوا الْاَجِیْرَ مِنْ عَمَلِہٖ یعنی مزدور کو بھی اس کی محنت (کے ثمرات) میں سے دو۔ اس حدیث میں آجر کو ہدایت کی گئی ہے کہ کاروباری منافع میں مزدور کو بھی شریک کرلو۔

رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو محنت کشوں سے کس قدر محبت تھی اور آپؐ کو ان کی تکلیف یا پریشانی کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے:

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے محلے کی مسجد میں بنو سلمہ کے لوگوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے عشاء کی نماز میں سورۂ بقرہ پڑھی۔ ایک صاحب نے جو دن بھر کی محنت

کی وجہ سے سخت تھکے ہوئے تھے، ان کی لمبی قرأت کی وجہ سے علیحدہ ہوکر ہلکی سی نماز پڑھ لی۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ شخص منافق ہے۔ اُن صاحب کو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سخت ناگوار گزری۔ وہ فوراً رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! ہم محنت کش ہیں، اپنے ہاتھوں سے مزدوری کرتے ہیں اور اونٹوں کے ذریعے پانی بھرتے ہیں۔ آج معاذ نے ہمیں نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ بقرہ شروع کر دی۔ اس لیے میں نے اپنی نماز علیحدہ پڑھ لی۔ اس پر معاذ خیال کرتے ہیں کہ میں منافق ہو گیا۔"

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مخاطب ہو کر تین بار فرمایا:

"یَا مُعَاذُ اَفَتَّانٌ اَنْتَ" اے معاذ! کیا فتنہ برپا کرو گے؟

اس کے بعد فرمایا:

"صرف وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى جیسی (چھوٹی) سورتیں پڑھ لیا کرو۔ (کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، کمزور، اربابِ حاجت اور محنت کش سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں)"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں آجر کو ہدایت فرمائی ہے کہ مزدور پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو انہیں ہلکان کر دے، وہاں مزدوروں کو بھی ہدایت فرمائی ہے کہ کام کرتے وقت اتنی ہی تکلیف برداشت کرو جتنی طاقت رکھتے ہو۔ (سنن ابنِ ماجہ) مطلب یہ کہ مزدور کو اپنی صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ جسم اور جان کا بھی اس پر حق ہے۔ اگر وہ اپنی

طاقت سے بڑھ کر کام کرتا رہا تو ہو سکتا ہے ایک دن اس کی صحت جواب دے جائے اور وہ ہلکا سا کام کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے محنت کش کو یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ وہ جس کام کو اپنائے پہلے اس میں پوری مہارت حاصل کرے نیز جو کام اس کے سپرد کیا جائے اس کو لگن اور دیانت داری کے ساتھ کرے۔

مختصر یہ کہ رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فی الواقع محنت کشوں کے والی (سرپرست، بہی خواہ، دوست، محافظ، نگہبان) تھے۔ آپؐ کی حکیمانہ تعلیمات کی روشنی میں آجر اور اجیر کے تمام مسائل کا حل بآسانی مل سکتا ہے اور دونوں فریقوں کے درمیان خوشگوار فضا قائم ہو سکتی ہے جس سے نہ صرف آئے دن کے جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائے گا بلکہ ایسی فضا ملک و قوم کے لیے بے حد سود مند ثابت ہوگی۔

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جہاں لوگوں کو محنت مشقت سے روزی کمانے کی تاکید فرماتے تھے وہاں ان کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بھی سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک شخص نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپؐ نے (اس کی بات سن کر) فرمایا کہ کیا تمہارے پاس گھر میں کچھ نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ کیوں نہیں یا رسولؐ اللہ! ایک بوریا ہے جس کے ایک حصہ کو ہم (سوتے وقت) اوڑھ لیتے ہیں اور ایک حصہ کو فرش پر بچھا لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ وہ صاحب دونوں چیزیں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس لے آئے۔ آپؐ نے دونوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور (صحابہؓ سے مخاطب ہو کر) فرمایا، اِن دونوں کو کون خریدے گا؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ دونوں چیزیں

میں ایک درہم میں لیتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے دو یا تین بار فرمایا کہ ایک درہم سے زیادہ کون ان کی قیمت دے گا؟ اس پر ایک دوسرے صاحب نے عرض کیا کہ میں انہیں دو درہم میں لیتا ہوں۔ آپؐ نے یہ دونوں چیزیں اس کو دے دیں اور دو درہم اس سے لے کر اس انصاری کو دے دیئے اور فرمایا کہ ان میں سے ایک درہم کی کھانے کی چیزیں خرید کر اپنے گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا اور حضورؐ کے پاس کلہاڑی (کا پھل) خرید کر حاضر ہوا۔ حضورؐ نے اس کے ساتھ اپنے دستِ مبارک سے لکڑی کا دستہ لگایا اور اس انصاری سے کہا کہ جنگل میں نکل جاؤ اس سے لکڑیاں کاٹا کرو اور شہر میں آکر بیچ دیا کرو اور پندرہ دن تک ہمیں بالکل نظر نہ آنا۔ حضورؐ کے حکم کی تعمیل میں وہ انصاری لکڑیاں کاٹتا اور شہر میں فروخت کرتا رہا۔ پندرہ دن کے بعد وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دس درہم کما چکا تھا اور ان میں سے کچھ کے کپڑے بنا لیے تھے اور کچھ سے خوراک کی چیزیں خرید لی تھیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان سے فرمایا، کیا اس طرح روزی کما کر اپنی ضروریات پورا کرنا تمہارے لیے اس سے کہیں بہتر نہیں کہ تم قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس حالت میں حاضر ہو کہ تمہارے چہرے پر گدائی کا داغ ہو۔

(ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب ماتجوز فیہ المسألۃ)

حضرت قَبِیصہ بن مُخارِق ہلالی رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنْہُ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک قرضہ کی ضمانت قبول کی (یعنی کسی کا ضامن ہونے کی بناء پر مجھ پر چَٹّی پڑ گئی) پھر میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قرضہ کی ادائیگی کے لیے (مدد کا) سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا، تھوڑے دن ٹھہرو، ہمارے پاس زکوٰۃ کا مال آنے والا ہے اس میں سے دلوا دیں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا، اے قَبِیصہ! سوال کرنا صرف تین آدمیوں کے لیے جائز ہے ایک تو اس کے لیے جو کسی قرضہ کا ضامن ہو اس کو صرف اسی قدر مانگنا جائز ہے

کہ وہ اس سے قرضہ آتارنے (یعنی چٹی پوری کرنے) کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد پھر نہ مانگے ۔ دوسرے اس شخص کو جو کسی آفت یا مصیبت میں مبتلا ہو جائے (حادثاتی طور پر اس کا کاروبار یا مال برباد ہو جائے) اس کو صرف اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے یا اس کی زندگی قائم رہ سکے۔ تیسرے اس شخص کو جس کو کوئی ایسی مصیبت پیش آجائے کہ فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جائے اور اس کی قوم کے تین آدمی اس بات کی شہادت دیں کہ وہ واقعی فاقہ کشی میں مبتلا ہے تو ایسے شخص کے لیے صرف اسی قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کی زندگی قائم رہ سکے (یعنی وہ گزر اوقات کر سکے)۔ ان لوگوں کے سوا، اے قبیصہ! کسی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ان صورتوں کے سوا سوال کرے گا تو یہ سوال حرام ہوگا اور وہ مالِ حرام کھائے گا۔

(مشکوٰۃ شریف بحوالہ صحیح مسلم)

زیر دستوں کے مولیٰ

(صلی اللہ علیہ وسلم)

اسلام دینِ فطرت ہے وہ زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے اور تمام معاملات میں نہ صرف عدل و دیانت اور توازن و اعتدال کی تلقین کرتا ہے بلکہ ہر طبقے کے لوگوں کے حقوق بھی واضح طور پر متعین کرتا ہے۔ آجر ہو یا مزدور، آقا ہو یا ملازم، دکاندار ہو یا گاہک، باپ ہو یا بیٹا، تاجر ہو یا صنعت کار اگر یہ سب ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں اور اسلام کے وضع کیے ہوئے اصولوں کے مطابق عمل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے معاشرے میں بہارِ تازہ نہ آجائے اور ہر طرف سکون و اطمینان کا دَور دَورہ نہ ہو جائے۔

دنیا میں ملازموں اور مزدوروں کا طبقہ ہمیشہ مظلوم اور پِسا ہوا سمجھا گیا ہے لیکن اسلام نے اس طبقے کے حقوق پر اس قدر زور دیا ہے کہ ان کے ادا نہ کرنے کو اللہ اور رسول کی نافرمانی کے مترادف قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ نافرمانی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر سکتی ہے۔ اس لیے ملازموں کے حقوق کا خیال رکھنا کسی بھی مسلمان کے لیے جس کو اللہ نے ملازم رکھنے کی توفیق دی ہو، دینی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اسلام نے ملازم اور مزدور کا درجہ اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اس کو آقا اور آجر کے برابر لا کھڑا کیا ہے اور اس کے احساسِ کمتری اور مظلومی کے تصور کا یکسر خاتمہ کر دیا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں جہاں والدین رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہاں خادموں یا زیر دستوں کے ساتھ بھی

حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے محسنِ انسانیت رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ملازموں اور زیردستوں کے ساتھ حسنِ سلوک پر اس قدر زور دیا ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں آپ کے چند ارشادات اور سیرۃِ طیبہ کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیے:

"صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "یہ بیچارے خادم تمہارے بھائی ہیں اللہ نے ان کو تمہارا زیردست کر دیا ہے تو اللہ جس کے زیردست اس کے کسی بھائی کو کر دے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس کو ایسا کام کرنے کے لیے نہ کہے جو اس کے لیے بہت بھاری ہو اور اگر اسے ایسے کام کا مکلف کرے تو پھر اس کام میں خود اس کی مدد کرے۔"

اس حدیث مبارک میں حضور نے امت کو جو سبق دیا ہے وہ یہ ہے کہ آقا یا مخدوم کے کھانے اور لباس میں ملازم کا بھی حق ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے لیے کھانا تیار کرے پھر وہ اس کے پاس لے کر آئے اور اس نے اس کے پکانے میں گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے تو آقا کو چاہیے کہ کھانا تیار کرنے والے اس خادم کو بھی کھانے میں اپنے ساتھ بٹھائے اور وہ بھی کھائے۔

آج کل کھانا تیار کرنے والے مرد یا عورت کو جو کھانا دیا جاتا ہے وہ خیرات سمجھا جاتا ہے یا اس پر احسان۔ حالانکہ اس حدیثِ پاک کی روشنی میں یہ اس کا حق ہوتا ہے۔

بعض لوگ ملازم یا ملازمہ سے کوئی نقصان ہو جانے پر اس کو سزا دیتے

ہیں یا اس سے تاوان وصول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیشِ نظر رہنی چاہیے۔

حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ اپنی خادماؤں کو برتن توڑنے پر سزا نہ دیا کرو اس لیے کہ تمہاری عمروں کی طرح برتنوں کی بھی عمریں مقرر ہیں۔ حضورؐ لوگوں کو یہ تلقین بھی فرمایا کرتے تھے کہ ملازموں کی غلطیاں معاف کر دیا کرو۔

سُننِ ابی داؤد میں ہے کہ ایک شخص نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! خادم یا ملازم کی غلطیاں کس حد تک ہمیں معاف کر دینا چاہئیں۔

اس نے دو مرتبہ یہ بات پوچھی مگر آپؐ خاموش رہے۔ اس نے تیسری دفعہ عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا، ہر روز ستر دفعہ۔ حضورؐ لوگوں کو منع فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنے ملازم پر کبھی ہاتھ اٹھائیں۔ آپؐ فرماتے تھے کہ جو کوئی اپنے خادم کو ناحق مارے گا قیامت کے دن اس سے بدلہ لیا جائے گا۔

○ ایک مرتبہ حضرت ابو مسعود بدریؓ اپنے غلام کو کسی قصور کی بنا پر پیٹ رہے تھے۔ اتفاق سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے۔ یہ منظر دیکھا تو رنجیدہ ہو کر فرمایا:

"ابو مسعود! اس غلام پر تمہیں جس قدر اختیار ہے اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔"

حضرت ابو مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک سن کر تھرا اٹھے اور عرض کی:

"یا رسولؐ اللہ! میں اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔"

فرمایا:

"اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی۔"

○ صحیح مسلم میں حضرت ابو علی سُوَید بن مُقَرِّن سے روایت ہے کہ

ہم سات بھائی تھے اور ہمارے پاس صرف ایک غلام تھا۔ (بروایت دیگر صرف ایک خادمہ تھی) ایک دن ہم میں سے سب سے چھوٹے نے اس کو تھپڑ مار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حکم دیا کہ اس کو آزاد کر دو۔

○ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے غلام کو بغیر کسی قصور کے زد و کوب کرے (یا طمانچہ مارے) تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چھوٹی عمر میں ایک غلام کی حیثیت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ پندرہ سال تک برابر آپؐ کی خدمت میں رہے۔ جب ان کے باپ اور چچا انہیں تلاش کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو حضورؐ نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو آپؐ کے پاس رہیں اور چاہیں تو اپنے باپ اور چچا کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں ـــ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس قدر شفقت فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے آپؐ سے جدا ہونا گوارا نہ کیا اور اپنے باپ اور چچا سے کہا، میرے آقا مجھ پر اس قدر مہربان اور شفیق ہیں کہ حقیقی والدین بھی اپنی اولاد کے حق میں اتنے رحیم و شفیق نہیں ہوتے، اس لیے میں آپؐ کی غلامی کو ہزار آزادیوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ آپؐ کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔

حضرت زیدؓ کا جواب سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مسرور ہوئے کہ آپؐ نے انہیں اسی وقت آزاد کر دیا۔ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر خانۂ کعبہ میں تشریف لے گئے اور قریش کے مجمع عام کے سامنے اعلان

فرما دیا کہ زید آج سے میرا فرزند ہے۔ میں اس کا وارث ہوں اور یہ میرا وارث ہوگا۔

ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بہت پہلے آزاد کر کے اپنا متبنیٰ بنا چکے تھے۔ اس موقع پر آپؐ نے حضرت زیدؓ کو فرزند بنانے کے اعلان کی محض تجدید فرمائی۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ شفقت نے ان کے باپ اور چچا کو مطمئن کر دیا اور وہ خوش خوش وطن واپس گئے۔ اس واقعہ کے بعد لوگ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے لگے۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضورؐ کی غیر معمولی محبت کو دیکھ کر وہ صحابہؓ میں "حِبُّ النبی" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب) کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (احزاب) کا حکم خداوندی نازل ہونے کے بعد ہی لوگوں نے انہیں زید بن محمدؐ کے بجائے زیدؓ بن حارثہ کہنا شروع کیا۔ حضورؐ نے کئی سرایا میں حضرت زیدؓ کو امیر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے سریۂ مُوتہ (۸ھ ہجری) میں شہادت پائی۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت محبت کرتے تھے۔ بعض دفعہ آپؐ ان کو اپنی ایک ران پر اور اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو دوسری ران پر بٹھلاتے اور دعا کرتے، الٰہی میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں تو بھی ان پر رحم فرما۔

ایک دفعہ حضرت اسامہؓ دروازے کی چوکھٹ پھلانگتے ہوئے گر پڑے اور ان کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کا خون صاف کرنے میں کچھ کراہت محسوس کی تو حضورؐ نے خود اٹھ کر صاف کر دیا، اور زخم پر اپنا لعاب دہن لگایا۔ یہ لوگ حضرت اسامہؓ کو بھی محبوبِ رسولؐ کہا کرتے تھے۔ وہ بڑی لگن سے حضورؐ کی خدمت کیا

کرتے تھے۔ آپؐ وضو کرتے تو وہ اکثر پانی ڈالنے کی سعادت حاصل کرتے۔
وفات سے چند دن پہلے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے شام کی طرف بھیجنے کے لیے ایک لشکر مرتب فرمایا۔ سات سو مجاہدین پر مشتمل اس لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حضرت سعیدؓ بن زید، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور کئی دوسرے جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے لیکن اس کی امارت (سپہ سالاری) حضورؐ نے اٹھارہ سالہ حضرت اسامہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد فرمائی۔ کچھ لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ ایک نوجوان مجاہد کو مہاجرین اوّلین پر افسری کا استحقاق کیسے حاصل ہو گیا۔ حضورؐ کو ان چہ میگوئیوں کی خبر ہوئی تو آپ علالتِ طبع کے باوجود کاشانہ اقدسؐ سے باہر تشریف لائے اور ایک پُرجلال خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"لوگو! تم نے اس مہم کے امیر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے مجھ کو اس کی اطلاع ملی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اس سے پہلے تم اس کے باپ کے بارے میں ایسی باتیں کہہ چکے ہو۔ واللہ وہ بھی افسری کا مستحق تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بھی افسری کا مستحق ہے۔ وہ بھی مجھ کو محبوب تھا اور یہ بھی ہر خوش گمانی کے لائق ہے، اس لیے تم لوگ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا کرو کہ وہ تمہارے بہترین آدمیوں میں سے ہے۔"

خادم رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ دس سال کی عمر میں آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے خادم بنے اور مسلسل دس سال تک آپؐ کی خدمت میں رہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس سارے عرصے میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام ایسے کیوں کیا اور یہ کام کیوں نہیں کیا۔ (ابوداؤد)

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

نے فرمایا، اپنے خادموں اور ملازموں پر اپنے اختیارات کو غلط استعمال کرنے والا جنّت میں داخل نہ ہوگا۔ پس تم لوگ اپنی اولاد کی طرح ان کی خاطر تواضع کرو اور انہیں وہ کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو (ابن ماجہ)

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم حقیقی معنوں میں زیردستوں کے مولیٰ (آقا، والی، سرپرست، پشت پناہ، نگہبان، مددگار، حمایتی، مُربّی دوست، بہی خواہ) تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس عالمِ فانی سے رخصت ہونے سے پہلے آپؐ اُمّت کو یہ تلقین فرما رہے تھے:

اَلصَّلٰوۃُ وَ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ

(خیال رکھنا) نماز (کا) اور اپنے غلاموں (زیردستوں) کا

یعنی نماز کی پابندی کرنا اور غلاموں (یا زیردستوں) کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ عام طور پر علماء "مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" سے غلام ہی مراد لیتے ہیں۔ مگر اس کے وسیع مفہوم میں ملازم، خادم، ماتحت اور زیردست بھی آجاتے ہیں بالخصوص دورِ حاضر میں یوں سمجھیے کہ غلامی کا رواج ختم ہو جانے کے بعد اس ارشادِ نبویؐ کا مطلب زیردستوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ہی لیا جائے گا۔



آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم محسنِ انسانیت

ذی الحجہ سنہ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر محسنِ انسانیت رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے میدانِ عرفات میں کم وبیش ایک لاکھ اصحاب کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَبْيَضَ وَلَا لِأَبْيَضَ عَلَى أَسْوَدَ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَى

یعنی نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے، ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ (مُسندِ احمد)

سرورِ کائنات فخرِ موجودات رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس حدیثِ پاک میں عالمگیر اُخوّت اور مساواتِ انسانی کا جو بلند نظریہ ایک سرکش اور نسلی امتیازات میں ڈوبی ہوئی دنیا کے سامنے پیش کیا، زمانۂ قدیم وجدید کے سارے دانا و حکماء اس سے بہتر اور جامع تصور اتنے مختصر الفاظ میں پیش نہیں کرسکے۔ محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ آواز اس وقت بلند کی جب انسانوں نے رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت اور سیاست کی غیر عقلی تفریقوں سے انسانیت کو بیسیوں حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بادشاہوں نے خدائی کا رتبہ پایا تھا اور ان کو سجدے کیے جاتے تھے۔ مذہبی پیشواؤں

نے رسولوں، ولیوں اور شہیدوں کو خدائی اور الوہیت تک پہنچا دیا تھا۔ قوموں نے بھی اپنے الگ الگ امتیازی رتبے قائم کر لیے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے آپ کو خدا کا کنبہ کہتے تھے اور دوسرے سب ان کے نزدیک ہیچ تھے۔ ہندوؤں میں برہمن خدا کے منہ سے اور شودر اس کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے تھے۔ روم میں رومی خاص بادشاہی کے لیے اور تمام غیر رومن صرف غلامی اور چاکری کے لیے تھے۔ عرب میں قبائل کی باہمی شرافت کی زیادتی اور کمی کا اس درجہ لحاظ تھا کہ لڑائی میں اپنے سے کم رتبہ آدمی پر تلوار چلانا بھی باعثِ ننگ سمجھا جاتا تھا۔ غزوۂ بدر کے آغاز میں قریش کے عتبہ، شیبہ اور ولید نے اپنے مقابل ہونے والے انصار سے اس عذر کی بناء پر لڑنے سے انکار کر دیا کہ اہلِ مدینہ ان کے ہم رتبہ نہیں ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہی کی آواز تھی جس نے پستی و بلندی اور عزت و ذات کی خود ساختہ دیواروں کو ڈھا دیا، اور سب انسانوں کو انسانیت کی ایک سطح پر لا کھڑا کیا۔

اس سے پہلے فتح مکّہ کے موقع پر آپؐ نے جبابرۂ قریش کے مجمع میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا تھا:

"اللہ نے جاہلیت کا غرور اور باپوں پر فخر کا دعویٰ باطل کر دیا۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

یہی وہ تعلیم تھی جس نے تمام انسانوں کو خواہ عرب ہوں یا ہندی، فرنگی ہوں یا حبشی، ایرانی ہوں یا تورانی، کالے ہوں یا گورے سب کو ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑا کر دیا اور توحید و رسالت کے اقرار پر بلا امتیاز رنگ و نسل سب انسانوں کو بھائی بھائی قرار دیا اور تقویٰ کے سوا ہر پیدائشی اور فرضی امتیاز کو باطل قرار دیا۔

سورۂ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ

اَتْقٰکُمْ یعنی تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ گویا اسلامی اخلاقیات اور انسانی فضیلت کا قرآنی معیار صرف تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے لفظی معنی ڈرنے کے ہیں اور مجازی معنی پرہیزگاری کے ہیں۔ شریعت میں تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی سختی سے پابندی کی جائے اور جن کاموں سے منع کیا گیا ہے ان سے ہر صورت میں بچا جائے گویا جو شخص جتنا زیادہ خدا سے ڈرے گا، اچھے کاموں کی طرف سبقت کرے گا اور بُرے کاموں سے اپنا دامن بچائے گا، اسی کے مطابق اسلامی معاشرے میں اس کا مرتبہ و مقام متعین کیا جا سکے گا۔ اس معیار کی رُو سے اعتقاد اور عمل کی بنیاد پر تو انسانوں میں فرق مراتب ہو سکتا ہے لیکن ان میں انسانیت کا رشتہ بہرحال قائم رہتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان سے بلا لحاظِ مذہب ملت اور رنگ و نسل اچھا برتاؤ کرنا بھی تقویٰ ہی کی ایک شاخ ہے۔

حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال (یعنی کنبہ) ہے۔ اس لیے اللہ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ کی عیال یعنی اس کی مخلوق کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے۔" (رواہُ بیہقی)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مساواتِ انسانی اور باہمی فضیلت کا جو اصول مقرر فرمایا اس کا صرف اعلان ہی نہیں کیا بلکہ آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے دنیا کو اس کا عملی مشاہدہ بھی کرا دیا۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ ایک غریب الدیار غلام تھے۔ حضورؐ نے ان کو آزاد فرما کر اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور وہ زید بن محمدؐ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان پر حضورؐ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں حِبُّ الرَّسول (رسول اللہ

کے محبوب) کہا کرتے تھے۔ حضورؐ نے ان سے اپنی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی زینبؓ بنت جحش کا نکاح کر دیا اور زینبؓ جس رتبہ کی خاتون تھیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت زیدؓ سے علیحدگی کے بعد ان کو اُمّ المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت زیدؓ کے فرزند حضرت اُسامہؓ کو حضورؐ اپنے ایک زانو پر اور اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو دوسرے زانو پر بٹھا کر فرمایا کرتے تھے، الٰہی میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت رکھ۔ اس بے پایاں شفقت کا مَورِد ہونے کی بنا پر اُسامہؓ بھی حِبُّ النبی مشہور ہو گئے تھے۔ یہی اُسامہؓ تھے جن کو حضورؐ نے اپنے وصال سے پہلے ایک لشکر کا امیر مقرر فرما کر سرحدِ شام کی طرف جانے کا حکم دیا۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح اور دوسرے بہت سے جلیل القدر صحابۂ کرام شامل تھے۔ بعض لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں کہ ایک انیس سالہ نوجوان غلام زادے کو بزرگ صحابہؓ پر امیر مقرر فرمایا گیا ہے تو حضورؐ سخت ناراض ہوئے اور خدا کی قسم کھا کر فرمایا کہ اس کا باپ بھی مجھے محبوب تھا اور یہ بھی مجھے تم سب سے بڑھ کر محبوب ہے وہ بھی امارت کے اہل تھا اور یہ بھی امارت کا اہل ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کو حضورؐ نے اپنے گھر کا فرد قرار دیا۔ حضرت بلال حبشیؓ کو اپنے گھر کا سارا انتظام سپرد کر دیا اور مسجدِ نبوی کا مؤذن مقرر فرمایا۔ حضرت صہیب رومیؓ کو بہترین انسان قرار دیا۔ حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ کو مسلمانوں کا امام نماز مقرر فرمایا۔ حضرت مقدادؓ بن الاسود کندی سے اپنی بنت عم ضباعہؓ بنت زبیر کا نکاح کر دیا۔

حضرت بلال حبشیؓ کی صحابۂ کرام کے نزدیک یہ قدر و منزلت تھی کہ وہ انہیں "سیدنا" اے ہمارے سردار کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے۔ ایک

مرتبہ حضرت بلالؓ نے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو تمام مہاجرین اور انصار نے جو شرفائے عرب کا خلاصہ تھے اُن کے سامنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے اور ہر ایک نے آگے بڑھ کر بصد خلوص کہا کہ آپ کو اپنا خویش بنانے سے بڑھ کر ہمارے لیے کون سی عزت ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی مقام و مرتبہ دوسرے غریب الدیار صحابہؓ کو بھی حاصل تھا جو پہلے قریش یا یہود کے غلام تھے۔ عہدِ رسالت اور دورِ صحابہؓ میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔

یہ تو تھی مساواتِ انسانی اور معیارِ فضیلت کی نبوی تعلیم۔ اب ہم احترامِ انسانیت کو لیتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک یا علاقے کے باشندوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے مامور فرمایا تھا اور وہ بھی ایک محدود وقت کے لیے۔ یہ شرف اور اعزاز صرف رسولِ معظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا کہ آپؐ کو صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوعِ بشری کے لیے مبعوث فرمایا گیا۔ یہ حقیقت قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے مثلاً سورۂ "سبا" میں فرمایا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (آیۃ ۲۸)

یعنی ہم نے آپ کو روئے زمین کے تمام انسانوں کی طرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

سورۂ "الاعراف" میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۝ (آیۃ ۱۵۸)

یعنی اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

سورۂ "الانبیاء" میں فرمایا گیا ہے :

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ ۝ (آیۃ ۱۰۷)

یعنی اے نبی ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر
مسند احمد میں بروایت حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خود آنحضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ یعنی میں گورے اور کالے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ اپنے بارے میں حضورؐ نے یہ فرمایا إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا یعنی میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ مسند احمد میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ آپؐ کا یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں یا ان کی تکمیل کر دوں۔ گویا حضورؐ کی معلمانہ شان یہ تھی کہ آپ انسانی زندگی کے تمام فضائلِ اخلاق کو کمال تک پہنچا دیں اور یہ کام آپ نے اس طرح انجام دیا کہ یہ دنیائے رنگ و بو مومنین اور مومنات کے مکارمِ اخلاق کی خوشبو سے مہک اٹھی اور ان کی سیرت و کردار رضائے الٰہی کے طالبین کے لیے ابدالآباد تک نمونہ بن گئی۔ فضائل اور مکارمِ اخلاق کی تعریف اور مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں رضا بالقضا، اخلاص و للّٰہیت، راستبازی، خوش خلقی، حلم و تحمّل، صبر و شکر، عفو و درگزر، زہد و قناعت، رحم و شفقت، اطاعتِ والدین، صلہ رحمی، سخاوت و ایثار، باہمی اُنس و محبّت، دیانت و امانت ــــ اور خدمتِ خلق وغیرہ جیسے فضائل کے علاوہ احترامِ انسانیت کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ احترامِ انسانیت، روا داری اور کشادہ دلی کا دوسرا نام ہے اور اس سے امن و سلامتی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بعثت سے پہلے احترامِ انسانیت نام کی کسی چیز کا وجود دنیا میں نہ تھا اور دنیا کے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں بعض ایسے غلط تصوّرات اور عقائد رواج پا گئے تھے جو انسانی شخصیت کی نشوونما

میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گئے تھے مثلاً یہ کہ عبادت کا مقصد جسم کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دینا ہے، نجات اُخروی دُنیا سے یکسر قطع تعلق کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان کی اپنی اس کی بیوی اور اولاد سب کی جانیں اس کی ملکیت ہیں لہٰذا اسے خودکشی کرنے، اولاد کو کسی بُت کی بھینٹ چڑھانے یا زندہ درگور کرنے کا پورا حق ہے اور شوہر کے مرنے پر بیوی کو بھی اس کے ساتھ مرنا پڑے گا، دین اور دُنیا بالکل الگ الگ ہیں۔ خدا کا حق خدا کو دو اور بادشاہ کا حق بادشاہ کو وغیرہ وغیرہ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام تصورات اور عقائد کو باطل قرار دیا اور دُنیا کو بتایا کہ اپنی طاقت سے بڑھ کر عبادت کرنا روا نہیں، رہبانیت اسلام میں جائز نہیں، ان کی جان اللہ کی امانت ہے اسے خود کو یا اپنی اولاد کو ہلاک کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ اس کی بیوی اس کے ساتھ مرنے کی پابند ہے۔ دُنیا دین کے تابع ہے ان کو الگ کرنے سے گمراہی پھیل سکتی ہے۔ ساتھ ہی آپؐ نے لوگوں کو بتایا کہ خالق کائنات نے انسان کو اپنا خلیفہ ٹھہرایا ہے اور وہ کائنات کا انتہائی قابلِ احترام وجود ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو اپنا دستور العمل قرار دیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدہ آیۃ ۳۲)

یعنی جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے (یا قصاص) یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے کسی انسان کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کی جان بچائی۔

مطلب یہ کہ جو شخص کسی کی ناحق جان لیتا ہے وہ پوری انسانیت کا دشمن

ہے اور جو کسی کی جان بچاتا ہے وہ پوری انسانیت پر احسان کرتا ہے۔

حضورؐ کے اسلوب دعوت وارشاد کے دو پہلو تھے، ایک تو اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل تھا اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ یعنی آپ حکمت، شیریں زبانی اور نرمی سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ جو تعلیم آپ نے زبانی دی اس پر عمل کر کے بھی اُمّت کو دکھایا۔ اس طرح آپؐ کی ذاتِ گرامی نوعِ انسانی کے لیے بہترین نمونہ بن گئی۔ آپؐ نے عصبیّت اور تعصب کو سخت گناہ قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص عصبیّت سے کام لے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پوچھا گیا، یارسولؐ اللہ! عصبیّت کیا ہے؟ فرمایا ظلم میں اپنی قوم کی حمایت کرنا (یا اپنی قوم کی بے جا حمایت کرنا یا اپنی قوم کی ناحق اور ناروا بات پر مدد کرنا)

مدینہ منوّرہ میں اسلامی ریاست کی تاسیس کے وقت غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں کے برابر بنیادی حقوق عطا فرمائے۔ مثلاً جان و مال اور عزّت و آبرو کا تحفّظ، نجی زندگی کا تحفّظ، عقیدہ کی آزادی کا تحفّظ وغیرہ۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک جنازہ ہمارے پاس سے گزرا۔ رسولؐ اللہ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، ہم لوگ بھی آپؐ کے اتباع میں کھڑے ہو گئے، پھر ہم نے عرض کیا یارسولؐ اللہ یہ تو ایک یہودی کی میّت تھی۔ آپؐ نے فرمایا کیا وہ انسان نہیں تھا؟ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک ایک انسان کی بلالحاظ مذہب و عقیدہ کیا قدر و قیمت تھی۔

آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بنی نوع انسان کو احترامِ انسانیت کا جو درس دیا اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ کی بعثت سے پہلے قاصدوں کا چنداں احترام نہ کیا جاتا تھا اور بعض اوقات انہیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح عرب اور دنیا کی دوسری اقوام اسیرانِ جنگ سے نہایت بُرا سلوک کرتی

تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قاصدوں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے اور اسیران جنگ سے نہایت اچھا سلوک کیا جائے۔ جنگ بدر میں جو لوگ قید کیے گئے اُن کے بارے میں آپؐ نے صحابہؓ کو تاکید فرمائی کہ ان کو کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ خود بھوکے رہتے تھے یا کھجوریں کھا کر گزر کر لیتے تھے لیکن قیدیوں کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے تھے۔ علاوہ ازیں آپؐ نے عورتوں، بچوں اور گوشہ نشین راہبوں پر بھی ہاتھ اٹھانے سے منع کر دیا۔

مختصر یہ کہ ہم پوری تحدی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انسانیت کے سلسلے میں محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق اور امتیاز DISCRIMINATION سے پیدا ہونے والے فتنے یکسر ختم ہو سکتے ہیں۔

محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالتِ عامّہ

محسنِ عالم سرورِ کائنات فخرِ موجودات جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیں وہ اتنا پاکیزہ، کامل اور ارفع واعلیٰ نظر آتا ہے کہ زبان بے اختیار محوِ درود وسلام ہو جاتی ہے۔ محسنِ عالم کی کفالتِ عامّہ بھی آپؐ کی حیاتِ اقدس کا ایک ایسا درخشاں پہلو ہے کہ جس کے فیوض وبرکات کی وسعتوں کو دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ کفالت کے لغوی معنی ہیں ذمہ داری یا ضمانت اور عامّہ سے مراد ہے عمومی یا عوام الناس۔ اصطلاحی طور پر عام لوگوں یا مخلوقِ خدا کی مادی ضروریات پورا کرنے کو کفالتِ عامّہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے اگر معاشی یا فلاحی نظام بھی کہہ لیا جائے تو ایک حد تک صحیح ہو گا۔ محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں تشریف لا کر جو انقلاب برپا کیا اس سے زیادہ بابرکت، جامع ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب روئے زمین پر آج تک برپا نہیں ہوا۔ یہ انقلاب بیک وقت روحانی بھی تھا، اخلاقی بھی اور معاشی بھی۔ یہ تینوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ اگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو اس پر محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلامی انقلاب کا اطلاق نہیں ہو گا بلکہ یہ چیزے دیگر ہو گی۔

یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر تھی۔ قرآن پاک کے احکام ومنشاء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں سرِمو فرق نہ تھا۔ آپؐ نے جو انقلاب برپا کیا یا جو نظام قائم فرمایا وہ یکسر قرآنی انقلاب یا قرآنی نظام تھا۔

قرآن حکیم نے بنی نوع انسان کو جو معاشی تصوّر دیا وہ محض مادی تصوّر نہیں ہے۔ قرآن حکیم انسان کو بندۂ شکم بننے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ قرآن کا معاشی تصوّر ایک اخلاقی اور روحانی دستور العمل ہے جو روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور دونوں کی نشو و نما اور بالیدگی کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ دونوں میں ایسی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے کہ دونوں ایک ہی راہ پر اور ایک ہی منزل کی جانب گامزن نظر آتے ہیں۔

محسنِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت طیّبہ کے مطالعے سے آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کا جو نقشہ ذہن پر ابھرتا ہے اس کا بنیادی نکتہ رزق حلال اور اس کے حصُول کے لیے جدّ و جہد ہے، لیکن بات کسب حلال ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اسلام جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت پر بھی کُلّی تصرّف اور اختیار کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس پر کچھ ایسی پابندیاں اور شرائط عائد کرتا ہے جن پر عمل کرنے سے معاشرہ ایک ایسی جنّت بن جاتا ہے جس میں شرفِ انسانی کا احترام بھی ہے اور انسان کی روحانی اور معاشی احتیاج کا علاج بھی۔ اس میں طاقتور کمزور کا استحصال نہیں کرسکتا۔ اس میں بھوک اور ننگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غریب پر زندگی دو بھر نہیں ہوتی۔ امیر، امیر تر اور خزانے کا سانپ بننے کا موقع نہیں پا سکتا۔ اس میں بندہ و آقا کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ گورے کو کالے سے اور عربی کو عجمی سے نفرت کا احساس ہی نہیں رہتا، اس میں کمزوروں، اپاہجوں، بوڑھوں، بے روزگاروں، یتیموں اور بیواؤں کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اُن کی کفالت کی ذمہ داری قبول کی جاتی ہے، اس میں دولت مند غریبوں کو اپنی دولت میں حصہ دار بنانے پر مجبور ہیں۔ اس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ قوم کے غیر مسلم افراد بھی مسلمانوں کی مانند بیت المال سے اپنی احتیاج پوری کرسکتے ہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محسنِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جو انقلاب لائے وہ شروع میں صرف روحانی اور اخلاقی انقلاب تھا لیکن جب ہم قرآن حکیم کا بغور مُطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انقلاب ابتداء ہی سے بیک وقت روحانی اور اخلاقی بھی تھا اور معاشی بھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ ابتداء میں یہ انقلاب افراد کی ذاتی زندگیوں تک محدود تھا کیونکہ اس وقت تک کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی مکی زندگی کا دَور تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب ایک اسلامی ریاست کی تاسیس ہوئی تو یہ انقلاب ریاستی سطح پر بھی عمل میں آگیا۔ قرآنِ پاک کی ابتدائی مکی سورتوں میں جہاں نماز کی تلقین کی گئی ہے اور اللہ سے تعلق جوڑنے کی ترغیب دی گئی ہے وہاں مال کو سینت سینت کر رکھنے، یتیموں کو دھکے دینے اور مساکین کو کھانا کھلانے سے گریز کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ ابتدائی مکی سورۃ "الھُمَزَۃ" میں فرمایا گیا ہے:

"ہلاکت ہے ہر عیب چینی اور غیبت کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی بخش دے گا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا، اسے ہڈیوں کو چٹخا دینے والی دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔"

سورۃ "الماعون" میں ارشاد ہوتا ہے:

"کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو جزا کے دن کو جھوٹ سمجھتا ہے یہی ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو خود کھانا کھلانا تو درکنار اس کی ترغیب بھی نہیں دیتا۔ تو ایسے شخص کے لیے ہلاکت ہے۔"

سورۂ "التکاثر" میں فرمایا گیا ہے :

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے اور یہ ہوس تمہیں مرتے دم تک لگی رہتی ہے۔ (اس ہوس کا نتیجہ تم بہت جلد دیکھ لو گے)"

کفالتِ عامّہ کا جذبہ محسنِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی فطرتِ پاک ہی میں ودیعت کیا گیا تھا۔ بعثت سے پہلے بھی آپؐ کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اُن الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اُس وقت کہے جب حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے سامنے پہلی وحی کا ذکر فرمایا — یہ الفاظ بے اختیار ان کی زبان پر آ گئے :

"آپؐ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں اور بے سہارا لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔" (صحیح بخاری)

محسنِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرتِ پاک کا یہی پہلو ہے جس کو مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ نے "مسدسِ حالی" میں یوں بیان فرمایا :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

مکی دورِ زندگی میں حضورؐ کی کفالتِ عامّہ کی یہ شان تھی کہ رشتہ داروں کی مدد کرتے تھے، بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور بیکس غلاموں کی سرپرستی اور اعانت فرماتے تھے اور ساتھ ہی اپنے صحابۂ کرامؓ

کو بھی احکامِ خداوندی کے مطابق اِنفاق فی سبیل اللہ کی تلقین فرماتے تھے۔ آپؐ کے ایثار و سخاوت کو دیکھ کر متموّل صحابہؓ کے اندر غریب پروری کا جذبہ خود بخود ابھرنے لگا اور وہ کسی جبر و تشدّد کے بغیر بلکہ رضا و رغبت کے ساتھ اللہ کی راہ میں بے دریغ مال خرچ کرنے لگے۔ مدنی دور کا آغاز ہوا اور آپؐ نے حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد رکھی تو کفالتِ عامہ کا نہایت وسیع اور ہمہ گیر نظام قائم فرمایا۔ اس نظام کے تحت خُمس، فَے، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج وغیرہ کے مال سے مسکینوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں، مفلس مسلمانوں کے قرض اور خون بہا ادا کیے جاتے تھے۔ نادار مسلمانوں کے نکاح کرائے جاتے تھے اور اگر کبھی آمدنی کی کسی بھی مد میں کچھ نہ ہوتا تو حضورؐ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ذاتی طور پر قرض لے کر اہلِ حاجت کی ضرورتیں پوری فرماتے تھے۔ پھر آپؐ نے مستقلاً یہ قاعدہ وضع کر دیا کہ:

"جو شخص قرض چھوڑ جائے یا اہل و عیال اس حال میں چھوڑ جائے کہ ان کی کفالت کا کوئی سامان نہ ہو تو وہ میرے حصّے میں ہیں اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔" (صحیح بخاری)

قرآنِ حکیم میں بار بار دولتمندوں سے کہا گیا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے اور تم ان کی مدد کر کے ان پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی احکامِ الٰہی لوگوں کو پہنچاتے وقت اغنیاء کو بار بار تاکید فرمائی کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و متاع ہے سب اللہ کا بخشا ہوا ہے۔ غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کا تمہارے مال میں حق ہے، ان کا حق انہیں لوٹا دو۔ آپؐ نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ نکال کر اپنے آپ کو فارغ نہ سمجھ لو بلکہ تمہارے مال میں یقیناً زکوٰۃ کے علاوہ بھی غرباء و مساکین کا حق ہے۔ آپؐ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا، اپنے اور اپنے اہلِ خاندان کے لیے زکوٰۃ اور صدقہ کے مال کو حرام قرار دیا لیکن دوسرے

کے لیے سب کچھ وقف کر دیا، جو کچھ آیا اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ غزوات اور فتوحات کے نتیجے میں مال واسباب کی کمی نہ تھی مگر وہ سب عامۃ الناس کے لیے تھا۔ اپنے لیے اگر کچھ تھا تو بالعموم فقروفاقہ ہی تھا۔ کوئی سائل آپؐ کے در سے کبھی خالی ہاتھ واپس نہ جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر کسی سوال کے جواب میں "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا۔ کبھی کوئی چیز تنہا نہیں کھاتے تھے۔ کتنی ہی تھوڑی ہوتی مگر آپؐ سب حاضرین کو اس میں شریک کر لیتے تھے۔ کوئی یتیم بے سہارا رہ جاتا تو اس کی سرپرستی فرماتے۔ کسی بیوہ عورت کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا تو اس کی کفالت فرماتے۔ جن لوگوں کو تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے میسر نہ ہوتے ان کو کپڑے عنایت فرماتے۔ عرب کے کونے کونے سے وفود آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے آپؐ ان کو کئی کئی دن تک مہمان رکھتے اور خوب خاطر تواضع کرتے۔ جب وہ جانے لگتے تو سب کو کچھ دے دلا کر رخصت فرماتے۔

ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا:

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ مال نہ تیرا ہے اور نہ تیرے باپ کا ہے، میرے اونٹ کو لاد دے"

حضورؐ نے اس کی بدتمیزی کا برا نہ مانا اور اس کے اونٹ کو جو اور کھجور سے لدوا دیا۔ (ابو داؤد)

ایک دفعہ بحرین سے خراج میں بہت بڑی رقم آئی۔ اسے چھوٹا موٹا خزانہ کہا جاسکتا ہے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اسے صحن مسجد میں ڈال دیا جائے۔ فجر کی نماز کے لیے آپؐ تشریف لائے تو خزانے کے انبار کی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نماز کے بعد ڈھیر کے پاس بیٹھ گئے اور تقسیم کرنا شروع کر دیا جب سب ختم ہو گیا تو دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ یہ گویا گرد تھی جو دامن مبارک پر پڑ گئی تھی۔ (صحیح بخاری)

ایک دفعہ ایک نومسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا۔ اس قبیلے کے لوگ بہت خستہ حال تھے اور ڈھنگ کا لباس بھی انہیں میسّر نہیں تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو مسجدِ نبوی میں جمع کیا اور ان کو ترغیب دی کہ اس قبیلے کی مدد کریں اور غلہ، کپڑا، درم، کھجوریں غرض جو کچھ بھی راہِ خدا میں دے سکتے ہیں لے آئیں۔ اگر کسی شخص کو چھوہارے کا ایک ٹکڑا دینے ہی کی استطاعت ہو تو وہ ضرور دے۔ آپؐ کی ترغیب کا یہ اثر ہوا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا اس نے لا کر آپؐ کے سامنے رکھ دیا۔ بعض نے گھر میں رکھا ہوا سارا غلہ لا کر دے دیا۔ بعض نے اپنے کپڑے اتار کر دے دیئے۔ ایک انصاری نے اشرفیوں کا توڑا پیش کر دیا۔ یہ توڑا اتنا بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے۔ نقد روپیہ اور دوسری اشیاء ان کے علاوہ تھیں۔ اس وقت خوشی سے آپؐ کا چہرۂ مبارک کندن کی طرح دمک رہا تھا (کیونکہ نو وارد قبیلے کی ضرورتیں بخوبی پوری ہو گئی تھیں) (صحیح مسلم۔ باب الصدقات)

حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے دو ساتھی قبولِ اسلام کے بعد اس قدر تنگ دست ہو گئے کہ فاقوں کی وجہ سے ہماری نظر کمزور ہو گئی۔ ہم نے بہت سے لوگوں سے اپنے تکفّل کی درخواست کی لیکن کسی نے ہامی نہ بھری۔ بالآخر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی حالت بیان کی۔ آپؐ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو۔ چنانچہ جب تک ہمارے حالات درست نہ ہو گئے ہم ان بکریوں کے دودھ پر گزارہ کرتے رہے۔ (صحیح بخاری)

ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اے ابوذر اگر اُحد کا یہ پہاڑ میرے لیے سونا بن جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار

کی مقدار کے برابر بھی میرے پاس رہ جائے۔ البتہ یہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے رکھ چھوڑوں۔"

ایک دفعہ فدک سے چار اونٹوں پر غلہ اور کپڑا وغیرہ آیا۔ آپؐ کے حکم کے مطابق اس میں سے کچھ لوگوں کو دیا گیا اور کچھ سے قرض ادا کیا گیا۔ پھر آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا، کچھ بچ تو نہیں رہا؟ انہوں نے عرض کیا، اب کوئی لینے والا نہیں اس لیے کچھ بچ گیا ہے۔ فرمایا جب تک دنیا کا مال باقی ہے میں گھر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ رات مسجد میں بسر کی صبح کو حضرت بلالؓ نے آکر بشارت دی کہ یا رسول اللہ! اللہ نے آپؐ کو سبکدوش کر دیا۔ (یعنی جو کچھ تھا وہ سب تقسیم ہو گیا) (ابوداؤد)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ عامۃ الناس کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی لیکن ساتھ ہی آپؐ لوگوں کو رزق حلال کے حصول کے لیے تگ و دو کرنے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے والا اللہ کا محبوب ہوتا ہے۔ خود آپؐ کو معمولی سے معمولی کام کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ آپؐ بکریوں کا دودھ دوہ لیتے تھے، اپنے جوتے اور کپڑے کو خود پیوند لگا لیتے تھے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خود اٹھا کر لے آتے تھے۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے وقت صحابہؓ کی طرح آپؐ بھی اینٹیں اور گارا ڈھوتے تھے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی میں آپؐ بھی برابر حصہ لیتے تھے۔ غرض آپؐ نے کسب حلال کو جو اہمیت دی اور محنت کش اور مزدور کو جو عزت بخشی اس کے پیش نظر ہر شخص اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خود کفیل بننے کی کوشش کرتا تھا البتہ جو لوگ کسی وجہ سے اپنی کفالت نہیں کر سکتے تھے اور گردش زمانہ کے سامنے بے بس تھے حضورؐ کا باب رحمت ان کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا اور آپؐ کا سحاب کرم ان پر ہر آن جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔

علم سیکھنے اور سکھانے کی نبوی تعلیم

جامع ترمذی اور مسند دارمی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص علم کی طلب میں گھر سے نکلتا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد پر ہے یہاں تک کہ وہ گھر لوٹ آئے۔

اس حدیث پاک میں آقائے دو جہاں فخر موجودات دانائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ پیرائے میں علم اور حصول علم کے لیے گھر سے نکلنے کی اہمیت اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تحصیل علم کو جس عمل صالح کے برابر قرار دیا ہے وہ جہاد ہے جو قرآن و حدیث کی رو سے تمام اعمال خیر سے افضل ہے، اس حد تک کہ میدان جہاد میں مجاہد کی ایک رات سو سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلی وحی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے یعنی

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

یعنی: پڑھ اپنے رب کا نام لے کر جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ انسان کو علم قلم کے ذریعے سکھایا گیا نیز اسے وہ علم سکھایا گیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۙ

یعنی: پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم کے ذریعے سے اور سکھایا انسان کو وہ علم جو نہیں جانتا تھا وہ۔

گویا پڑھنا اور لکھنا دونوں علم کے اجزا ہیں۔ پڑھنا اس لیے کہ اس کے بغیر علم بے معنی ہے اور لکھنا اس لیے کہ آئندہ نسلوں کے لیے علمی سرمایہ جمع ہوتا رہے اور اشاعتِ علم کا مقصد پورا ہوتا رہے۔ قلم کے ذریعے علم سکھانے کا مطلب لکھنا سکھانا ہے۔

اسلام نے حصولِ علم پر اس قدر زور دیا ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے مذہب اور تہذیب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قرآنِ حکیم میں جا بجا علم اور علماء کا مختلف پیرایوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ النحل میں ارشاد ہوا ہے:

"اہلِ ذکر (علم والوں) سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں یا اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔" (آیۃ: ۴۳)

سورۂ فاطر میں فرمایا گیا ہے:

"اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔" (آیۃ: ۲۸)

سورۃ الزُّمر میں ارشاد ہوا ہے:

"بھلا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں۔" (آیۃ: ۹)

سورۃ المجادلہ میں فرمایا گیا ہے:

"اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور اُن لوگوں کے جنہیں علم دیا گیا، درجے بلند فرمائے گا۔" (آیۃ: ۱۱)

سورۂ طٰہٰ میں اس دُعا کی تلقین کی گئی ہے:

"اے میرے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر" (آیۃ : ۱۱۴)
اسی طرح اور بھی بہت سی آیات میں علم کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور رضائے الٰہی کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کے بعد اللہ کے محبوب سید الانام خیر البشر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مطالعہ کریں تو علم کی اہمیت دلوں اور ذہنوں میں راسخ ہو جاتی ہے۔ چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"علم حاصل کرو کیونکہ اللہ کی خوشنودی کے لیے علم کی تعلیم لازم ہے، علم کی طلب عبادت ہے، علم کی تلاش جہاد ہے، بے علموں کو علم سکھانا صدقہ ہے، علم حلال و حرام کا نشان ہے، جنت کے راستوں پر روشنی کا ستون ہے، راحت و مصیبت کا بتانے والا ہتھیار ہے، دوستوں میں زینت ہے۔ علم والے کی مغفرت کے لیے ہر چیز حتیٰ کہ پانی کی مچھلیاں، زمین کے کیڑے مکوڑے اور خشکی کے درندے اور چرندے بھی دعا کرتے ہیں، علم کے ذریعے مرتبہ بلند ہوتا ہے۔" (جامع بیان العلم - لابن عبدالبر رحمہ اللہ)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عالم کی فضیلت عبادت کرنے والے پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت امت پر۔" (جامع بیان العلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"طالب علم طلب علم کی حالت میں مرتا ہے تو شہید مرتا ہے۔" (مسند بزار رحمہ اللہ)

حضرت ابُو اُمامہ رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ میرے بعد ایسے فتنے برپا ہوں گے کہ ایک شخص صُبح کو مومن اور شام کو کافر ہوا کرے گا مگر وہ لوگ جن کو اللہ نے علم سے زندہ کیا ہے۔ (مُسنَدِ دارمی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم نے مجھ سے فرمایا کہ علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، احکام و فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، قرآن سیکھو اور اوروں کو سکھاؤ کیونکہ میں دنیا سے اٹھ جانے والا ہوں۔ (مُسنَدِ دارمی)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے رستہ چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنّت کی راہوں میں سے ایک راہ پر لے جاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی رضا مندی کے لیے تواضعاً اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور عَالِم کے لیے آسمانوں کے فرشتے زمین کے باشندے اور پانی کی مچھلیاں سب مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور عالِم کی فضیلت (دوسرے لوگوں پر) ویسی ہی ہے جیسی چاند کی چودھویں رات کی فضیلت دوسری تمام راتوں پر اور علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے کسی کو درہم و دینار کا نہیں بلکہ عِلم کا وارث ٹھہرایا ہے، تو جس نے علم حاصل کیا اُس نے میراثِ انبیاء کا ایک بڑا حصہ حاصل کیا۔

(جامع ترمذی ۔ سُنَنِ ابی داؤد)

حضرت صفوان بن عسال مرادی رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسجد میں اپنی سرخ چادر پر تکیہ لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! میں علم طلب کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا، طالب عِلم کے لیے مرحبا ہو۔ (مُسنَدِ احمد، معجم کبیر طبرانی)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو بھائی تھے۔ ان میں سے ایک کمائی کرتا تھا اور دوسرا ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا اور آپؐ سے علم حاصل کرتا تھا۔ کمائی کرنے والے بھائی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے بھائی کی شکایت کی (کہ وہ کچھ کماتا نہیں) تو آپؐ نے فرمایا، شاید کہ تجھے اپنے اسی بھائی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے۔

(ترمذی شریف۔ جمع الفوائد۔ جامع بیان العلم۔ مستدرک حاکم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "علم حاصل کرنا ہر مسلمان عورت اور مرد پر فرض ہے۔" (ابن ماجہ)

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لڑکا طلب علم اور عبادت میں نشو ونما پاتا ہے اسے ستر صدیقوں کا ثواب ملتا ہے۔ (جامع بیان العلم)

ایک اور حدیث میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عالم کی مثال زمین میں ایسی ہے جیسے آسمان پر ستاروں کی کہ خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔" (جامع بیان العلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ہر عقل کی بات (یعنی حکمت) مومن کی گمشدہ میراث ہے وہ اسے جہاں بھی پائے حاصل کرے کیونکہ وہ اس کا سب سے بڑا حقدار ہے۔" (جامع بیان العلم)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اور بھی بیسیوں ارشادات ہیں جن میں آپؐ نے مسلمانوں کو نہ صرف مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کی تلقین فرمائی بلکہ عملی طور پر بھی آپؐ نے علم کی ترویج و اشاعت کے

لیے مؤثر اقدامات کیے۔ اپنے بارے میں آپؐ خود فرمایا کرتے تھے
اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا یعنی میں معلّم بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں حضورؐ
کی بعثت کے وقت قریش کے صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے
مگر آپؐ کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عام ہوگئی اور نوشت و خواند
اسلامی معاشرے کا اہم فریضہ قرار پایا۔ ہجرت سے تقریبًا ایک سال
پہلے آپؐ نے ایک تربیت یافتہ معلّم حضرت مُصعبؓ بن عُمیر کو مدینہ
روانہ فرمایا۔ یہ ان کی مبلّغانہ مساعی ہی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ کے گھر گھر میں اسلام
کا چرچا ہونے لگا۔ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد آپؐ نے اصحابِ صُفّہ کی تعلیم
کے لیے سب سے پہلی درسگاہ قائم کی جس میں دنیا کی جاہل ترین قوم کے
افراد نے تعلیم پاکر زندگی کے ہر شعبے میں دنیا کی تمام اقوام کی رہنمائی کی۔
غزوۂ بدر میں گرفتار ہونے والے تعلیم یافتہ مشرکین کا فدیہ آپؐ
نے یہ مقرر کیا کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں
حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضورؐ کے ایماء
پر عبرانی اور سُریانی زبانیں سیکھیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیرؓ
نے کئی غیر ملکی زبانیں سیکھیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و تعلّم
کو کس قدر اہمیت دیتے تھے، اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص
کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دن حضورؐ نے مسجد میں دو
حلقے دیکھے۔ ایک حلقہ عبادت میں مشغول تھا اور دوسرا مسائلِ دین کی
تعلیم و تعلّم میں۔ آپؐ نے فرمایا، دونوں حلقے اچھے ہیں لیکن دوسرا پہلے
سے افضل ہے کہ وہ خود بھی علم سیکھتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے بھی ہیں۔
میں خود بھی معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ فرما کر آپؐ دوسرے حلقے میں شریک
ہو گئے۔ (مُسندِ دارمی۔ جامع بیان العلم۔ لابنِ عبدالبرؒ)

راہِ حق میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی

قرآن حکیم میں بندۂ مومن کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں ایک خاص وصف "راہِ حق میں ثابت قدمی" کا ہے۔ ثابت قدمی کے لغوی معنی پامردی، مضبوطی سے قدم جما کر کھڑا ہو جانا، مستقل مزاجی اور استقلال کے ہیں۔ عزم و ہمت، شجاعت اور صبر و استقامت بھی ثابت قدمی ہی کی قبیل کے اوصاف ہیں۔ سورۂ بقرہ میں سختی، مصیبت اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہنے والوں کی تعریف یوں کی گئی ہے:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (آیہ ۱۷۷)

یعنی "جو لوگ سختی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی (ایمان میں) سچے ہیں اور وہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں۔"

سورۃ الانفال میں اہل ایمان کو ثابت قدم رہنے کا حکم یوں دیا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ (آیہ ۱۵)

یعنی "اے اہل ایمان جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کے سامنے پیٹھ نہ پھیرنا۔"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی استقلال اور استقامت سے بھرپور حیاتِ طیبہ، سدا روشن رہنے والی ایک ایسی شمعِ نور ہے جس کی روشنی میں ہم زندگی کی تمام کٹھن منزلوں کو مومنانہ حوصلے اور ہمت کے ساتھ پار کر سکتے ہیں۔ حضور نے جس ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ ناساعد حالات

اور دشمنانِ حق کی مخالفت کا مقابلہ کیا، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیں اس میں ثباتِ استقلال کی ایمان افروز اور ولولہ انگیز جھلک نظر آئے گی۔ بعثت کے بعد آپؐ پورے تئیس برس تک سخت مصائب اور مشکلات کے حصار میں گھرے رہے لیکن کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یاس و اضطراب سے مغلوب نہ ہوئے۔ سارے عرب کی طاغوتی طاقتیں مزاحمت پر تُلی رہیں مگر آپؐ کی ثابت قدمی اور فولادی عزم نے اس مزاحمت کو پاش پاش کر ڈالا۔ کفر و شرک اور ہر قسم کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا جنگجو عربوں کو دعوتِ توحید دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا تھا لیکن سلام اس یگانۂ روزگار ذاتِ گرامیؐ پر کہ جو ظلمت کدۂ عرب میں یکہ و تنہا دعوتِ توحید لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے مکی اور مدنی دونوں دور "جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ" کی عملی تصویر تھے۔ مکہ میں تبلیغ حق کی پاداش میں کونسا ظلم تھا جو آپؐ پر نہ توڑا گیا۔ پورے تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رکھا گیا۔ راستے میں کانٹے بکھیرے گئے، سرِ اقدس پر کیچڑ پھینکی گئی، پشتِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ رکھی گئی، گلوئے مبارک میں پھندا ڈالا گیا، سبّ و شتم کی بوچھاڑ کی گئی، بے ہودہ خطابات دیئے گئے، اختلالِ دماغ کی تہمت لگائی گئی، قتل کرنے کے منصوبے بنائے گئے، طائف میں سنگباری کر کے زخمی کیا گیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کو راہِ حق میں گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑا۔ حضورؐ کو تبلیغِ حق سے روکنے کے لیے کفار کی مساعی کا یہ ایک رُخ تھا۔ دوسرا رُخ یہ تھا کہ آپؐ کو بادشاہت، مال و دولت اور اچھے سے اچھے رشتے کی پیش کش کی گئی لیکن آپؐ نے ان سب ترغیبات کو بھی ٹھکرا دیا اور بے مثل عزم و استقامت کے ساتھ تبلیغِ دین کا جہاد جاری رکھا۔ آپؐ کی ہجرت الیٰ المدینہ کے بعد

بھی دشمنانِ حق نے شمعِ رسالت کو بجھانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن آپؐ نے ہر حال میں حق کا پرچم بلند رکھا اور کفر کی یورشوں کے مقابلے میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے رہے۔ غزوۂ بدر میں مشرکینِ مکّہ کے ایک ہزار مسلح جنگجوؤں کے مقابلے میں آپؐ کے ساتھ صرف تین سو تیرہ جاں نثار تھے اور ان کے پاس پورے ہتھیار بھی نہیں تھے لیکن آپؐ کی جبینِ ہمّت پر شکن تک نہ آئی۔ نہایت اطمینان سے اپنی صفوں کو مرتّب کیا اور جب گھمسان کا رن پڑا تو دشمن کی صفوں سے سب سے قریب ہو کر دادِ شجاعت دی۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ یومِ بدر کو ہم نے حضورؐ کے ظلِّ عاطفت میں پناہ لی۔

غزوۂ اُحد میں کیل کانٹے سے لیس تین ہزار کفارِ مکّہ نے مدینہ منوّرہ پر یلغار کی ان کے مقابلے حضورؐ کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی تھے ان میں سے بھی تین سو آدمی راس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ کی ترغیب پر لڑائی سے کنارہ کش ہو گئے لیکن حضورؐ صرف سات سو سرفروشوں کے ساتھ اپنے سے چار گُنا سے بھی زیادہ لشکر سے نبرد آزما ہوئے۔ آپؐ پر تیروں، تلواروں اور برچھیوں کا مینہ برس رہا تھا اور آپؐ شدید زخمی بھی ہو گئے تھے لیکن اخیر تک میدان سے نہیں ہٹے۔ یہ آپؐ کی ثابت قدمی ہی تھی کہ کفار کو خاص مدینہ منوّرہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ بسرعتِ تمام مکّہ کو لوٹ گئے۔

غزوۂ خندق میں سارے عرب کے دشمنانِ حق نے ایکا کر کے مدینہ منوّرہ پر دھاوا بول دیا۔ پھر یہودِ بنو قریظہ نے بھی اُن سے سازباز کر کے مارِ آستین کا کردار ادا کیا لیکن آپؐ نے خندق کھود کر نہایت ثابت قدمی سے اس طوفانِ بلا خیز کا مقابلہ کیا۔ ساتھیوں کی قلّت اور خوراک کی کمی کے باوجود آپؐ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی یہاں تک

کہ دس ہزار کا غولِ بیابانی آپؐ کے آہنی ثبات و عزم کے سامنے بے بس ہو کر منتشر ہو گیا۔

غزوۂ حُنین میں گھات میں بیٹھے ہوئے بنو ہوازن کے ماہر قدر اندازوں نے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے لیکن آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم چند جاں نثاروں کے ساتھ اخیر تک میدانِ جنگ میں کھڑے رہے۔

یہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی ثابت قدمی ہی تھی کہ جن مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے تھے، جب حضرت عباس رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہٗ نے آپؐ کے حکم پر ان کو واپس آنے کے لیے آواز دی تو وہ فوراً پلٹ پڑے اور کافروں کو شکست فاش دی۔

غرض سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی حیاتِ طیبہ کے ہر گام پر ثابت قدمی اور عزیمت و استقامت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن کا حال پڑھ کر عروقِ مردہ میں بھی زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور راہِ حق میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے اور ثابت قدم رہنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

طائف

ظُلمت سے نُور تک

> رسولِ رحمت صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی حیاتِ اطہر کا ایک اہم باب جو خونچکاں بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔

"سیّدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہ کے ساتھ ارضِ شام سے صحرائے عرب کی طرف روانہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مرغزارِ شام کا ایک ٹکڑا ان کے ساتھ کر دیا اور یہی طائف ہے"۔

یہ ایک دلچسپ بدوی افسانہ ہے جو بعض عرب قبائل کے داستان گو صدیوں سے بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ افسانہ محض داستان طرازی ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طائف اور اس کا نواحی علاقہ، ارضِ شام (جس میں کبھی لبنان و فلسطین بھی شامل تھے) کے بعض مینُو سواد خطوں سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں طائف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ صدیوں سے مکہ معظمہ کا توام شہر رہا ہے۔ خود قرآنِ حکیم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ سُورۃُ الزُّخرُف میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالُوا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ (آیت ۳۱)

(اور (کفار) کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا۔)

مفسرین کے نزدیک "قریتین" سے مراد مکہ معظمہ اور طائف ہی کے

شہر ہیں۔ طائف مکہ معظمہ سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر سلسلۂ کوہِ سراۃ کی سطح مرتفع میں واقع ہے۔ اس کو "وَج" سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی سرسبزی، شادابی، پانی کی فراوانی اور خوشگوار آب و ہوا کی بدولت حجاز کی جنّت کہلاتا ہے۔ یہاں سرسبز پہاڑوں کے دامن میں انگور، انجیر، بہی اور انار وغیرہ کے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے باغات عجیب روح پرور منظر پیش کرتے ہیں۔

سطحِ سمندر سے طائف کی بلندی تقریباً پانچ ہزار فٹ ہے اور یہاں کا موسم سرما خاصا شدید ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات درجۂ حرارت نقطۂ انجماد تک پہنچ جاتا ہے۔ البتہ گرمی کا موسم نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور مکہ کے ذی حیثیت لوگ گرمیاں گزارنے یہاں آجاتے ہیں۔

طائف کب آباد ہوا اور اس کی بنیاد کس نے ڈالی؟ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے البتہ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایک بہت ہی قدیم شہر ہے کیونکہ اس کے مضافات میں ماقبل تاریخ دَور کے متعدد آثار ملتے ہیں جو بالعموم چٹانوں پر کھودی گئی تصویروں کی شکل میں ہیں۔

جس زمانے میں آفتابِ رسالت فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، طائف پر بنو ثقیف کا تسلط تھا اور آج بھی طائف میں ثقفی قبیلے کے لوگ کثرت سے آباد ہیں۔ ان لوگوں کے نسبی تعلق کے بارے میں مورخین میں زمانۂ قدیم سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ اس سلسلے میں تین مشہور اقوال یہ ہیں:

(۱) ان کا تعلق قوم ثمود سے ہے جس میں حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور جو اپنی نافرمانی اور کفر و طغیان کے باعث اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوگئی تھی۔

(۲) وہ بنو ہوازن سے ہیں۔ بنو ہوازن وہی قبیلہ ہے جس کی شاخ بنو سعد

سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رضاعی تعلق پیدا ہوا۔

(۳) وہ بنو ایاد سے نکلے ہیں (ایاد اور ہوازن دونوں ہم جدّ قبائل ہیں) تاہم جمہور مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ قریش مکّہ کی طرح بنو ثقیف بھی عدنانی النسل ہیں۔ ان کا مورثِ اعلیٰ ثقیف بن مُنَبّہ بن بکر بن ہوازن بعثتِ نبوی سے کوئی تین سو سال پہلے طائف میں وارد ہوا اس وقت وہاں بنو عدوان (قیس عیلان کے ایک خانوادے) کی حکومت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ثقیف بن مُنَبّہ نے اپنے ایک ایادی ابنِ عمّ کو قتل کر ڈالا اور قصاص کے خوف سے بھاگ کر طائف آگیا جہاں سردارِ علاقہ عامر بن الظرب العدوانی نے اسے نہ صرف پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی اس سے بیاہ دی۔ زمانۂ جاہلیت میں عدنانی قبائل بالعموم آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے کبھی ایک قبیلہ غالب آجاتا کبھی دوسرا۔ یوں ان میں اکھاڑ پچھاڑ کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مؤرخین نے آئے دن کی خانہ جنگیوں کے استقصا سے اپنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ انہی خانہ جنگیوں کے دوران میں قبیلہ عدوان طائف سے ہمیشہ کے لیے نکلنے پر مجبور ہو گیا لیکن ثقیف اور اس کی دور اندیش اولاد نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا کہ دشمنوں نے ان سے کچھ تعرض نہ کیا اور یوں عدوان کے جلا وطن ہونے کے بعد وہ طائف میں ہمہ مقتدر ہو گئے۔

شروع میں بنو ثقیف کی تعداد اتنی نہ تھی کہ وہ تنہا طائف کی ساری قابلِ زراعت زمین کو کام میں لا سکتے۔ چنانچہ انہوں نے دوسرے دوست قبائل کو بھی طائف آنے کی دعوت دی۔ ان میں سے کچھ قبائل نے یہ دعوت قبول کر لی اور وہ بنو ثقیف سے حلیفانہ تعلق قائم کر کے طائف میں آبسے۔ یہ لوگ احلاف کہلاتے تھے۔ ان احلاف کے علاوہ طائف کے ایک حصّے میں قدیم زمانے سے یہودی بھی آباد تھے۔ علّامہ بلاذری نے "فتوح البلدان"

میں لکھا ہے:

"طائف کے ایک حصے میں یہودیوں کی آبادی تھی جو یمن و یثرب سے نکال دیئے گئے تھے اور بسلسلۂ تجارت یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔"

ثقفی بڑے جفاکش، ذہین اور جنگجو لوگ تھے۔ انہوں نے طائف سے متصل وادئ وَج میں طرح طرح کے پھلوں بالخصوص انگور کے بیشمار باغات لگائے اور اپنی زمینوں میں گندم مکئی اور سبزیوں ترکاریوں کی وسیع پیمانے پر کاشت کی۔ ندی نالوں اور چشموں سے آب رسانی کے ایسے عمدہ انتظامات کیے کہ کوئی متمدن سے متمدن قوم بھی ان سے بہتر طریقے نہیں سوچ سکتی تھی۔ زراعت اور باغبانی کے ساتھ ساتھ انہوں نے طائف میں انگور اور مکئی کی شراب کشید کرنے اور کھالوں کی دباغت کی صنعتیں بھی قائم کر رکھی تھیں۔ اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ قبل اسلام طائف سے پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ انگور کی شراب، گیہوں، لکڑی اور دباغت شدہ کھالیں باہر بھیجی جاتی تھیں اور ان کی برآمد سے اہلِ طائف کو کثیر آمدنی ہوتی تھی۔ مکہ، یمن، شمالی عرب کے علاوہ ایران اور شام میں بھی ان چیزوں کی بے حد مانگ تھی اور طائف ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اپنے شہر کی حفاظت کے لیے بنو ثقیف نے ایک ایسی مضبوط فصیل تیار کرلی تھی کہ عرب بھر میں اس کا جواب نہیں تھا۔

امام سہیلیؒ صاحب روض الانف نے لکھا ہے کہ یہ عظیم الشان فصیل بعض کِندی (یمنی) کاریگروں نے تعمیر کی تھی لیکن اغانی اور کچھ دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ طائف کے تاجر اکثر ایران کے شاہی دربار میں آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایران کا ایک بادشاہ (جس کے نام کی تصریح نہیں کی گئی) ایک طائفی تاجر پر اس قدر مہربان ہوا کہ اس نے

تاجر کو منہ مانگی مراد دینے کا وعدہ کیا۔ اس وطن پرست تاجر نے بادشاہ (کسریٰ) سے درخواست کی کہ ہمارے دیار کے اردگرد ایک ناقابلِ تسخیر فصیل بنوا دیجیے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کے ساتھ فنِ تعمیر میں طاق ایک ایرانی مہندس بھیج دیا جس نے اپنی نگرانی میں طائف کے اردگرد فصیل بنوائی اور یوں طائفی تاجر کی خواہش پوری کر دی۔ اس فصیل کی تعمیر کے بعد طائف ایک مضبوط اور محفوظ قلعے کی حیثیت اختیار کر گیا جس کو تسخیر کرنا اگر ناممکن نہیں تو سخت محال تھا۔ بنو ثقیف اور ان کے احلاف یوں تو بڑے جنگ آزما لوگ تھے اور بیک وقت سینکڑوں مردانِ جنگی میدان میں لا سکتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ مکہ کے طاقتور قبائلِ قریش سے نہایت قریبی روابط قائم رکھنے کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان کی بیشتر پیداوار اور مصنوعات کی نکاسی مکہ میں ہوتی تھی اور دوسرا یہ کہ کسی بڑے غنیم کے حملہ کی صورت میں ان کو قریش سے مؤثر امداد مل سکتی تھی چنانچہ ان کے اہلِ مکہ کے ساتھ نہ صرف تجارتی بلکہ ازدواجی تعلقات بھی تھے۔ وہ اپنی لڑکیاں قریش میں اور قریش اپنی بیٹیاں بنو ثقیف میں بیاہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ طائف کے قریب دوسرا طاقتور قبیلہ "بنو ہوازن" کا تھا۔ بنو ثقیف کی اس قبیلہ کے لوگوں سے بھی رشتہ داریاں تھیں۔ اس طرح وہ سیاسی، فوجی اور معاشی ہر لحاظ سے نہایت طاقتور اور محفوظ تھے۔

سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت سے چالیس سال پہلے ابرہہ حبشی (ابرہۃ الاشرم) ایک لشکرِ گراں کے ساتھ مکہ پر حملہ آور ہوا۔ اس لشکر میں ہاتھی بھی شامل تھے۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے حملہ آوروں کو "اصحاب الفیل"، (ہاتھیوں والے) کا نام دیا۔ اس لشکر کی تباہی و بربادی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر اہلِ طائف اور اہلِ مکہ کے تعلقات میں کسی قدر رخنہ پڑ گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ طائف کے ایک باشندے ابو رغال نے مکہ پر

حملہ کے لیے ابرہہ کے لشکر کی رہبری کی۔ اہل مکّہ کے نزدیک یہ ایک غدّارانہ فعل تھا۔ ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے ساتھ عالبًا ابو رغال بھی ہلاک ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اس غدّارانہ حرکت کی وجہ سے اہل مکّہ اور دوسرے اہل عرب صدیوں تک اس کی قبر پر پتھراؤ کرتے رہے۔ یہ قبر مکّہ کے قریب مغمس کے مقام پر تھی۔ چونکہ طائف اور مکّہ زمانۂ قدیم سے ایک دوسرے پر انحصار کرتے چلے آئے تھے اس لیے وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے دُور نہ رہ سکے اور دونوں شہروں سے کچھ سن رسیدہ داناؤں کی مساعی سے بنو ثقیف اور قریش کے دیرینہ تعلقات جلد ہی بحال ہو گئے۔

قِسم قِسم کے میووں، غلّے اور مال و دولت کی فراوانی نے اہل طائف کو نشۂ پندار میں بدمست کر دیا تھا۔ وہ اپنے خالق حقیقی کو بالکل بھلا بیٹھے تھے اور "لات" و "یالیل" نامی بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ "یالیل" ان کا مقامی بُت یا دیوتا تھا جس کی گھر گھر میں پرستش ہوتی تھی اور لات ان کا بڑا بُت تھا جس کو انہوں نے ایک عظیم الشان ہیکل میں نصب کر رکھا تھا۔ یاقوت رومی نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ اہل طائف نے اپنے ہیکل (بت خانے) کو کعبۂ ثانی کی حیثیت دے رکھی تھی اور اپنے شہر کو بھی ایک حرم قرار دے رکھا تھا جس میں چرند پرند کا شکار اور جنگلی درختوں کا کاٹنا ممنوع تھا۔ بعض دوسرے مؤرخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ طائف کا بُت خانہ کعبے کا حریف تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان مؤرخین نے اس بارے میں کسی قدر مبالغے سے کام لیا ہے کیونکہ عام اہلِ عرب کو کعبہ سے اس قدر عقیدت تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کعبے کا نام سُننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ ابرہۃ الاشرم نے یمن میں مصنوعی کعبہ بنایا تو عربوں میں اس کا شدید ردِّ عمل ہوا اور انہوں نے اس مصنوعی کعبے میں نجاست پھینک کر اپنی نفرت کا بھرپور اظہار کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ طائف نے اپنے بُت خانے کی تزئین و آرائش اور اس کی شان و شوکت بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی لیکن انہوں نے مکہ سے اپنی وابستگی ختم نہیں کی تھی اور دوسرے اہلِ عرب کی طرح وہ بھی حج کے لیے مکہ ہی جاتے تھے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "لات" کے پجاری بعض دوسرے قبیلوں میں بھی تھے اور وہ اس پر چڑھاوے چڑھانے طائف بھی آیا کرتے تھے۔ خود قریشِ مکہ "ہبل" "عُزّیٰ" "مناف" وغیرہ کے علاوہ "لات" کو بھی مانتے تھے۔ صحیح بخاری (تفسیر سورۂ نجم) میں ہے کہ قریش "لات" اور عزّیٰ کی قسم کھایا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مُسند میں لکھا ہے کہ قریش سونے سے پہلے "لات" اور عُزّیٰ کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ یاقوت نے "معجم" میں بیان کیا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے وقت دوسرے بُتوں کے علاوہ "لات" کی جے بھی پکارا کرتے تھے۔ گویا "لات" بنو ثقیف اور قریش کا مشترکہ دیوتا تھا، تاہم اس کا خاص معبد طائف میں تعمیر کیا گیا تھا۔ سید سلیمان ندویؒ نے "تاریخ ارض القرآن" میں لکھا ہے کہ "لات" ایک گول سپید پتھر کی صورت میں تھا اور اس پر ایک عمارت تعمیر کر دی گئی تھی۔ لات سے بنو ثقیف کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کے نزدیک اس کی شان میں گستاخی کرنا تباہی اور بربادی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اہلِ طائف کے نزدیک لات کی حیثیت ایک دیوی کی تھی جو بے شمار قوتوں کی مالک تھی۔

بُت پرستی اور شرک کے علاوہ اہلِ طائف دوسرے اخلاقی رذائل میں بھی بُری طرح مبتلا تھے۔ شراب نوشی، سود خواری اور زنا جیسے عیوب ان کی گھٹی میں پڑے تھے اور کثرتِ ازدواج کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک آدمی نے دس دس عورتیں گھر میں ڈال رکھی تھیں۔ "دائرہ معارف اسلامیہ" کے مطابق ابنِ حبیب نے "کتاب المحبّر" میں ایک پوری فصل ان ثقفیوں

پر لکھی ہے جن کی عہدِ اسلام کے آغاز پر دس بیویاں تھیں۔ اہلِ طائف کے یہی لیل و نہار تھے کہ افقِ مکہ پر خورشیدِ رسالت کا طلوع ہوا۔

بنو ثقیف اور ان کے احلاف کی طرح قریشِ مکہ بھی گمراہی اور اخلاقی پستی کی دلدل میں گلے گلے تک دھنسے ہوئے تھے۔ جب تک سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے دعوتِ حق کا آغاز نہیں فرمایا تھا، ان کی زبانیں آپؐ کے اعلیٰ وارفع اخلاق اور پسندیدہ و پاکیزہ خصائل کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھیں یہاں تک کہ انہوں نے آپؐ کو "الامین" کا لقب دے رکھا تھا لیکن جونہی آپؐ نے ان کو توحید کی دعوت دی اور بُت پرستی سے منع فرمایا وہ آتش زیر پا ہو گئے اور آپؐ کی ایذا رسانی کو اپنا شعار بنا لیا۔ ان کی حرماں نصیبی دیکھئے کہ رحمتِ حق ان کے گھر میں اتری لیکن انہوں نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ مشرکینِ قریش نے دعوتِ توحید کے جواب میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ رحمتِ دو عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ان کو مسلسل نجاتِ اُخروی کا راستہ دکھاتے رہے لیکن وہ برابر کفر و عصیاں اور تمرّد کے راستے پر گامزن رہے۔ البتہ جن سعادت مند نفوس کے مقدر میں اللہ تعالیٰ نے سبقت الی الاسلام کا شرف لکھا تھا، انہوں نے ہر قسم کے خطرات کے علی الرغم دعوتِ حق پر لبیک کہا اور اس کی پاداش میں کفار کے بے پناہ ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے۔ ۵ سنہ اور ۶ سنہ بعد بعثت میں بہت سے مسلمان حضورؐ کے ایما پر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے لیکن اس سے مشرکین کی آتشِ غضب ٹھنڈی ہونے کے بجائے اور بھڑک اٹھی یہاں تک کہ سنہ بعد بعثت میں انہوں نے بنو ہاشم اور بنو مُطّلب کو "شعبِ ابی طالب" میں محصور کر دیا اور ان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے۔ سید الانامؐ سمیت بنو ہاشم و

بنو مطلب کے تمام اہل حق اور ان کے حامی پورے تین برس تک "شعب ابی طالب" میں زہرہ گداز مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ سنہ ۱۰ بعد بعثت میں یہ دلدوز مقاطعہ ختم ہوا تو چند ماہ بعد حضورؐ کے جاں نثار چچا جناب ابو طالب اور انتہائی غمگسار و وفادار رفیقۂ حیات اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ تھوڑے ہی دنوں کے فصل سے وفات پا گئے۔ ان دونوں مونس و غمخوار ہستیوں کے سانحۂ ارتحال سے حضورؐ کو شدید صدمہ پہنچا۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس سال (سنہ ۱۰ نبوت) کو "عام الحزن" (سالِ غم) سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔ جناب ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی زندگی میں مشرکین کو حضورؐ پر کھلم کھلا کبھی ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی تھی لیکن اب وہ حضورؐ کو اذیتیں پہنچانے پر بہت جری ہو گئے اور آپؐ کو ستانے کے لیے کسی اوچھی سے اوچھی اور ذلیل سے ذلیل حرکت سے بھی دریغ نہ کیا۔ آپؐ کے فرقِ اقدس پر مٹی پھینکنے، سجدے کی حالت میں آپؐ کے دوشِ مبارک (یا پشتِ مبارک) پر اونٹنی کی اوجھ رکھنے، آپؐ کو غلیظ گالیاں دینے اور اسی قبیل کی اور بے ہودگیوں کے واقعات اسی زمانے کے ہیں۔ قریش کی شدید مخالفت شرارتوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود ہادیٔ برحق صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دعوتِ اِلَی اللّٰہ کا کام بدستور جاری رکھا لیکن جب آپؐ نے دیکھا کہ ان لوگوں کی ضد اور شقاوت انتہا کو پہنچ چکی ہے تو آپؐ نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ عرصہ کے لیے ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس سے پہلے حضورؐ کی بعثت اور آپؐ کی دعوت کا حال اہلِ طائف کو معلوم ہو چکا تھا لیکن انہوں نے اسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے اور اہلِ مکّہ کے درمیان صرف تجارتی تعلقات ہی نہیں تھے بلکہ رشتہ داریوں کے بندھن بھی تھے۔ مؤرخین نے اس سلسلے میں ابو سفیانؓ (اُموی) ابولہب ہاشمی اور معمر جُمحی کی بیٹیوں کا خصوصیت سے

ذکر کیا ہے جو طائف میں بیاہی گئی تھیں۔ اسی طرح طائف کی کئی لڑکیاں مکے میں بیاہی گئی تھیں۔ بنو ثقیف کا ایک شخص اخنس بن شریق مکے میں آکر حضورؐ کے ننھیالی خاندان بنو زہرہ کا حلیف بن گیا تھا اور اپنی قابلیت کی بناء پر مکے میں سرداری کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ بنو زہرہ کی بنو ثقیف کے خاندان "بنو عبدِ یالیل" کے ساتھ رشتہ داری تھی اس لیے طائف کے بنو عبدِ یالیل کو حضورؐ کے ماموؤں کا خاندان کہا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں مکہ کے کئی رؤسا نے طائف میں زمینیں خرید کر وہاں باغات لگا رکھے تھے۔ دونوں شہروں کے باشندے ایک دوسرے کے ہاں اس کثرت سے آتے جاتے رہتے تھے کہ "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو گیا تھا۔ پھر قریشِ مکہ کو کعبہ کی تولیت کی وجہ سے عرب بھر میں جو منفرد مقام حاصل تھا اس کی وجہ سے بھی طائف کے لوگ اہلِ مکہ کے زیرِ اثر تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر دونوں شہروں کے حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ اہلِ طائف میں اتنا دم خم ضرور موجود تھا کہ وہ اہلِ مکہ کی روش کے خلاف آزادانہ طرزِ عمل بھی اختیار کر سکتے تھے۔ ان کے بعض عمائد بدوی قبائل میں زبردست اثر و رسوخ کے مالک تھے اور لوگ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ایک ثقفی رئیس غیلان بن سلمہ کی یہ شان تھی کہ وہ سوقِ عکاظ میں ایک دن لوگوں سے ملاقات کرتا، ایک دن بزمِ شعر و سخن آراستہ کرتا اور ایک دن عدل گستری کرتا۔ رئیسِ طائف عروہ بن مسعود ثقفی کا قریشِ مکہ کے نزدیک جو مرتبہ تھا وہ اُن کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے جس کی طرف قرآنِ حکیم میں اشارہ کیا گیا ہے کہ "قرآن ان بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا۔" ان دو بڑے آدمیوں سے قریش کی مراد ولید بن مغیرہ مخزومی اور عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ طائف کا ایک شاعر اور مفکر جس کو بعثتِ نبوی کے وقت ملک گیر

شہرت حاصل تھی، اُمیّہ بن ابی الصَّلت ثقفی تھا۔ وہ زمانۂ جاہلیّت کے ان اشخاص میں شمار ہوتا ہے جنہیں حُنَفاء کہا جاتا ہے۔ وہ توحیدِ باری تعالیٰ، یومِ آخرت، جزاوسزا، عرش، ملائکہ اور سابقہ انبیاء کا قائل تھا اور اپنے اشعار میں اکثر ان کا ذکر کرتا تھا۔

"الاغانی" کا بیان ہے کہ اُمیّہ بن ابی الصَّلت کو خود منصب نُبُوّت پر فائز ہونے کی اُمید تھی۔ چنانچہ جب اس نے سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت کی خبر سُنی تو سخت مایوس ہوا۔ محض رشک اور حسد کی بناء پر اس نے حضورؐ کی رسالت کو تسلیم نہ کیا اور آپؐ کی برگزیدگی اور عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود شرفِ ایمان سے محروم رہا۔

عرب کا نامور طبیب حارث بن کَلَدہ بھی بنو ثقیف ہی کا چشم وچراغ تھا اور اپنی دانائی اور حذاقت کی بناء پر "طبیب العرب" کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے ایران جاکر "جندی شاپور" کے شہرۂ آفاق "طبی دارالعلم" میں تعلیم پائی تھی۔ ایک دفعہ نوشیرواں (نوشیروانِ عادل) شاہِ ایران نے اسے اپنے دربار میں بُلا بھیجا اور بڑی دیر تک اس سے گفتگو کرتا رہا۔ حارث بن کلدہ نے بادشاہ کے ہر سوال کا جواب ایسی عمدگی سے دیا کہ وہ حارث کی غیر معمولی ذہانت، عقل و دانش، حذاقت اور تبحّرِ علمی کا قائل ہوگیا۔ اہلِ مکّہ بھی اس کے علاج اور مشوروں سے اکثر فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ خود سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے علاج کے لیے اسے مکّہ بُلا بھیجا تھا۔ افسوس کہ اس شخص کو بھی دعوتِ حق قبول کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ (مؤرخین کا عام طور پر یہی خیال ہے اگرچہ بعض نے اخیر عمر میں اس کے مشرف بہ اسلام ہو جانے کا خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ واللہ اعلم)

بنو ثقیف کا ایک اور مشہور شخص عمرو بن امیّہ بن العلاج تھا۔ وہ غیر معم

صلاحیتوں کا مالک تھا اور سارا عرب اس کی عبقریت کا معترف تھا۔ اس طرح نامور شاعر النابغۃ الجعدی کا تعلّق بھی طائف سے تھا۔

مختصر یہ کہ طائف محض ایک زرخیز، شاداب اور خوش سواد خطۂ زمین ہی نہیں تھا بلکہ اس دور کے متعدد ناموران عرب کا مرزبوم بھی تھا۔ اہلِ طائف کی اس اہم حیثیت کے پیشِ نظر رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو براہ راست دعوتِ توحید دینے کا قصد فرمایا۔ بلاشبہ اس میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ شاید اہلِ طائف بھی مشرکینِ مکّہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے معاندانہ طرزِ عمل اختیار کریں لیکن اس امکان کو بھی ردّ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں قبولِ حق کی توفیق دے اور وہ اسلام کے قوی دست و بازو بن جائیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ طائف

شوّال سنہ ۱۰ بعدِ بعثت کے آخر میں سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مکّہ سے طائف کا عزم فرمایا۔ بعض روایتوں میں مکّہ معظّمہ سے آپؐ کے روانہ ہونے کی تاریخ ۲۷ شوال بیان کی گئی ہے۔ امام ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ تنہا تشریف لے گئے تھے لیکن ابن سعدؒ، ابن قتیبہؒ، بلاذریؒ اور بعض دوسرے اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ سفرِ طائف میں حِبُّ النبیؐ حضرت زیدؓ بن حارثہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ جمہور مؤرّخین نے انہی روایات کو ترجیح دی ہے مکّہ سے طائف تک تمام سفر حضورؐ نے پیادہ پا کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اثناءِ سفر میں مکّہ اور طائف کے درمیان بسنے والے کچھ قبیلوں کو بھی حضورؐ نے توحید کی دعوت دی لیکن انہوں نے اس پر مطلق کوئی دھیان نہ دیا۔ جس وقت حضورؐ نے طائف کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرّف فرمایا، بنو ثقیف کی زمامِ قیادت عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کے تین بیٹوں عبدِ یالیل، مسعود

اور حبیب کے ہاتھوں میں تھی۔ ان میں سے ایک کی شادی قریش کے خاندان بنو جمح میں ہوئی تھی اور صفیہ بنت معمر جمحی اس کی اہلیہ تھی۔ سرسبز باغات اور زرخیز زمینوں کے مالک ہونے اور بے حساب آمدنی نے ان تینوں بھائیوں کا دماغ آسمان پر چڑھا رکھا تھا اور وہ کسی دوسرے کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے حضورؐ ان تینوں سے ملے، توحید کی دعوت دی اور اپنی آمد کی غرض بیان کی لیکن یہ تینوں دعوتِ حق پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے برہم ہو گئے اور سخت بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ عبد یالیل نے تنک کر کہا:

"اگر خدا نے تمہیں رسول بنایا ہے تو گویا اس نے کعبہ کا غلاف پرزے پرزے کر ڈالا ہے۔" (یا بروایت دیگر "تو میں کعبے کے پردے نوچ ڈالوں گا")

دوسرے بھائی مسعود نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا:

"کیا خدا کو تمہارے سوا اور کوئی نہ ملتا تھا کہ اسے رسول بناتا، تمہارے پاس تو چڑھنے کے لیے سواری تک نہیں۔"

تیسرا بھائی حبیب منطقیانہ انداز میں یوں گویا ہوا:

"میں تم سے مطلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، اگر تم واقعی خدا کے سچے رسول ہو تو تمہاری بات کو جھٹلانا سخت خطرناک اور خلافِ ادب ہے اور اگر تم جھوٹے ہو تو کذاب سے گفتگو کرنا میرے شایانِ شان نہیں۔"

حضورؐ نے ان کے مایوس کن جوابات سن کر فرمایا کہ خیر میرے ساتھ جو سلوک تم نے کیا سو کیا اب کم از کم اتنا تو کرو کہ جو باتیں ہمارے درمیان ہوئی ہیں ان کو پردۂ اخفا میں رکھو۔

حضورؐ کی یہ خواہش اس خیال کے پیشِ نظر تھی کہ اگر قریش کو ان باتوں کا علم ہو گیا تو وہ اہلِ حق پر جور و تعدی کرنے میں دلیر ہو جائیں گے، لیکن

بنو ثقیف کے ان تینوں سرداروں نے حضورؐ کی اس خواہش کا جواب خندۂ استہزاء سے دیا اور عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے غلاموں، شہر کے لفنگوں، شہدوں اور شریر لونڈوں کو اشارہ کر دیا کہ حق کے داعیٔ اعظمؐ کو خوب ستائیں یہاں تک کہ وہ طائف سے نکل جائیں۔ ان شریروں کو تفننِ طبع کا ایک سامان ہاتھ آ گیا۔ حضورؐ ان کو نیکی اور بھلائی کی طرف بلاتے اور وہ اس کے جواب میں آپؐ کو غلیظ گالیاں دیتے، ٹھٹھا کرتے، تالیاں بجاتے اور پتھر مارتے تھے۔ باختلاف روایت حضورؐ دس دن یا ایک ماہ تک طائف میں مقیم رہے۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق طائف میں آپؐ کے قیام کی کل مدت دس دن تھی لیکن حافظ سخاویؒ اور ابن قتیبہؒ نے لکھا ہے کہ آپؐ نے ایک مہینہ طائف میں قیام فرمایا اور اس دوران میں وہاں کے تمام اشراف و رؤسا کو حق کی دعوت دی۔ حافظ سخاویؒ نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ پہلے بیس دن آپؐ دوسرے لوگوں سے ملتے رہے پھر عبدیالیل اور اس کے بھائیوں سے ملے اور اس ملاقات کے بعد آپ دس دن اور طائف میں ٹھہرے۔ یہ دس دن حضورؐ پر نہایت سخت تھے۔ آپؐ جدھر رُخ کرتے، طائف کے شریر النفس لوگ آپؐ کا تعاقب کرتے۔ انہوں نے شقاوت، خباثت اور غنڈہ پن کی انتہا کر دی۔ عربوں کی قومی روایات کو بُری طرح پامال کیا۔ دریدہ دہنی اور ستمگری کا وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کیا کہ زمین و آسمان تھرا اٹھے۔ جاں نثارِ رسولؐ حضرت زیدؓ بن حارثہ حضورؐ کے دائیں بائیں آگے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے اور بدمعاشوں کے پتھروں کو اپنے ہاتھوں اور جسم پر روکتے تھے لیکن جب چاروں طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو تو فخرِ موجوداتؐ کی ذاتِ گرامی ضرر سے کیسے محفوظ رہ سکتی تھی حضورؐ کا جسدِ اقدس لہولہان ہو جاتا تھا اور ٹخنوں، پنڈلیوں اور گھٹنوں سے خون کے دھارے بہہ نکلتے تھے۔ ایک دن شریروں نے اتنے پتھر برسائے

کہ حضرت زیدؓ بھی زخموں سے چُور چُور ہو گئے۔ (ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کا سر پھٹ گیا۔) اور حضورؐ بھی مجروح و نزار ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اس وقت جسمِ پاک کے ہر حصّے سے خون رس رہا تھا۔ شریروں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا اور پھر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ آخر انسانیت کے محسنِ اعظمؐ اپنے جاں نثار ساتھی کے ہمراہ زخموں سے چُور اور خون میں غلطیدہ طائف سے نکلے اور کچھ دُور جا کر ایک باغ کے اندر انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ طائفی اوباش بھی اب تھک ہار کر واپس چلے گئے۔ باغ میں ذرا اطمینان کی سانس لینی نصیب ہوئی تو حضرت زیدؓ نے اپنی چادر سے حضورؐ کے جسمِ اطہر سے خون صاف کیا۔ نعلینِ میں خون اس طرح جم گیا تھا کہ حضورؐ بمشکل اپنے پاؤں باہر نکال سکے۔ قریب ہی پانی موجود تھا۔ حضورؐ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے، وضو کیا اور بارگاہِ ربُّ العزّت میں وہ پُرسوز دعا کی جو تاریخ میں "دُعائے طائف" کے نام سے مشہور ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ پہلے آپؐ نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد یہ دُعا مانگی۔ ابنِ ہشامؒ، ابن جریر طبریؒ، ابن قیمؒ، حافظ ابن کثیرؒ اور کئی دوسرے اربابِ علم نے معمولی لفظی تغیر کے ساتھ اس دُعا کے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:

"الٰہی! میں اپنے ضعف، بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی تحقیر اور بے بضاعتی کی فریاد تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے اَرحَمَ الرّاحِمین، اے درماندہ ناتوانوں کے مالک، تو ہی میرا رَبّ ہے، اے میرے آقا تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے۔ بیگانوں کے جو ترشرو ہوں گے یا دشمنوں کے جو میرے نیک و بد کے مالک ہوں گے۔ بارِ خداوندا جب تک تو مجھ سے ناخوش نہیں ہے مجھے ان مصائب کی پروا نہیں ہے کیونکہ تیری عافیت اور بخشش میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں پناہ مانگتا

ہوں تیری ذاتِ پاک کے نور کی جس سے آسمان روشن ہوئے، تاریکیاں دور ہوئیں اور دنیا و آخرت کے کام ٹھیک ہوئے۔ تجھ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر غضب نازل کرے یا تیری ناخوشی مجھ پر وارد ہو اور تجھی کو جب تک چاہے عتاب کرنے کا حق ہے، میں تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے اور تیری مدد اور تائید کے بغیر کسی کو کوئی قدرت نہیں۔"

جس باغ میں سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور حضرت زیدؓ بن حارثہ نے پناہ لی تھی اس کے مالک مکہ کے دو رئیس بھائی عُتبہ و شیبہ فرزندان ربیعہ (بن عبدِ شمس بن عبدِ مناف بن قصیّ) تھے۔ وہ اتفاق سے طائف آئے ہوئے تھے اور اس وقت باغ میں موجود تھے۔ انہوں نے دُور سے ان زخمی اور خستہ حال مسافروں کو دیکھا تو مشرک ہونے کے باوجود ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی کیونکہ حضورؐ ان کے ہموطن بھی تھے اور قریشی بھی۔ پھر ان میں عربی شرافت اور مہمان نوازی ابھی موجود تھی۔ دونوں بھائیوں نے اپنے نصرانی غلام عَدّاس کو حکم دیا کہ جاؤ انگوروں کا ایک خوشہ طباق میں رکھ کر ان مسافروں کو دے آؤ۔ عَدّاس بھی ان مقدس مسافروں کی حالت سے بہت متاثر تھا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ پکے ہوئے انگور چُنے اور ایک طباق میں رکھ کر آپؐ کی خدمت میں پیش کیے اور کہا:

"یہ میرے آقا نے بھیجے ہیں آپ ہماری پناہ میں ہیں اور ہمارے مہمان ہیں۔"

حضورؐ نے "بسم اللہ" (بروایتِ دیگر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) کہہ کر انگوروں کی طرف دستِ مبارک بڑھایا تو عَدّاس حیران رہ گیا۔ اس نے کہا:

"خدا کی قسم اس سرزمین کے باشندوں سے تو میں نے کبھی ایسا

کلمہ نہیں سُنا۔"

حضورؐ نے پوچھا : "بھائی تمہارا آبائی وطن کونسا ہے اور تم کس دین کے پیرو ہو ؟"

عدّاس نے جواب دیا : "میں ارضِ نینوا کا رہنے والا ہوں اور دینِ مسیحی کا پیرو ہوں۔"

حضورؐ نے فرمایا : "اچھا تو تم مردِ صالح یونسؑ بن متیٰؑ کے ہم وطن ہو۔"

فرطِ تحیّر سے عدّاس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں بے اختیار ہو کر پوچھا، "یونسؑ بن متیٰؑ، آپ یونسؑ بن متیٰؑ کو کیسے جانتے ہیں ؟"

حضورؐ نے فرمایا : "یونسؑ میرے بھائی ہیں وہ بھی خدا کے نبی تھے اور میں بھی خدا کا نبی ہوں۔"

عدّاس کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید عطا فرمائی تھی اور پھر وہ تورات و انجیل میں بھی شُد بُد رکھتا تھا۔ لسانِ رسالت سے اعلانِ نبوّت سن کر اس کو یقین ہو گیا کہ مقدّس مسافر فی الحقیقت نویدِ مسیحا اور یوحنا کا "وہ نبی" ہے۔ اسی وقت رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑا۔ اشک ہائے عقیدت سے انہیں تر کیا اور پھر والہانہ آپؐ کے سرِ اقدس اور ہاتھوں کو چومتے ہوئے عرض پیرا ہوا :

اَشْهَدُ اَنَّكَ عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)

عتبہ اور شیبہ دُور سے عدّاس کی یہ کیفیت دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے پاس لوٹ کر گیا تو انہوں نے کہا :

"تجھے کیا ہو گیا کہ تو اس مسافر کے ہاتھ پاؤں اور سر چومنے لگا ؟"

عداسؓ نے جواب دیا :

" صاحبو! یہ مسافر ایک رفیع المرتبت ہستی ہے۔ آج روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے، اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جو ایک نبی کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔"

دونوں بھائیوں نے عداسؓ کو ڈانٹ پلائی کہ خبردار اپنا دین ترک نہ کرنا، تیرا دین اس مسافر کے دین سے بہتر ہے۔

طائف سے مراجعت

باغ میں کچھ دیر ستانے کے بعد حضورؐ طائف سے چل پڑے۔ اس وقت آپ سخت اندوہگین تھے۔ صحیحین میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا :

" یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ پر کوئی ایسا دن بھی آیا جو یومِ اُحد سے زیادہ سخت ہو۔"

حضورؐ نے فرمایا: " ہاں۔ وہ دن سب سے زیادہ سخت تھا جب میں نے طائف سے مراجعت کی تھی میں (باغ سے نکل کر) ملول و محزون آ رہا تھا کہ " قرن الثعالب " (جس کو " قرن المنازل " بھی کہا جاتا ہے) کے مقام پر اچانک ابر کے ایک ٹکڑے نے میرے اوپر سایہ کر لیا، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو جبرئیلؑ دکھائی دیئے۔ انہوں نے پکار کر مجھ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ سن لیا ہے جو آپ کی قوم نے آپ سے کہا اور اس سلوک کو بھی دیکھ لیا جو دعوت توحید کے جواب میں آپ سے روا رکھا گیا، یہ پہاڑوں کا فرشتہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تاکہ

آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔ اتنے میں فرشتۂ جبال نے پکار کر مجھے سلام کیا اور کہا "اے محمدؐ! مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ کے ہر ارشاد کی تعمیل کردوں، اگر آپ کی مرضئ مبارک ہو تو اس وادی کے دو طرفہ پہاڑوں کو باہم ملا کر یہاں کی تمام آبادی کو تہس نہس کر دوں۔"

میں نے جواب دیا، نہیں میں ایسا نہیں چاہتا بلکہ مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔"

بعض اہلِ سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فرشتۂ جبال نے حضورؐ سے اہلِ طائف کو تباہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی لیکن بعض نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس نے جَبَلِ بُوقُبَیس اور جَبَلِ قُعَیقِعان کو باہم ملا کر اہلِ مکہ کو تباہ کرنے کا اِذن مانگا تھا کیونکہ یہ اہلِ مکہ کا ظلم و عناد ہی تھا جس کے باعث آپ کو طائف جانا پڑا تھا۔

مشہور مستشرق سر ولیم میور "لائف آف محمدؐ" میں سفرِ طائف کے موقع پر حضورؐ کی عظمت، عزم و استقامت اور عدیم المثال جرأت کا یوں اعتراف کرتا ہے:

"محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کے سفرِ طائف سے آپ کی بڑی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یکہ و تنہا انسان جس کو اس کی قوم نے نظرِ حقارت سے دیکھا اور رَدّ کر دیا وہ خدا کی راہ میں اپنے شہر سے نکلتا ہے اور جس طرح یونسؑ نبی نے نینویٰ جا کر لوگوں کو حق کی طرف بلایا، اسی طرح یہ بھی وطن سے نکل کر ایک بُت پرست (معاند) شہر میں تبلیغ کرتا ہے اور لوگوں کو ترغیب دیتا ہے کہ

وہ (شرک سے) توبہ کریں اور خدا کے نبی پر ایمان لاکر اس کی تائید کریں۔ اس واقعہ سے یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کامل یقین تھا کہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں"۔

بارگاہِ نبویؐ میں جِنّات کی حاضری

ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ طائف سے واپسی کے سفر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دن وادئ نخلہ میں قیام فرمایا۔ جس مقام پر آپؐ فروکش ہوئے وہ ایک سرسبز اور شاداب قطعۂ زمین تھا اور اس زمانے میں مکہ سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ نخلہ کے اثنائے قیام میں ایک روز حضورؐ عشاء یا فجر یا تہجد کی نماز میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ آپؐ کی قرأت سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ جب حضورؐ آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) پڑھتے تو وہ جواب میں کہتے:

لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِّعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ

(اے ہمارے رب ہم تیری نعمت کو کبھی نہیں جھٹلاتے پس تعریف تیرے ہی لیے ہے۔)

بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر جنات حضورؐ کے سامنے ظاہر نہیں ہوئے لیکن ان کی آمد، سماعت قرآن اور جواب سب باتوں سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو آگاہ فرما دیا۔ چنانچہ بعد میں ایک مرتبہ آپؐ نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرتے وقت (یا سنتے وقت) صحابہؓ کو خاموش پایا تو انہیں اس واقعہ کی تفصیل بتائی اور خواہش فرمائی کہ صحابہؓ بھی ویسا ہی جواب دیں جیسا جِنوں نے دیا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ جن دیارِ بکر کے مقام نصیبین کے رہنے والے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ جن قرآن سن کر ایمان لائے اور اپنی قوم میں واپس جاکر اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی قوم کی بہت بڑی تعداد سعادت اندوزِ ایمان ہوگئی۔ سورۂ احقاف کی آیات ۲۹ تا ۳۲ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

علامہ مخدوم محمد ہاشم سندھیؒ نے اپنی کتاب "بذل القوۃ" میں لکھا ہے کہ نخلہ میں نصیبین کے جنات کا ایک سات رکنی وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا۔ جب حضورؐ نے نمازِ فجر ادا کی اور اس میں قرآنِ مجید کی تلاوت فرمائی تو وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ آپؐ نے پہلی رکعت میں سورۂ رحمٰن اور دوسری میں سورۂ جن یا سورۂ اِقرأ پڑھی۔ نماز کے بعد انہوں نے آپؐ سے ملاقات کی، مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسلام کے داعی بن کر اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے۔

ان روایات میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جنات کے وفود کم از کم چھ مرتبہ مختلف موقعوں پر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور آپؐ کی تعلیم و افادہ سے مشرف ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض راویوں نے ایک موقع کے واقعات کو دوسرے موقع کے واقعات میں خلط ملط کر دیا ہو۔ بہرصورت طائف کے واپسی سفر میں جنوں کے حضورؐ سے تلاوتِ قرآن سننے پر جمہور اہلِ سیر کا اتفاق ہے۔

آنحضورؐ مکہ واپس تشریف لے آئے

نخلہ سے حضورؐ نے مکہ جانے کا قصد فرمایا تو حضرت زیدؓ بن حارثہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! مشرکینِ مکہ تو آپؐ کے جانی دشمن ہیں اب

آپؐ ان کے درمیان کیسے واپس جائیں گے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"اے زید! اللہ تعالیٰ اپنے دین کا حافظ و ناصر ہے وہ موجودہ دَورِ ابتلاء سے نکلنے کی خود کوئی صورت پیدا کر دے گا اور اپنے نبی کو غالب کرے گا۔"

چنانچہ آپؐ نخلہ سے چل کر حرا پہنچے اور وہاں سے ایک مکّی (بقول ابن اسحاق عبداللہ بن الاُرَیقط) کے ہاتھ اُخنَس بن شَرِیق کو پیغام بھیجا کہ وہ آپؐ کو اپنی پناہ اور حمایت میں لے لے، لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں بنو زُہرہ کا حلیف ہوں اور حلیف اصل قبیلے کی شاخ کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے سکتا۔ پھر آپؐ نے سہیل بن عمرو کے پاس ایسا ہی پیغام بھیجا۔ سہیل ابھی ایمان نہیں لائے تھے، انہوں نے بھی ہامی نہ بھری۔ اس کے بعد آپؐ نے مُطعِم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا۔ یہ شخص بنو عبدِ مناف کی شاخ بنی نَوفَل میں سے تھا اور مشرک ہونے کے باوجود بڑا رحم دل، بہادر اور شریف آدمی تھا۔ اس نے آپؐ کو اپنی پناہ میں لینا قبول کر لیا اور آپؐ کو کہلا بھیجا کہ آپ مکّہ میں آجائیں۔

مُطعِم کو علم تھا کہ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کو پناہ دینے کا مطلب سارے قریش کو مخالفت کی دعوت دینا ہے لیکن اس شخص نے کچھ پروا نہ کی اور اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو حکم دیا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں پہنچ جائیں۔ سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم شہر میں داخل ہونے کے بعد طواف کے لیے مسجد الحرام میں تشریف لائے تو مُطعِم بن عدی نے اونٹ پر کھڑے ہو کر کہا:

"اے گروہِ قریش! سُن لو کہ میں نے محمّد (صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم) کو اپنی حمایت میں لے لیا ہے کوئی شخص ان پر ہاتھ اٹھانے کا قصد نہ کرے۔"

حضورؐ نے اطمینان سے طواف کیا، نماز پڑھی اور پھر کاشانۂ اقدس کو تشریف لے گئے۔ اس دوران میں مُطعم اور اس کے بیٹے اور بھتیجے آپؐ پر تلواروں کا سایہ کیے ہوئے تھے۔ آلِ مُطعم کے تیور دیکھ کر تمام جبابرۂ قریش خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

مُطعم کا حضورؐ کو پناہ دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپؐ دعوتِ حق کا کام چھوڑ دیں گے یا مشرکینِ قریش تبلیغِ حق کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیں گے۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ طائف کے پرصعوبت سفر سے واپسی کے بعد حضورؐ نے تبلیغ کا کام پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ شروع کیا۔ آپؐ عکاظ، مجنّہ، ذوالمجاز اور حج کے اجتماعات میں تشریف لے جاتے اور وہاں پر موجود ہر قبیلے کے سامنے دعوت الی اللہ پیش کرتے اور ساتھ ہی اس کو ترغیب دیتے کہ وہ آپؐ کو اپنی حمایت میں لے لے۔ حضورؐ کی تبلیغی مساعی کے جواب میں مشرکین کا طوفانِ معاندت پوری شدت سے امڈ آیا اور انہوں نے دعوتِ حق کے راستے میں نہ صرف ہر قسم کے روڑے اٹکائے بلکہ سید الانامؐ سمیت تمام اہلِ حق پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اسی دوران میں یثرب کے قبائل اوس و خزرج کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بخشی کہ انہوں نے دعوتِ حق پر لبیک کہا اور حضورؐ کو اس عہد کے ساتھ یثرب تشریف لانے کی دعوت دی کہ وہ اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی حفاظت اور حمایت کریں گے۔ دوسری طرف اشقیاءِ قریش کی حق دشمنی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ انہوں نے حضورؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ یہی حالات تھے کہ آپؐ ربیع الاول ۱۴ سنہ بعد بعثت میں مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔

ہجرت اِلَی المدینہ کے بعد

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی قریشِ مکّہ نے اپنی معاندانہ روش ترک نہ کی اور شمعِ توحید کو بجھانے کی کوششوں میں برابر

مصروف رہے لیکن اب حق و باطل کی کش مکش کا انداز اور تھا۔ انصارِ مدینہ کے جوشِ ایمان اور جذبۂ فدویت نے اہلِ حق کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ تلوار کا جواب تلوار سے دیں۔ ۲ھ ہجری میں قریشِ مکہ کو بدر کے میدان میں عبرتناک شکست ہوئی تو جہاں مکہ کے گھر گھر میں ماتم برپا ہو گیا وہاں اہلِ طائف کو بھی کچھ کم صدمہ نہ ہوا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ قریش مسلمانوں کے ہاتھوں اس بُری طرح پِٹ جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے شاعرِ دانا اُمیہ بن ابی الصّلت نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس نے محض اس وجہ سے اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ قریش کے بڑے بڑے سردار (جن سے اس کے قریبی تعلقات تھے) مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ اس موقع پر اس نے بدر کے مقتول قریشیوں کا بڑا پُر درد مرثیہ کہا۔ ۳ھ ہجری میں قریشِ مکہ نے بدر کا بدلہ لینے کے لیے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تو متعدد ثقفی جنگجو بھی ان کے لشکر میں شامل ہو گئے اور میدانِ اُحد میں قریش کے شانہ بشانہ مسلمانوں سے رزم آرا ہوئے۔

۵ھ ہجری میں عرب کے سارے دشمنانِ اسلام نے ایکا کر کے مدینہ منورہ پر یلغار کی تو اہلِ طائف بھی پیچھے نہ رہے۔ علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر بنو ثقیف کا ایک پورا دستہ مدینہ منورہ کے محاصرے میں شریک تھا۔

اس دوران میں چند سعید الفطرت ثقفیوں کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی طرف راغب کر دیا اور وہ دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو گئے۔ ان میں سے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت ابو بصیر عتبہؓ بن اسید کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۶ھ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر قریشِ مکہ نے اپنے جو سفیر سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے لیے بھیجے ان میں سے

ایک عروہ بن مسعود ثقفی تھے۔ انھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا اور قریش ان کو بہت مانتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس طرح وہ اہلِ طائف میں معزز و محترم تھے اسی طرح قریش بھی ان کو بزرگ سمجھتے تھے۔ عروہ نے دربارِ نبوت میں حاضر ہو کر حضور سے گفتگو کا آغاز کیا تو عرب کے عام رواج کے مطابق وہ بار بار آپؐ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ثقفی چہرے پر ڈھاٹا باندھے (یا سر پر خود رکھے) اور ہتھیار سجائے حضورؐ کی پشت مبارک کی جانب کھڑے تھے۔ ان کو عروہ کا انداز تخاطب سخت ناگوار گزرا۔ بار بار اپنی تلوار کے قبضہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے۔ آخر پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور کڑک کر بولے:

"تجھے معلوم نہیں کس سے بات کر رہا ہے۔ خبردار اب ہاتھ آگے نہ بڑھانا۔"

عروہ نے ان کی آواز پہچان لی اور بولے:

"او دغا باز کیا تو میرے احسان کو بھول گیا۔"

(صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے زمانہ جاہلیت میں ایک مرتبہ چند آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور عروہ بن مسعود نے ان کی طرف سے خون بہا ادا کیا تھا۔)

اثنائے گفتگو میں عروہ نے کہا:

"محمدؐ! خدا کی قسم میں تمہارے اردگرد ایسے چہرے اور مخلوط آدمی دیکھتا ہوں جو وقت پڑنے پر تم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی قریب ہی کھڑے تھے وہ یہ جملہ سن کر غصہ سے بے تاب ہو گئے اور نہایت سخت لہجے میں کہا:

"کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور آپؐ کو تنہا چھوڑ دیں گے؟ ارے جا تو اپنے معبود لات

کی شرم گاہ کو چوس ۔"

عُروَہ نے انجان بن کر پوچھا، یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا، ابوبکرؓ۔ عروہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تمہارے قدیمی احسانات مجھ پر نہ ہوتے تو میں تم کو نہایت سخت جواب دیتا۔"

عُروَہ نے قریش کی سفارت کا حق تو ادا کر دیا لیکن انہوں نے حضورؐ سے صحابہؓ کی عقیدت کے جو مناظر دیکھے ان سے بڑے متاثر ہوئے۔ قریش کے پاس واپس گئے تو ان کو جمع کر کے اس طرح خطاب کیا:

"اے برادرانِ قریش! میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں (قیصر، کسریٰ، نجاشی) کے درباروں میں گیا ہوں لیکن محمدؐ کے ساتھی جس طرح محمدؐ کے والہ و شیدا ہیں اور جس قدر ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، میں نے کسی بادشاہ کے دربار میں عقیدت اور وارفتگی کا یہ منظر نہیں دیکھا۔ محمدؐ تھوکتے ہیں تو یہ لوگ ان کے لعاب کو اپنے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اپنے جسم اور چہرے پر مل لیتے ہیں۔ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ مستعمل پانی کے ایک ایک قطرے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آپس میں لڑ مریں گے۔ محمدؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کی تعمیل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی شخص بلند آواز سے گفتگو نہیں کرتا اور نہ ان کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتا ہے۔ میری مانو تو محمدؐ سے صلح کر لو۔"

قریش نے عروہ کی باتوں کا خاص اثر قبول کیا اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔ صلح نامہ تحریر ہوا تو اس میں دوسری شقوں کے علاوہ ایک شق یہ بھی تھی

کہ جو مسلمان تجارت کے لیے طائف یا یمن جاتے ہوئے مکّے سے گزریں، انہیں امن و امان حاصل رہے گا۔ اس شق کے اندراج کی وجہ یہ تھی کہ اہل طائف کی عرب کے شمالی حصّے سے بھی اچھی خاصی تجارت تھی اور اس سلسلے میں دونوں جانب کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

صلح نامۂ حدیبیہ تحریر ہو چکا یا اس کی دفعات طے ہو چکیں تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ رئیس قریش سہیل بن عمرو کے فرزند ابو جندل رضؓ جن کو مشرکین نے قبولِ اسلام کے جرم میں قید کر رکھا تھا کسی طرح قید سے چھوٹ کر حدیبیہ پہنچ گئے اور حضورؐ سے استدعا کی کہ مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیجئے۔ صلحنامہ کے مطابق قریش کا جو آدمی بھی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اگر مسلمانوں کے پاس چلا جائے تو مسلمان اس کو واپس کرنے کے پابند تھے۔ حضورؐ نے پاس عہد فرماتے ہوئے بھرے دل کے ساتھ ابو جندل کو قریش کے حوالے کر دیا اور ان کو صبر کی تلقین فرمائی۔ حضورؐ حدیبیہ سے لوٹ کر مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو ابو بصیر ثقفی رضؓ بھی قریش کی قید سے چھوٹ کر مدینہ منوّرہ پہنچ گئے اور اپنے آپ کو حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا۔ حضورؐ نے صلحنامہ کی شرط کے مطابق ابو بصیر رضؓ کو بھی بادلِ نخواستہ قریش کے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ حکمِ خداوندی کے مطابق آپؐ معاہدے کی پابندی کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر ابو بصیر رضؓ نے قریش کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا اور دوسرے کو بھگا دیا۔ اس طرح آزاد ہو کر وہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب آپ کو اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا۔ تاہم حضورؐ نے ان کے طرزِ عمل کو پسند نہ فرمایا اور ان کو ایک ایسا شخص قرار دیا جو لڑائی کی آگ بھڑکانے والا ہو۔ ابو بصیر رضؓ اس ڈر سے کہ حضورؐ ان کو پھر قریش کے حوالے کر دیں گے، مدینہ کے ساحلی مقامات کی طرف نکل گئے۔ چند دن بعد حضرت

ابوجندلؓ بھی زندانِ مکہ سے بھاگ کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ ان دونوں نے اسی طرح کے دوسرے مظلوموں کو بھی ایک راستہ سُجھا دیا اور وہ مشرکین کے پنجۂ ستم سے چھوٹ کر ان کے پاس پہنچنے لگے۔ چند دنوں میں ابوبصیرؓ کے پاس خاصی جمعیت فراہم ہوگئی۔ اب ان لوگوں نے قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ اس طرح قریش کی تجارت خطرے میں پڑ گئی اور وہ حضورؐ سے یہ درخواست کرنے پر مجبور ہو گئے کہ مسلمانوں کی واپسی کی شرط منسوخ سمجھیں اور ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ آئندہ جو مسلمان بھاگ جائے گا وہ آزاد ہے۔ اس پر حضورؐ نے حضرت ابوبصیرؓ کو لکھ کر بھیجا کہ تم ابوجندلؓ کے ہمراہ میرے پاس مدینہ آجاؤ اور دوسرے لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ حضورؐ کا فرمانِ مبارک ایسے وقت پہنچا کہ حضرت ابوبصیرؓ بسترِ مرگ پر تھے۔ مکتوبِ مبارک ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگے اور پڑھتے پڑھتے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ حضرت ابوجندلؓ نے نمازِ جنازہ پڑھا کر وہیں سپردِ خاک کر دیا اور خود مدینہ منوّرہ آگئے۔ ان کے دوسرے ساتھی بھی فرمانِ نبویؐ کی تعمیل میں منتشر ہو گئے۔

غزوۂ حُنَین

رمضان المبارک ۸ ہجری میں مکہ پر پرچمِ اسلام بلند ہوا تو سارے عرب نے اسلام کی صداقت اور عظمت کے سامنے سر جُھکا دیا۔ لیکن بنو ثقیف اور بنو ہوازن کی بدبختی تھی یا کم عقلی کہ مکہ پر اہلِ حق کے استیلا نے ان کو سیخ پا کر دیا اور وہ اسلام کا قلع قمع کرنے کے لیے بڑے زور شور سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مؤرخین نے ثقیف اور ہوازن کے اس طرزِ عمل کی مختلف توجیہات کی ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو بت شکنی کی سزا دینے

کے علاوہ اہل مکہ کے ان باغات اور قطعات پر بلا دغدغہ قبضہ کرنا چاہتے تھے جو طائف میں تھے۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ مکہ کی منڈی ہاتھ سے نکل جانے پر مشتعل ہو گئے۔ دیکھ اس طرف گئے ہیں کہ اسلام کا روز افزوں غلبہ دیکھ کر وہ مضطرب ہو گئے کہ اب ان کی باری آنے والی ہے۔ یہی سوچ کر انھوں نے خود سبقت کر کے پوری قوت سے مسلمانوں پر یلغار کرنے کی ٹھانی۔ قطع نظر اس کے کہ ان لوگوں کی سرکشی کا حقیقی سبب کیا تھا، انھوں نے نہایت اہتمام سے لڑائی کی تیاری کی اور قبائل مضر، ہلال اور جُشم کو بھی اپنے ساتھ ملا کر مکہ کی طرف بڑھے۔ ان لوگوں کی قیادت ہوازن کا ایک تیس سالہ نوجوان رئیس مالک بن عوف النصری کر رہا تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ تمام لوگ اپنے مال مویشی اور بال بچے ساتھ لائیں تاکہ گھر والوں کی عزت و ناموس کے خیال سے وہ پامردی سے مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں اور پیچھے ہٹنے کا خیال دل میں نہ لائیں۔ اس لشکر میں بنو جُشم کا رئیس اور اپنے زمانے کا مانا ہوا شہسوار دُرَید بن صِمّہ بھی شریک تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کی دانائی اور تجربہ کاری سب کے نزدیک مسلّم تھی۔ یہ لشکر اوطاس کی وادی میں اترا۔ یہ مکہ مکرمہ سے قریب طائف جانے والے راستہ میں ایک وادی ہے جس کے گرد و پیش ہوازن کی شاخیں آباد تھیں۔ بعض مؤرخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسی وادی کو وادیٔ حُنَین بھی کہا جاتا ہے لیکن "فتح الباری" میں ہے کہ حُنَین ایک دوسری وادی ہے جو ذوالمجاز کے بازو میں واقع ہے وہاں سے عرفات ہوتے ہوئے مکہ کا فاصلہ دس میل سے کچھ زیادہ ہے مشہور روایات کے مطابق مکہ مکرمہ سے شمال مشرقی جانب طائف کے لیے جو راستہ جاتا ہے اس راستہ پر ایک وسیع میدان ملتا ہے جس کے اطراف میں پہاڑیاں ہیں۔ اسی میدان میں غزوۂ حُنَین ہوا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ غزوۂ حُنَین جبلِ اوطاس

کی پُرپیچ وادیوں میں ہوا۔ یہ پہاڑ طائف کے شمال مشرق میں کوئی تیس چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

بعض جدید سیرت نگار اس طرف گئے ہیں کہ حُنین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی نسبت تیر افگنی سے ہے۔ عربی لغات میں "حنّانہ" تیر اندازی کے وقت کمان کی تانت کھینچنے سے نکلنے والی آواز اور ہوا سے گزرتے ہوئے تیر سے پیدا ہونے والی آواز کو کہتے ہیں۔ آواز دینے والا تیر بھی "الحنّان" کہلاتا ہے۔ غزوۂ حُنین میں ہوازن نے جس طرح تیروں کی بارش کی اور اس سے جو کیفیت پیدا ہوئی اسی کی نسبت سے اس دن کو "یومِ حُنین" کہا گیا۔ یہ حَنَّ (ح۔ن ن) کا اسمِ تصغیر ہے۔
(سیرۃ احمد مجتبیٰؐ از شاہ مصباح الدین شکیل)

وادئ اوطاس میں دُرَید بن صِمّہ نے اونٹوں کی بلبلاہٹ، بکریوں کے ممیانے اور بچوں کے رونے چلّانے کا شور سن کر مالک بن عوف سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا کہ لوگوں کے مال اسباب اور بال بچے لشکر کے ساتھ ہیں تاکہ لوگ جم کر لڑ سکیں۔ دُرَید نے کہا، جب پاؤں اکھڑ جائیں تو مال و عیال مصیبت بن جاتے ہیں۔ ان کو کسی محفوظ مقام پر ٹھہراؤ، فتح ہوئی تو سب تم سے آملیں گے، شکست ہوئی تو یہ پیچھے رہیں گے۔ لیکن مالک بن عوف نے اس کے مشورے کو ٹھکرا دیا اور آگے بڑھ کر وادئ حُنین میں گھاٹیوں، تنگ راستوں اور آڑوں میں کمین گاہیں اور مورچے بنا لیے۔

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو دشمن کے فاسد عزائم اور اس کی روانگی کی اطلاع ملی تو آپؐ اس کے مقابلے کے لیے ۶ شوّال ۸ھ ہجری کو مکّہ سے روانہ ہوئے۔ بارہ ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمرکاب تھا۔ اس میں دس ہزار تو وہ مجاہدین تھے جو فتح مکّہ کے لیے آپؐ کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار مکّہ کے باشندے تھے جن میں اکثریت نومسلموں کی تھی کچھ

اَعراب (دیہاتی) بھی ان میں شامل ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی لشکر میں اَسّی ایسے آدمی بھی تھے جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اپنے کثیر لشکر کو دیکھ کر بعض مسلمانوں کے منہ سے نکل گیا، آج ہم قلیل التعداد نہیں کہ کوئی ہم پر غالب آجائے (یا یہ کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے۔)

مکّہ سے نکلتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکّہ کا گورنر مقرر فرمایا اور حضرت معاذ بن جبل انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگوں کی دینی تربیت کے لیے مکّہ میں چھوڑا۔

۱۰ شوّال ۸ھ ہجری کو مسلمان جھٹ پٹے کے وقت وادی حُنین میں داخل ہوئے تو بنو ہوازن نے (جو تیر اندازی میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے) اپنی کمین گاہوں سے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی۔ ہراول دستے میں بنو سُلیم اور مکّہ کے نومسلم تھے، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے تو سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی اس وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند مہاجرین اور انصار کے ساتھ میدان میں کھڑے رہ گئے۔ باقی سب لوگوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ حضورؐ شہباء نامی اپنے سفید رنگ کے خچر پر سوار تھے۔ اس کی لگام حضرت عباسؓ بن عبد المطّلب (حضورؐ کے چچا) تھامے ہوئے تھے اور زین کا پچھلا حصہ حضرت مغیرہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پکڑ رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہ رجز جاری تھا:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب

میں نبی ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں ہے   میں عبد المطّلب کا فرزند ہوں

ایک روایت کے مطابق آپؐ نے مٹھی بھر خاک زمین سے اٹھائی اور کافروں کے منہ پر پھینکی اور فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْه (ان کے چہرے رسوا ہو گئے)

حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے جو بلند آواز والے تھے فرمایا کہ آپ زور

سے پکاریں، "اے گروہِ انصار! اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو!" (بروایتِ دیگر اے حدیبیہ کی بیعت والو، اے سورۂ بقرہ والو) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی طرح کیا۔ ان کی آواز سنتے ہی سب لوگ اس طرح میدانِ جنگ کی طرف پلٹے جس طرح اونٹ اپنے بچے کی آواز کی طرف دوڑتا ہے۔ اب مسلمانوں نے کفّار پر نہایت تند و تیز حملہ کیا۔ حضورؐ نے یہ فرما کر کہ اب لڑائی کا زور گرم ہو گیا ہے، چند کنکریاں لے کر کافروں کی طرف پھینک دیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ دشمن کی تیزی کم ہو رہی ہے اور وہ پسپا ہو رہا ہے۔ فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ بہت جلد مشرکین شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دُرید بن صِمّہ ایک مجاہد ربیعہؓ بن رفیع (ابن الدّغنہ) کے ہاتھ سے مارا گیا اور مالک بن عوف بچ کر طائف چلا گیا۔

قرآن حکیم میں غزوۂ حُنین کا ذکر اس طرح آیا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورۂ توبہ۔ آیۃ ۲۵-۲۶)

(اللہ اس سے پہلے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے اور حُنین کے دن جب کہ تم کو اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے پھر اللہ نے اپنی سکینت (تسکین) اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرینِ حق کو سزا

دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔)
شکست کھانے کے بعد کفّار دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ نے بھاگ کر طائف میں پناہ لی اور دوسرا اوطاس کی گھاٹی میں جا ٹھہرا حضور نے حضرت ابو عامر اشعریؓ کی قیادت میں ایک مختصر فوج اوطاس بھیجی۔ حضرت ابو عامرؓ اگرچہ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے لیکن ان کی فوج نے مشرکین کو شکست فاش دے کر نہ صرف بے شمار مالِ غنیمت پر قبضہ کر لیا بلکہ دشمن کی بہت بڑی تعداد کو قیدی بھی بنا لیا۔

غزوۂ طائف

طائف کی طرف حضورؐ نے خود پیشقدمی فرمائی اور اس کا نہایت سختی سے محاصرہ کر لیا۔ اس وقت طائف اپنی مضبوط شہر پناہ (فصیل) کی بدولت ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اہلِ طائف نے اس میں سال بھر کی رسد اور کثیر مقدار میں سامانِ حرب و ضرب جمع کر رکھا تھا اور وہ فصیل کے لاتعداد برجوں اور دمدموں سے طویل عرصے تک شہر کا مؤثر دفاع کر سکتے تھے۔ یوں بھی بنو ثقیف اور ان کے احلاف جنگ آزما لوگ تھے اور فنونِ حرب سے ان کے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ ان کے بعض افراد نے جرش جا کر منجنیق، دبابہ، ضبور جیسے قلعہ شکن اور دفاعی آلاتِ حرب بنانے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ (جرش اس زمانے میں اس قسم کا سامانِ حرب بنانے کا بہت بڑا مرکز تھا) بعض مؤرخین نے اس سلسلے میں غیلانؓ بن سلمہ ثقفی اور عروہؓ بن مسعود ثقفی کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ ان دونوں کو یہ فن سیکھنے کے لیے حضورؐ نے جرش بھیجا تھا اس لیے وہ غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف میں حضورؐ کے ساتھ نہ رہ سکے لیکن بیشتر روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے

کہ غیلانؓ بن سلمہ اور عروہؓ بن مسعود نے محاصرۂ طائف کے بعد اسلام قبول کیا تھا اس لیے صحیح یہ ہے کہ انہوں نے قبولِ اسلام سے پہلے اس صنعت (یا فن) کی تعلیم حاصل کی تھی۔ البتہ بعض دوسرے مسلمانوں کو حضورؐ نے غزوۂ خیبر کے بعد یہ صنعت سیکھنے کے لیے ضرور جرش بھیجا تھا۔

محاصرے کے دوران میں مسلمانوں نے بار بار قلعے پر حملے کیے لیکن قلعہ بند طائفیوں نے زبردست مزاحمت کی اور مسلمانوں پر فصیلِ شہر سے بے پناہ آتش باری اور تیر اندازی کر کے انہیں قلعہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قلعے کی برجیوں سے لوہے کی گرم سلاخوں، پتھروں اور تیروں کی بارش کر دیتے تھے۔ مسلمانوں نے شہر پناہ میں شگاف ڈالنے کے لیے منجنیق اور دبابے بھی استعمال کیے لیکن مضبوط فصیل کو مطلق کوئی ضرر نہ پہنچا۔ تقریباً تین ہفتے کے محاصرے کے بعد حضورؐ نے مسلمانوں کو محاصرہ اٹھا کر مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کرنے کا حکم دیا۔ حضورؐ نے قلعہ فتح کیے بغیر طائف کا محاصرہ کیوں اٹھا لیا؟ مؤرخین نے اس کے جواب میں مختلف قیاس آرائیاں کی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) محاصرے کا طویل عرصے تک جاری رہنا ملک کے امن و امان میں خلل ڈال سکتا تھا۔

(۲) طائف کو لاتعداد جانوں کی قربانی دے کر مسخر کرنے سے یہ بہتر تھا کہ اہلِ طائف پر معاشی دباؤ ڈال کر جھکنے پر مجبور کیا جائے۔

(۳) قریشِ مکہ اور دوسرے عرب قبائل کے قبولِ اسلام کے بعد طائف کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصہ تک اپنی انفرادیت اور اہمیت برقرار رکھ سکے۔

(۴) اہلِ طائف کو سرکشی کی سزا دینے کے لیے حضورؐ نے اعلان کیا کہ شہر سے باہر ان کے تمام باغات برباد کر دیئے جائیں گے۔ یہ اہلِ طائف

کی دُکھتی رگ تھی۔ انہوں نے ابن الاسود ثقفی کو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت ابوسفیانؓ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے باغوں کو برباد کر دیا تو ہم اپنی روزی سے محروم ہو جائیں گے۔ ان سے خدا اور صلۂ رحمی کا واسطہ دے کر درخواست کریں کہ وہ فی الحال ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ حضورؐ کے سامنے یہ درخواست پیش ہوئی تو آپؐ نے محاصرہ کو مزید طول دینا مناسب نہ سمجھا اور صحابہؓ کو کوچ کے لیے تیار ہونے کی ہدایت فرمائی۔ جب وہ رختِ سفر باندھ کر کوچ کرنے لگے تو آپؐ نے فرمایا کہ یوں کہو :

آئِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ لِرَبِّنَا حَامِدُونَ

(ہم پلٹنے والے، توبہ کرنے والے عبادت گزار ہیں اور اپنے رب کی حمد کرتے ہیں)

طائف کا محاصرہ اٹھانے کا پس منظر کچھ بھی ہو، حضورؐ سے جب درخواست کی گئی کہ آپؐ ثقیف کے لیے بددعا کریں تو آپؐ نے بددعا کی بجائے اس دُعا کے ساتھ اہلِ طائف کو اپنے حال پر چھوڑ دیا :

"اَللّٰہُمَّ اھْدِ ثَقِیْفًا وَاْتِ بِہِمْ"

(الٰہی ثقیف کو ہدایت دے اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔)

غزوۂ طائف میں باختلافِ روایت بارہ یا تیرہ مسلمان شہید ہوئے۔ ان کی قبریں آج بھی طائف کی موجودہ فصیل کے باہر موجود ہیں۔

غزوۂ طائف کے سلسلے میں دو تین واقعات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حضورؐ غزوۂ حنین و طائف کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں ابورغال ثقفی کی قبر پر سے گزرے۔ آپؐ نے صحابہؓ کو بتایا کہ اس شخص کے ساتھ سونے کی ایک سِل بھی دفن کی گئی تھی۔ صحابہؓ نے وہ جگہ کھود دی تو واقعی وہاں سے سونے کی ایک سِل برآمد ہوئی جس کا وزن بیس رطل سے کچھ زیادہ تھا۔ (بذل القوۃ)

غزوۂ طائف کے موقع پر حضورؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ ہیجڑوں کو گھروں کے اندر نہ آنے دیا کرو۔ صحیح بخاری میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ میرے پاس ایک مخنّث بیٹھا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ میں نے اس مخنّث کو عبداللہؓ بن ابی امیّہ (حضرت اُمّ سلمہؓ کے بھائی) سے یہ کہتے سنا، عبداللہ! اگر طائف میں کل تم کو فتح نصیب ہو تو بنتِ غیلان کو تم لے لینا وہ (اتنی حسین اور گداز جسم ہے کہ) چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ جاتی ہے۔ (یعنی سامنے آتی ہے تو اس کے پیٹ پر چار بل پڑتے ہیں اور پیٹھ پھیرتی ہے تو آٹھ بل پڑتے ہیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ ان لوگوں (ہیجڑوں) کو اپنے گھروں کے اندر نہ آنے دیا کرو۔

بعض روایتوں میں ہے کہ جس ہیجڑے نے یہ بات کی تھی اس کا نام ہیت تھا اور بنتِ غیلان سے اس کی مراد غیلان بن سلمہ رئیسِ بنو ثقیف کی بیٹی بادیہ تھی، جس کے حسن و جمال اور توانا جسم کی بڑی شہرت تھی عبداللہؓ بن ابی امیّہ نے محاصرۂ طائف کے دوران میں شہادت پائی۔ بادیہ اور غیلان بن سلمہ کو اللہ تعالیٰ نے قبولِ اسلام کی سعادت بخشی۔

محاصرۂ طائف کے دوران میں ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ اہلِ طائف کا جو غلام ہمارے پاس چلا آئے گا وہ آزاد ہوگا۔ یہ اعلان سن کر طائف کے ۲۳ غلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوگئے۔ آپؐ نے انہیں اپنے اعلان کے مطابق لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔ ان غلاموں میں مشہور صحابی حضرت ابوبکرہ نُفَیعؓ بن مسروح بھی تھے۔ وہ آزادی کے بعد ساری عمر اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہی کہتے رہے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ طائف کے بعد مکہ کی طرف واپس تشریف لاتے ہوئے جعرانہ (الجعرانہ) کے مقام پر پڑاؤ ڈالا —— یہ مکہ معظمہ کے شمال میں طائف کے راستہ پر پانی کی ایک جگہ ہے۔ مکہ سے اس کا فاصلہ ۲۷ کلومیٹر ہے۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باختلاف روایت ۴ یا ۱۷ دن قیام فرمایا۔ جعرانہ میں پڑاؤ ڈالنے کے بعد آپؐ کئی دن (ایک روایت کے مطابق دس دن) تک شکست خوردہ بنی ہوازن کا انتظار کرتے رہے تاکہ وہ اسلام قبول کرکے آپؐ کے پاس آئیں اور جو کچھ انہوں نے لڑائی میں کھویا ہے انہیں لوٹا دیا جائے۔ مگر جب وہ نہ آئے تو آپؐ نے حنین اور اوطاس کا تمام مالِ غنیمت صحابہؓ میں تقسیم فرما دیا اور اس تقسیم میں "مؤلفۃ القلوب" کو سب سے اوپر رکھا۔

مؤلفۃ القلوب وہ لوگ تھے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ ان کی دلداری اور تالیفِ قلب کی خاطر ان کو سب سے زیادہ حصے عطا ہوئے۔ ان میں قریش کے علاوہ بعض دوسرے قبیلوں کے سردار بھی شامل تھے خاص حصہ پانے والے اصحاب میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) حضرت ابوسفیانؓ بن حرب	۱۰۰	اونٹ اور ۴۰ اوقیہ چاندی
(۲) حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ	۱۰۰	اونٹ اور ۴۰ اوقیہ چاندی
(۳) حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ	۱۰۰	اونٹ اور ۴۰ اوقیہ چاندی
(۴) حضرت حکیمؓ بن حزام	۲۰۰	اونٹ
(۵) حضرت سہیلؓ بن عمرو	۱۰۰	اونٹ
(۶) حضرت صفوانؓ بن امیہ	۳۰۰	اونٹ

(۷) حضرت حویطب رضؓ بن عبد العزیٰ ۱۰۰ اونٹ
(۸) حضرت مخرمہ رضؓ بن نوفل ۵۰ اونٹ
(۹) حضرت اقرع رضؓ بن حابس (بنی تمیم) ۱۰۰ اونٹ
(۱۰) حضرت عیینہ رضؓ بن حصن (بنی فزارہ) ۱۰۰ اونٹ
(۱۱) حضرت عباس رضؓ بن مرداس (بنی سُلیم) ۱۰۰ اونٹ

"مؤلفۃ القلوب"، کو دینے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ باقی مالِ غنیمت کا مجاہدین کی تعداد کی نسبت سے حساب لگائیں۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کی تو ہر پیدل مجاہد کے حصے میں چار اونٹ اور چالیس بکریاں آئیں اور ہر سوار کے حصے میں بارہ اونٹ اور ۱۲۰ بکریاں آئیں۔

اس تقسیم پر جس میں قریش اور مؤلفۃ القلوب کا بہت زیادہ حصہ تھا، انصار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بعض انصاری نوجوانوں کے منہ سے آزردگی کے عالم میں یہ الفاظ نکل گئے کہ عطا کا موقع آیا تو ہمیں پیچھے دھکیل دیا گیا جبکہ قریش کو بڑے بڑے عطیے دیئے گئے اور بعض دوسرے قبائل عرب پر بھی ایسی ہی نوازش کی گئی، حالانکہ ہم ہر موقع پر اللہ کے راستے میں اپنی جانیں قربان کرتے رہے اور مشرکوں کا خون ابھی تک ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے۔ اب لڑائی میں حاصل ہونے والا مال بھی وہی لوگ لے گئے جن کے خلاف ہم لڑتے رہے۔

اس قسم کی باتیں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچیں تو آپؐ نے رئیس انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تمام انصار کو ایک جگہ جمع کرو۔ انہوں نے چمڑے کے ایک بڑے خیمے میں سب انصار کو جمع کیا اور حضورؐ کو اطلاع دی تو آپؐ انصار کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"انصار کے لوگو! تمہاری یہ کیا چہ میگوئی ہے جو میرے علم میں آئی ہے اور یہ کیسا حُزن و اضطراب ہے جو تم میں پایا جاتا ہے؟"

انصار کے بزرگ اصحاب نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! ہم نے تو کچھ نہیں کہا، البتہ ہمارے بعض نوجوانوں کے یہ احساسات ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"اے گروہِ انصار! کیا ایسا نہیں کہ جب میں تمہارے پاس آیا تو تم گمراہ تھے پھر میرے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی؟"

انصار نے عرض کیا:

"بے شک یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا فضل و احسان ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے کیا میں نے تمہارے دلوں کو جوڑ نہیں دیا؟"

انصار بولے:

"یہ اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کا فضل و احسان ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"کیا تم مفلس اور نادار نہ تھے اور کیا اللہ نے میری بدولت تمہیں غنی نہیں بنا دیا؟"

انصار نے بیک آواز کہا:

"بے شک یہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ ہی کا احسان ہے۔"

اب آپؐ نے فرمایا: "اے انصار! تم مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟"

انصار نے عرض کیا: "یارسولؐ اللہ! ہم اس کا کیا جواب دیں، اللہ

اور اللہ کے رسول ہی کا سارا فضل و احسان ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں! خدا کی قسم اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم جو کہو گے سچ ہوگا اور میں اس کی تائید کروں گا کہ اے محمدؐ! جب لوگوں نے تجھے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، جب لوگوں نے تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تو ہم نے تمہاری مدد کی، جب لوگوں نے تجھے گھر اور وطن سے نکال دیا تو ہم نے تجھے پناہ دی۔ جب تم مفلس تھے ہم نے تجھے مال دیا۔

اے جماعت انصار! کیا تم متاع دنیا کے لیے کبیدہ خاطر ہو۔ میں نے نومسلموں کو اسلام پر جمانے کے لیے ان کی دلداری کی۔ ان کو زیادہ حصے اس لیے نہیں دیئے کہ وہ تم سے زیادہ حق رکھتے تھے، میں نے تمہیں تمہارے اسلام کے اعتماد پر چھوڑ دیا۔ کیا تم اس پر راضی اور خوش نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اپنے خیموں میں اللہ کے رسولؐ کو ساتھ لے کر جاؤ۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے تم جس چیز کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ لے کر جائیں گے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سارے لوگ ایک راستہ یا وادی میں چلتے اور انصار کسی دوسری وادی میں، تو میں انصار ہی کی وادی میں چلتا۔

اے اللہ! انصار پر رحم فرما، ان کی اولاد پر رحم فرما اور ان کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔

یہ سن کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ تمام انصاری اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں پھر وہ پکار اٹھے:

"ہم اس پر راضی اور خوش ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہمارے حصہ اور نصیب میں آئیں۔"

رضاعی بہن سے ملاقات

جعرانہ میں ایک دن ایک بوڑھی خاتون آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ حُنَیْن اور اوطاس کی لڑائیوں میں مسلمانوں نے دشمن کے چھ ہزار نفوس کو قیدی بنایا تھا۔ یہ خاتون انہی قیدیوں میں شامل تھیں اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمانوں کے سردار (رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کی رضاعی (دودھ شریک) بہن ہیں۔ مسلمان ان سے واقف نہ تھے انہوں نے ان کو حضورؐ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ انہوں نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! میں آپؐ کی رضاعی بہن ہوں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"کوئی ثبوت؟"

انہوں نے عرض کیا، بچپن میں ایک دن میں آپؐ کو کھلا رہی تھی تو آپؐ نے میری پیٹھ میں دانتوں سے کاٹ لیا تھا اس کا نشان ابھی تک موجود ہے۔ آپؐ نے وہ نشان پہچان لیا اور آپؐ کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی آپؐ کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہؓ کی بیٹی شیماءؓ ہیں جو بچپن میں آپؐ کو کھلایا کرتی تھیں (اُس زمانے میں آپ نجدی قبیلہ سعد بن بکر میں حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے) حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہایت محبت اور احترام کے ساتھ اپنی چادر مبارک ان کے لیے بچھا دی اور حضرت حلیمہؓ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ فوت ہو گئی ہیں۔ یہ سُن کر آپؐ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر ان سے فرمایا، اگر میرے پاس رہنا چاہو تو عزت اور آرام کے

ساتھ رہ سکتی ہو اور اگر اپنے قبیلے میں واپس جانا چاہو تو اس کا بھی تم کو اختیار ہے۔ انہوں نے عرض کیا، مجھے میری قوم میں واپس بھیج دیں۔ حضورؐ نے انہیں کچھ اونٹ، بکریاں، ایک غلام اور ایک باندی دے کر رخصت کر دیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اونٹ اور بکریوں کے ساتھ ایک باندی اور تین غلام عطا فرمائے۔ بی بی شیماؓ نے اپنے وطن جانے سے پہلے اسلام قبول کر لیا۔

وفدِ ہوازن کی آمد

اتفاق کی بات کہ جعرانہ میں جونہی مالِ غنیمت کی تقسیم مکمل ہوئی، بنو ہوازن کا ایک وفد جو بہ اختلاف روایت نو یا چودہ آدمیوں پر مشتمل تھا، بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہوا۔ اس وفد کے قائد زہیرؓ بن صُرد تھے اور اس میں حضورؐ کے رضاعی چچا ابو زرکان بھی شامل تھے۔

ایک روایت کے مطابق اس وفد میں شامل تمام اصحاب جعرانہ آنے سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے بارگاہ رسالت میں حاضری کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ بی بی حلیمہؓ کا تعلق بنو سعد بن بکر سے تھا۔ یہ قبیلہ بنو ہوازن ہی کی ایک شاخ تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہوازن کے لیے اپنے قلبِ اطہر میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ قائدِ وفد نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ! جن قیدی عورتوں کو آپؐ نے باندیوں کی حیثیت سے مجاہدین میں تقسیم فرما دیا ہے ان میں سے کچھ (رضاعت کے رشتے سے) آپؐ کی خالائیں، پھوپھیاں اور بہنیں ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جنہوں نے آپؐ کو گود میں کھلایا۔ اگر سلاطینِ عرب

میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بھی بہت امیدیں ہوتیں لیکن آپؐ کی شان تو ان سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپؐ سب سے بہتر اور افضل قرابت دار ہیں اور آپؐ کی صلہ رحمی زمانے بھر میں مشہور ہے۔ ہم سخت پریشان اور آفت زدہ ہیں۔ ہم پر احسان فرمایئے اور ہمارے قیدی اور مال و اسباب واپس فرما دیجئے۔"

حضور (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے فرمایا:

"تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ میں نے تمہارا کئی دن تک انتظار کیا۔ اب تو میں نے سارا مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کون کون ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ سچی بات پسند ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم اپنا مال اسباب واپس لینا پسند کرو گے یا اپنی عورتیں اور اولاد۔"

زہیرؓ بن صُرد نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! اولاد اور عورتیں تو ہماری عزت و ناموس ہیں۔ عزت و ناموس پر مال اسباب کو ترجیح دینا شرفاء کا شیوہ نہیں۔ آپؐ ازراہِ احسان ہماری اولاد اور عورتیں واپس عنایت فرمایئے!"

حضور (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے فرمایا:

"اے اہلِ ہوازن! جو چیز میرے اور بنو ہاشم کے حصے میں آئی ہے اس پر مجھے اختیار ہے اور یہ سب کچھ میں تمہارے لیے چھوڑتا ہوں، لیکن جو کچھ دوسرے لوگوں کو دیا گیا ہے اس پر میرا اختیار نہیں تم یوں کرو کہ ظہر (بروایتِ دیگر کل فجر) کی نماز کے بعد تم لوگ کھڑے ہو کر لوگوں سے کہنا کہ ہم رسولؐ اللہ کو سفارشی بناتے ہیں کہ ہماری عورتیں اور بچے جنہیں آپ نے لونڈیاں اور غلام بنایا ہے،

ہمیں واپس کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب کردیا ہے۔"

چنانچہ نماز کے بعد وفدِ ہوازن نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت حضورؐ نے وفدِ ہوازن سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"میں اپنے اور بنو ہاشم کے قیدی تمہیں واپس کرتا ہوں اور دوسرے لوگوں سے تمہارے لیے سفارش کرتا ہوں کہ اے لوگو! بنو ہوازن تمہارے بھائی ہیں وہ اسلام کے شرف سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔"

آپؐ کا ارشاد سن کر مہاجرین اور انصار نے بیک زبان عرض کیا، ہمارے حصے کا جو کچھ ہے وہ سب ہم رسولؐ اللہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ بنی تمیم، بنی فزارہ اور بنی سُلیم کے تین آدمی اپنے حصہ سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں تھے لیکن جب حضورؐ نے فرمایا کہ ان کو اپنے حصے کے بدلے میں آئندہ سب سے پہلے ملنے والے مالِ غنیمت سے چھ حصے دیئے جائیں گے تو وہ بھی اپنے اپنے حصہ سے دست بردار ہو گئے۔ چنانچہ بنو ہوازن کی تمام عورتیں اور بچے رہا ہو گئے اور وفدِ ہوازن انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ تمام مرد قیدیوں کو بھی رہا کردیا گیا کیونکہ سب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے۔ اس طرح ایک دن میں چھ ہزار قیدی رہا ہو گئے۔ جب وہ جانے لگے تو آپؐ کے حکم پر ہر ایک کو کپڑوں کا ایک جوڑا بھی دیا گیا۔

حضرت عروہؓ بن مسعود کا قبولِ اسلام اور شہادت

ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ ہی میں تھے کہ طائف کے مرد بزرگ عروہؓ بن مسعود ثقفی کے نہاں خانۂ دل میں یکایک شمعِ ایمان روشن ہو گئی۔ حضورؐ کے پیچھے پیچھے جعرانہ پہنچ گئے اور بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ قبولِ اسلام کے بعد چند دن حضورؐ سے اسلام کی تعلیم حاصل کی اور

آپؐ سے اجازت مانگی کہ طائف جا کر بنو ثقیف کو حق کی دعوت دیں۔ حضورؐ نے بنو ثقیف کی شقاوت قلبی کے پیش نظر فرمایا:

"مجھے خدشہ ہے کہ تمہاری قوم تمہیں قتل کر دے گی۔"

انہوں نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! اہل طائف میری بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور بمنزلہ اپنے باپ کے سمجھتے ہیں، مجھے امید ہے کہ وہ میری بات کو رَدّ نہیں کریں گے۔"

ان کا جوش تبلیغ دیکھ کر حضورؐ نے انہیں تبلیغ حق کی اجازت دے دی۔ عروہؓ نے طائف پہنچ کر جونہی اپنے اسلام کا اعلان کیا اور لوگوں کو توحید کی دعوت دی، اہل طائف ان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ امام حاکمؒ نے "مستدرک" میں لکھا ہے کہ حضرت عروہؓ فجر کی اذان دے رہے تھے کہ بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ) کے ایک شخص اوس بن عوف نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ ان کی رگ اکحل میں پیوست ہو گیا۔ یہ تیر پیغام قضا ثابت ہوا۔ جب ان کی جانبری کی کوئی اُمید نہ رہی تو ان کے اہل خاندان ہتھیار باندھ کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کا بدلہ ضرور لیں گے خواہ ہمارا بچہ بچہ مارا جائے۔ جب تک ہم بنو مالک کے دس سردار قتل نہ کر لیں گے ہم کو چین نہ آئے گا۔ حضرت عروہؓ نیک نفسی میں اپنی مثال آپ تھے، انہوں نے فرمایا:

"یہ تو اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص احسان ہے کہ اس نے مجھے رتبۂ شہادت سے نوازا، میرے بدلہ میں کسی کو قتل نہ کرو، میں نے اپنا خون معاف کیا، میری تو اب صرف یہ آرزو ہے کہ مجھے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ان ساتھیوں کے پاس دفن کرنا جو محاصرۂ طائف کے دوران میں شہید ہوئے۔"

ایک اور روایت میں حضرت عروہؓ سے یہ الفاظ بھی منسوب ہیں:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں جنہوں نے مجھے اس بات کی خبر دی تھی کہ تمہاری قوم تمہیں قتل کر ڈالے گی۔"

اس وصیت کے بعد حضرت عروہؓ نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اہل خاندان نے طائف کے گنج شہیداں میں سپرد خاک کر کے ان کی آخری تمنا پوری کر دی۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عروہؓ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا:

"عروہؓ کی مثال صاحب یٰسین (حضرت عیسیٰؑ) جیسی ہے جنہوں نے اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا اور (اپنی دانست میں) انہیں شہید کر ڈالا۔"

عوفؓ بن مالک کا قبولِ اسلام

بنو مالک نے حضرت عروہؓ کو قبولِ حق کے جرم میں شہید کر ڈالا لیکن وہ اپنے نامور سردار عوف بن مالک نصری کو لوائے توحید تھامنے سے باز نہ رکھ سکے۔ عوف بن مالک وہی شخص تھے، جنہوں نے غزوۂ حنین میں ہوازن، ثقیف اور دوسرے مشرک قبائل کے متحدہ لشکر کی قیادت کی تھی اور پھر طائف میں قلعہ بند ہو کر مسلمانوں کی پُرزور مزاحمت کی تھی۔ حضورؐ کے طائف سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے دل کی دنیا یکایک بدل گئی۔ حضورؐ کے قیام جعرانہ کے دوران ہی میں ایک دن بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں مؤلفۃ القلوب میں شمار کر کے سو اونٹ مرحمت فرمائے۔

عُمرۂ جعرّانہ

جعرانہ میں مالِ غنیمت کی تقسیم اور قیدیوں کی رہائی وغیرہ کا کام مکمّل ہوگیا تو حضورؐ نے عُمرہ کے لیے احرام باندھ لیا۔ ۱۹ ذیقعدہ ۸ھ ہجری کو آپ نمازِ فجر کے وقت مکّہ پہنچے اور عمرہ ادا کر کے اسی رات جعرانہ واپس تشریف لے آئے۔ اگلے دن صبح کو آپؐ نے تمام صحابہؓ کے ساتھ مدینہ کا قصد فرمایا اور ۲۷ ذیقعدہ ۸ھ ہجری کو مدینہ منوّرہ پہنچ گئے۔

اہلِ طائف آستانۂ اسلام پر

رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم طائف سے چلے تھے تو آپؐ نے دُعا مانگی تھی:

"الٰہی ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں میرے پاس بھیج۔"

محبوب ربّ العٰلمین کی دُعا کو درِ اجابت تک پہنچنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اگلے ہی سال (شعبان یا رمضان ۹ھ ہجری میں) بنو ثقیف آستانۂ اسلام کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ اس سلسلہ میں علّامہ شبلی نعمانیؒ نے "سیرت النبیؐ" میں یہ روایت بیان کی ہے:

"عروہؓ کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔ صخر بن عیلہ رئیسِ احمس یہ سن کر کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم طائف کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں کچھ سوار لے کر چل کھڑا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس وقت آپؐ طائف چھوڑ کر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے۔ صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہلِ طائف آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت قبول نہ کر

لیں گے قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا۔ آخر اہلِ طائف نے اطاعت قبول کر لی۔ صخر نے خدمتِ نبوی میں اطلاع کی تو آپؐ نے مسجدِ نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لیے دس مرتبہ دُعا فرمائی۔ چند روز بعد اہلِ طائف نے باہم مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لا چکا اب ہم اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کر کے آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں بھیجے جائیں۔"

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی کتاب "رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی" میں یوں رقمطراز ہیں:

"غالباً مسلمانانِ مکہ نے طائف سے معاشی و اخلاقی قطعِ تعلق کر لیا ہو گا۔ اس معاشی دباؤ کو طائف کتنے دنوں سہار سکتا جبکہ اس کے چوطرف اسلام تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا؟ چند ماہ بعد آخر انھوں نے بھی آنحضرتؐ سے دوستی کے حصول کے لیے ایک وفد مدینہ بھیجا۔"

"دائرۂ معارفِ اسلامیہ (اردو)" میں بیان کیا گیا ہے کہ "رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے (طائف کا) مزید محاصرہ رکھنے کے بجائے ثقیف کے بعض حریف قبائل کو جو مسلمان ہو گئے تھے، اس پر مامور کیا کہ طائف پر معاشی دباؤ ڈالتے رہیں۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اہلِ طائف نے پریشان ہو کر اطاعت قبول کر لی۔" (جلد ۱۲)

اہلِ طائف کے اطاعت قبول کرنے کا پس منظر کچھ بھی ہو بہر صورت ان کے وفد کی بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری تاریخ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہے۔ رحمتِ دو عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خود ان کو اللہ سے مانگا تھا تاکہ وہ اِدھر اُن کے اخلاف اسلام کے دست و بازو بن کر نجاتِ اُخروی کے مستحق بن جائیں۔

شعبان یا رمضان سنہ ۹ ہجری میں اہلِ طائف نے اپنے چند ذی اثر اور زیرک آدمیوں کا ایک وفد مرتب کیا جو عبدِ یالیل (بروایت دیگر اس کے بیٹے) کی قیادت میں عازمِ مدینہ ہوا جب یہ وفد مدینہ منورہ کے قریب مقام ذی حرض میں پہنچا تو ان کی ملاقات حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ثقفی سے ہوئی جو وہاں اونٹ چرا رہے تھے۔ انہیں اپنے ثقفی بھائی بندوں کے آنے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو اس قدر خوش ہوئے کہ حضورؐ کو اطلاع دینے کے لیے مدینہ منورہ کی طرف دوڑ پڑے راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ مل گئے۔ انہوں نے پوچھا، خیر تو ہے اس طرح بے تحاشا کیوں بھاگ رہے ہو؟ حضرت مغیرہؓ نے واقعہ بیان کیا تو صدیقِ اکبرؓ نے انہیں قسم دے کر کہا کہ یہ خوشخبری مجھ کو پہنچانے دو۔ چنانچہ انہوں نے جب حضورؐ کو وفدِ ثقیف کی آمد کی اطلاع دی تو آپؐ کو بھی بے انتہا مسرت ہوئی۔ اسی اثناء میں حضرت مغیرہؓ بھی ارکانِ وفد کو ساتھ لے کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت مغیرہؓ نے ان لوگوں کو تعلیم دی تھی کہ دربارِ رسالت میں پہنچ کر اس طریقہ سے سلام عرض کرنا لیکن ان کے رگ و ریشے میں تو جاہلیت رچی ہوئی تھی۔ اپنے ہی قدیم دستور کے مطابق سلام کیا تاہم حضورؐ نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ حضرت مغیرہؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! یہ میری قوم کے لوگ ہیں کیا میں ان کو اپنے پاس اتار لوں اور ان کی خاطر مدارات کروں۔"

حضورؐ نے فرمایا، میں منع نہیں کرتا کہ تم اپنی قوم کی عزت کرو لیکن ان کو ایسی جگہ اتارو جہاں قرآن کی آواز ان کے کانوں میں پڑتی رہے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھ سکیں۔

چنانچہ حضورؐ کے ایما پر ان لوگوں کو مسجدِ نبوی کے صحن میں خیمے نصب کر کے ٹھہرایا گیا۔ یہ لوگ نماز اور خطبہ کے وقت موجود رہتے تھے گو خود شریک نہیں ہوتے تھے۔ حضورؐ نمازِ عشاء کے بعد خود ان کے پاس تشریف لے جاتے

اور کھڑے کھڑے دیر تک ان سے گفتگو فرماتے رہتے۔ ایک دن انہوں نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپؐ ہم سے تو اپنی رسالت کا اقرار کرانا چاہتے ہیں لیکن خود آپ خطبے میں اپنا نام نہیں لیتے۔ حضورؐ نے فرمایا "میں سب سے پہلے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ نے مجھے نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس کی طرف سے میں خلقت کی ہدایت اور اصلاح کے لیے مبعوث ہوا ہوں"

آہستہ آہستہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس سلسلہ میں رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور رئیسِ وفد عبد یالیل کے درمیان وقتاً فوقتاً جو گفتگو ہوئی، وہ اس طرح تھی:

عبد یالیل : ہمارے ہاں مرد عام طور پر مجرّد رہتے ہیں اس لیے وہ زناکاری پر مجبور ہیں کیا اس کی اجازت ہو گی؟

حضورؐ : زنا تو قطعاً حرام ہے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

"زنا کے پاس ہو کر بھی نہ پھٹکنا۔ کیونکہ یہ بے حیائی اور بہت بُرا چلن ہے" (بنی اسرائیل)

عبد یالیل : اور سود کے بارے میں آپؐ کا کیا حکم ہے۔ یہ تو ہمارا اپنا مال ہے۔

حضورؐ : تم اپنا اصل روپیہ واپس لے سکتے ہو لیکن سود تو بالکل حرام ہے۔ اللہ کا حکم ہے:

"اے لوگو! اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود لوگوں کے ذمے باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔" (البقرہ)

عبد یالیل : اور شراب کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ ہم لوگ پشت ہا پشت سے شراب کے رسیا ہیں کہ یہ ہمارے انگوروں کا عرق ہے اس کی اجازت تو دے دیں۔

حضورؐ : اللہ تعالیٰ نے شرک اور جوئے وغیرہ کے ساتھ شراب بھی حرام کر دی ہے اور فرمایا ہے:

"اے ایمان والو شراب، جوا، بُت اور پانسے یہ سب شیطانی کام
ہیں۔ ان سے بچتے رہو تاکہ فلاح پاؤ۔"

عبدیالیل : ہمیں نماز سے تو معاف فرمایا جائے۔
حضورؐ : جس دین میں خدا کی عبادت نہ کی جائے وہ دینِ فطرت نہیں۔

یہ درخواستیں نامنظور ہو گئیں تو اہلِ وفد نے زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ کیے جانے کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا، اچھا اس کے لیے تم کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ میں نے بعد میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو یہ فرماتے سُنا کہ جب یہ لوگ صدقِ دل سے اسلام قبول کریں گے تو جہاد بھی کریں گے اور زکوٰۃ بھی دیں گے۔

اہلِ وفد نے یہ درخواست بھی کی کہ طائف کو حرم قرار دیا جائے۔ حضورؐ نے ان کی یہ درخواست بھی اس صورت میں قبول فرمالی کہ وادیٔ طائف میں جنگلی خاردار درخت کاٹنا، شکار کرنا، ظلم کرنا، چوری یا کوئی اور برائی کرنا سب حرام ہیں۔

یہ باتیں طے ہو جانے کے بعد اہلِ وفد نے پوچھا کہ ہمارے بُت لات کے بارے میں آپؐ کا کیا ارادہ ہے؟

حضورؐ نے فرمایا : "اسے توڑ دیا جائے گا۔"

یہ لوگ اپنے بُت سے اتنے خوفزدہ تھے کہ حضورؐ کا ارشاد سن کر ان پر سکتہ طاری ہو گیا، بولے :

"اگر لات کو آپؐ کے ارادے کا علم ہو گیا تو ہمیں تباہ و برباد کر دے گا۔"

حضرت عمر فاروقؓ بھی اس موقع پر موجود تھے ان سے ضبط نہ ہو سکا اور ان لوگوں کو ملامت کرنے لگے کہ تم ایک بے جان پتھر سے اتنا ڈرتے ہو؟

اہلِ وفد نے برہم ہو کر کہا "عمر تم نہ بولو، ہم تمہارے پاس نہیں آئے۔"
یہ کہہ کر حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا، ہم میں تو اتنا حوصلہ نہیں کہ لات

کو ہاتھ لگائیں آپ جو چاہیں کریں۔
حضورؐ نے متبسم ہو کر فرمایا : " اچھا تو یہ بت شکنی ہمارے ذمے ہی رہی تم لوگ یہ کام نہ کرنا۔"

اس کے بعد سب اہل وفد سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جو شرطیں وفدِ ثقیف نے پیش کیں وہ ان سب کو ایک معاہدے کی صورت میں لکھ کر اپنے ساتھ لائے تھے اور چاہتے تھے کہ حضورؐ اس پر اپنی مہرِ ثبت فرما دیں، لیکن دانائے کونینؐ نے ان کو ایسی حکمت اور محبت سے سمجھایا کہ وہ اپنے تمام لغو مطالبوں سے دستبردار ہو گئے، اور اس تحریری معاہدے پر دستخط کرنے پر تیار ہو گئے جو حضورؐ نے تجویز فرمایا۔ ابو عبیدؒ نے یہ معاہدہ "کتاب الاموال" میں پورے کا پورا نقل کیا ہے۔ اس کا متن یہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ ایک تحریر ہے اللہ کے رسول اور نبی محمدؐ کی، ثقیف کے لیے۔ ان کو اس اللہ کا ذمہ دیا جاتا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور نبی محمدؐ بن عبداللہ کا ذمہ اس چیز کے متعلق جو اس دستاویز میں لکھا جاتا ہے، بے شک ان کی وادی حرام ہے اور سب کی سب خدا کے لیے حرام کی گئی ہے وہاں کے جنگلی خاردار درخت، وہاں کا شکار، وہاں کا ظلم کرنا، چوری کرنا یا کوئی اور برائی کرنا (سب حرام ہیں)

اور اس وادی وَجّ پر ثقیف ہی کا سب سے زیادہ حق ہے ان کے طائف کو مفتوح نہیں کیا جائے گا اور نہ کوئی مسلمان وہاں جا کر ان کو وہاں سے نکال سکے گا، وہ اپنے شہر طائف میں یا اپنی وادی میں جو عمارت چاہیں گے، بنا سکیں گے۔ ان کو نہ فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جائے گا اور نہ ان سے (بزور) عُشر لیا جائے گا نہ زکوٰۃ۔
یہ مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہیں۔ مسلمانوں میں جہاں آنا جانا

چاہیں آجا سکیں گے ۔ وہ کسی کو قیدی بنائیں گے تو اس کے بارے میں خود ہی فیصلہ کر سکیں گے ان کو رہن کی ضمانت پر جو قرض وصول کرنا ہو اس پر سود نہیں لیا جائے گا اگر اس کے ادا کرنے کی مدت آجائے اور ادا نہ کیا جائے تو قرض کی رقم کا بڑھانا سود ہے اور اللہ سے برأت اور جو قرض رہن کی ضمانت پر آنے والے موسم عُکاظ کے بعد تک کے لیے ہو تو اس کا اصل راس المال عُکاظ میں ادا کر دیا جائے اور ثقیف کو ان کے کھاتوں میں ان کے قبول اسلام کے دن لوگوں سے جو وصول طلب دیون ہیں وہ ان کو ملیں گے ۔
اور ثقیف کو لوگوں سے جو امانت یا مال یا آدمی (لونڈی غلام) جیسے امانت رکھانے والے نے مال غنیمت میں پایا تھا یا کھویا تھا، وصول طلب ہو تو ضرور واپس کیا جائے گا ۔

اور ثقیف کے جو آدمی یا سامان (اب) موجود نہ ہوں تو ان کو بھی وہی تحفظ حاصل ہوگا جو حاضر الوقت کو ہے اور ان کا جو مال لیۃ (وادیٔ وَجّ کا ایک مقام) میں ہو تو اس کو بھی وہی تحفظ حاصل ہوگا جو وَجّ کے مال کو ہے ۔

اور ثقیف کا جو حلیف یا تجارتی معاملت دار ہو، اس کو بھی ثقیف ہی کے حقوق حاصل ہوں گے ۔

اور اگر ثقیف پر کوئی الزام لگانے والا الزام لگائے یا کوئی ظلم کرنے والا ان پر ظلم کرے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی خواہ مال کے متعلق ہو یا جان کے اور رسول اللہ اور تمام مسلمان ثقیف کی مدد اس شخص کے خلاف کریں گے جو ان پر ظلم کرے ۔

اور ثقیف کو جس شخص کا اپنے ہاں آنا پسند نہ ہوگا وہ ان کے ہاں نہ جا سکے گا اور بازار اور بیوپار گھروں کے صحنوں میں ہوگا ۔

ان کا امیر انہیں میں سے کوئی ہوا کرے گا، کوئی دوسرا نہیں بنو مالک پران کا اپنا امیر اور احلاف پر ان کا اپنا امیر ہوگا۔
اور ثقیف والے قریش کے جن تاکستانوں کو پانی فراہم کریں گے تو پانی فراہم کرنے والے کو پیداوار کا آدھا ملے گا۔
اور ان کے پاس جو اسیر ہو جسے اس کے مالک نے بیچ دیا ہو تو اسی کو اس کی بیع کا حق ہوگا اور جو بیچا نہ گیا ہو تو اس میں (فدیہ) چھ اونٹنیاں ہوں گی آدھوں آدھ تین سالہ اونٹنیاں اور دودھ پلائی عمدہ موٹی۔
اور جس نے معاملہ بیع کر کے کچھ خریدا ہو تو اس بیع کا اسی کو حق ہے"

حافظ ابن عبدالبرؒ اور بعض دوسرے علماء نے اس معاہدے کی کچھ شقوں کا متن مختلف صورت میں دیا ہے۔ بدکاری اور شراب خواری سے بچنے اور نماز کی پابندی جیسے احکام کو معاہدہ میں اندراج کا محتاج نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ ان میں کسی قسم کی رعایت ممکن ہی نہیں تھی۔ البتہ فوجی خدمت کے بارے میں (وقتی طور پر) ان کو رعایت اس لیے دی گئی کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔ ہر شخص پر واجب نہیں اور جب واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں روز کا کام نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں شق اس لیے شامل کی گئی کہ یہ سال کے بعد واجب ہوتی ہے۔ حضورؐ کو یقین تھا کہ جب ان لوگوں کے دلوں میں ایمان راسخ ہو جائے گا تو خود بخود ہی زکوٰۃ بھی ادا کریں گے اور جہاد کے لیے بھی نکلیں گے اور فی الواقع بعد میں ایسا ہی ہوا۔

وفدِ ثقیف نے مدینہ منورہ میں چند روز قیام کے بعد وطن کو مراجعت کا عزم کیا تو انہوں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے کوئی امام مقرر فرما دیجئے۔ آپؐ نے وفد کے ایک نوجوان رکن عثمانؓ بن ابی العاص کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: "یہ دانا آدمی ہے اور یہی تمہارا امیر اور امام ہوگا۔"

تمام اہلِ وفد نے حضورؐ کے ارشاد کے سامنے سر جھکا دیا۔ پھر آپؐ نے عثمانؓ بن ابی العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"نماز پڑھاتے وقت لوگوں کی حالت کا خیال رکھنا ان میں بوڑھے بچے، بیمار، کمزور اور کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔"

حضرت عثمانؓ وفدِ ثقیف کے سب سے کم عمر رکن تھے لیکن فہم و فراست، شوقِ تعلیم اور جوشِ ایمان کی بنا پر وہ سب اہلِ وفد پر فائق تھے۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر وفد سے الگ ہو کر سب سے پہلے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری دی تھی اور قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا تھا۔ وفد کے دوسرے اکابر تو مختلف مسائل کے بارے میں حضورؐ سے گفتگو کرتے رہے اور وہ ان سے چھپ کر پہلے سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اور پھر حضرت اُبیؓ بن کعب سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کا علمی شوق دیکھا تو فرمایا:

"یہ لڑکا تفقہ فی الدین اور تعلیم قرآن کا بہت مشتاق ہے۔"

حضور (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو علم ہو گیا تھا کہ یہ جوہرِ قابل ہے اسی لیے آپؐ نے انہیں بنو ثقیف کی امارت و امامت کے لیے منتخب فرمایا۔

وفدِ ثقیف حضورؐ سے رخصت ہو کر طائف پہنچا تو بیشتر بنو ثقیف اور ان کے احلاف حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "الاِصابہ" میں لکھا ہے کہ کچھ عرصہ بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کر لیا ہو۔

وفد کی روانگی کے چند دن بعد حضورؐ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت ابوسفیانؓ (اور ایک روایت کے مطابق حضرت خالدؓ بن ولید کو بھی) طائف بھیجا کہ لات اور اس کے معبد کو برباد کر دیں۔ اہلِ طائف میں سے اکثر مسلمان ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کے دل سے "لات" کی ہیبت نہ گئی تھی۔ طبری

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقفی عورتوں کے دلوں سے کفر و شرک کا زنگ دُور ہونے میں کافی وقت لگا۔

حضرت مغیرہؓ نے بُت کدہ کو گرانے کا آغاز کیا تو عورتیں روتی ہوئی ننگے سر گھروں سے نکل آئیں اور یہ اشعار پڑھ کر اپنے مردوں کو ملامت کرنے لگیں۔

الا ابکین دفاع — لوگوں پر روکہ بزدلوں نے
اسلمها الرضاع — اپنے بُتوں کو دشمنوں کے
الم یحسنوا المصاع — حوالے کر دیا اور ان سے معرکہ آرا نہ ہوئے

حضرت مغیرہؓ نے پہلے لات کے بُت کو توڑا پھر بُت کدہ کی دیواروں پر چڑھ گئے اور انہیں گرانا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھیوں نے بھی ان کی امداد کی اور سب نے مل کر نہ صرف عمارت کا ایک ایک پتھر گرا دیا بلکہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ بُت کدہ کی بربادی کے بعد اہل طائف کے دلوں میں توحید کی بنیاد مستحکم ہوگئی اور وہ اسلام کے بازوئے شمشیر زن بن گئے۔

سنہ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کا موقع آیا تو تمام بنو ثقیف نے بڑے ذوق و شوق سے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اس وقت وہ راہِ حق کے جانباز سپاہی بن چکے تھے اور زکوٰۃ و عشر کی ادائیگی کو بھی خوشدلی سے قبول کر چکے تھے۔

سنہ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند نشین خلافت ہوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد (ردّہ) کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ان شعلوں کی حرارت کا اثر طائف تک پہنچا تو حضرت عثمانؓ بن ابی العاص (امیرِ بنی ثقیف) بے چین ہو گئے انہوں نے تمام بنو ثقیف کو جمع کیا اور ان کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں فرمایا کہ:

"اے ثقیف کے لوگو! تم سبقت فی الاسلام سے محروم رہے اور

یہ نعمت اس وقت حاصل کی جب عرب کے دوسرے سب قبائل
اس سے بہرہ یاب ہو چکے تھے۔ اس دیر کی تلافی اس نازک
گھڑی میں تم دین حق پر ثابت قدم رہ کر کر سکتے ہو۔ تمہیں یہ
زیب نہیں دیتا کہ گمراہی کے اس طوفان کا اثر قبول کرو اور شرف
ایمان کو کھو بیٹھو۔ دیکھنا اس وقت تمہارے قدم ہرگز نہ
ڈگمگانے پائیں۔"

حضرت عثمانؓ کی پُر اثر تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ طائف پر ارتداد کے امڈتے ہوئے بادل آناً فاناً چھٹ گئے اور بنو ثقیف نے فتنۂ ارتداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ابنِ جریر طبری کا بیان ہے کہ فتنۂ ارتداد کے دوران میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو حکم بھیجا کہ اپنے علاقے کے ہر مخلاف (تعلقے) سے مجاہدین بھیجیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے ہر مخلاف کو بیس بیس مجاہدین بھیجنے کا پابند کیا اور ان کے حکم کی بلا چون وچرا تعمیل ہوئی بلکہ بہت سے ثقفیوں نے مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے بخوشی اپنی خدمات پیش کیں۔

اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا اور مجاہدین اسلام کا سیلِ رواں ایران اور شام کی طرف بڑھا تو بنو ثقیف نے بھی دوسرے عرب قبائل کے پہلو بہ پہلو جہاد فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت و بسالت کی دھاک بٹھا دی۔ بنو ثقیف کے جن فرزندوں نے تاریخ اسلام میں خاص شہرت حاصل کی ان میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت عروہؓ بن مسعود، حضرت عثمانؓ بن ابی العاص، حضرت ابو محجنؓ، ابو عبیدؓ بن مسعود، مغیرہ بن ابی العاص، حکم بن ابی العاص، مختار بن ابی عبید، حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا شمار مدبرینِ عرب میں ہوتا ہے۔ عروہؓ بن مسعود نے اللہ کا نام بلند کرنے کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص نے عہدِ فاروقی میں مغربی ہند کے ساحلوں پر اولین بحری مہم بھیجی

اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں اصطخر، توج، دراب جرد، سابور وغیرہ کو فتح کیا۔ ان کے بھائیوں حکمؓ اور مغیرہؓ نے دیبل اور بھڑوچ کو مسخّر کرنے کے علاوہ فارس کے کئی معرکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اَبُو مِحجَن ثقفیؓ نے ایران کی جنگوں میں بڑا نام پیدا کیا اور جنگِ قادِسیّہ میں ایسی عدیم المثال شجاعت دکھائی کہ اس فیصلہ کُن معرکے کے بطلِ خاص ٹھہرائے گئے۔ حضرت ابو عبیدؓ ثقفی وہی مردِ مجاہد ہیں جنہوں نے حضرت عُمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوتِ جہاد پر اس وقت لبیّک کہا جب دوسرے لوگ ایرانی فوجوں کا سامنا کرنے میں متذبذب تھے۔ حضرت عمرِ فاروقؓ ان کے جوشِ ایمان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ابو عبیدؓ کو (صحابی نہ ہونے کے باوجود) ایک ایسے لشکر پر امیر مقرر کیا جس میں صحابۂ کرامؓ کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔ مختار ثقفی جس نے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں کو چُن چُن کر کیفرِ کردار تک پہنچایا، حضرت ابو عبیدؓ ہی کا بیٹا تھا۔ حجاج بن یوسف اگرچہ تاریخ میں ایک سفّاک حاکم کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن اس کی فتوحات اور قرآنِ کریم کے الفاظ پر نقطے اور اعراب لگانے کی خدمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بھتیجے محمّد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے سندھ فتح کیا اور اس طرح دادِ حکمرانی دی کہ سندھی غیر مسلم اس کے بعد اس کا بُت بنا کر پوجنے لگے۔

"اردو دائرۂ معارف اسلامیہ" میں ہے کہ حضرت عمروؓ بن العاص نے وَجّ سے تین میل کے فاصلے پر وَھط میں ایک بہت بڑا تاکستان لگایا اور پھر اسے وقف علی الاولاد کر دیا۔ امیر معاویہؓ نے طائف کے مضافات میں ایک بڑا تالاب بنوایا جس کا کتبہ (۵۸ھ ہجری) عربی زبان کے قدیم ترین کتبوں میں شمار ہوتا ہے۔"

آج کل طائف سعودی مملکت کے بڑے ترقی یافتہ شہروں میں شمار ہوتا

ہے۔ اس کی عمارتیں نہایت شاندار ہیں اور آبادی پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے جس کا ایک بڑا حصہ بنو ثقیف پر مشتمل ہے۔ شہر میں ہوائی اڈے، ٹیلیفون، ڈاک تار، ہسپتال اور دوسری ہر قسم کی جدید سہولتیں موجود ہیں۔ اس کا ہسپتال "مستشفی الملک الفیصل" تو اتنا شاندار ہے کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ہسپتالوں سے لگا کھاتا ہے۔ عہد رسالت کے متعدد آثار بھی اب تک محفوظ ہیں۔ ان میں ترکی دور کی موجودہ فصیل کے باہر محاصرۂ طائف کے شہداء کی قبریں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یہ وہی مردانِ حق ہیں جنہوں نے اپنی جانیں محض اس لیے قربان کیں کہ طائف کفر و شرک کی وادیٔ ظلمت سے نکل کر اسلام کی وادیٔ نور و نکہت میں آ جائے۔ ان کا خون رنگ لایا، جلد ہی افق طائف سے کفر و شرک کے سیاہ بادل چھٹ گئے اور مکۂ معظمہ کا یہ توام شہر خدا کے نور سے جگمگا اٹھا اور انشاء اللہ ابد تک جگمگاتا رہے گا۔

طبقۂ نسواں کے محسنِ اعظم

صلی اللہ علیہ وسلم

انسانی تمدن کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عورت کو دُنیا کی حقیر ترین مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کے کوئی حقوق تھے اور نہ معاشرے میں اس کی کوئی عزت تھی۔ اسے کوئی آئینی اور عمرانی حیثیت مطلق حاصل نہ تھی۔ عیسائی گناہ اور عورت کو ایک ہی چیز قرار دیتے تھے۔ یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ بعض خاص حالات میں عورتوں کو گھروں سے نکال دیا کرتے تھے۔ رومی تہذیب میں عورت کی حیثیت ایک غلام کی تھی اور اس پر ہر قسم کی سختی کرنا جائز تھا۔ ایران میں مزدک نے عورت کو مشترکہ ملکیت قرار دے دیا تھا۔ ہندوستان کے لوگ عورت کو اپنی روحانی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور اس سے نہایت ذلت آمیز سلوک کرتے تھے۔ عورت مجبور تھی کہ اس کا خاوند مر جائے تو وہ اس کے ساتھ ستی ہو جائے یعنی زندہ جل جائے مگر عورت کے مر جانے پر مرد بلا روک ٹوک دوسری شادی کر سکتا تھا بلکہ جتنی چاہے شادیاں کرنے کا حق رکھتا تھا۔ عرب میں عورت کو جوتی کی نوک کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ مرد جتنی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا تھا۔ کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو اسے سخت ذلت اور ننگ و عار کا باعث سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ بعض سنگدل بیٹیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے۔ قرآنِ حکیم کی سورۃ النحل میں ان لوگوں کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے:

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔"

کہ اس بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو باقی رکھے یا اسے کہیں لے جا کر مٹی میں دبا دے۔"

دختر کشی کے اس ظالمانہ اور وحشیانہ رواج کا نقشہ مولانا حالیؒ نے "مسدس حالی" میں یوں کھینچا ہے:

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر — تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور — کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں مردوں کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ جتنی عورتوں سے چاہیں شادی کر لیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کی بیویوں اور لونڈیوں کی تعداد بیسیوں تک پہنچ جاتی تھی۔ کسی عورت کو چھوڑنا جوتی بدلنے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ باپ کے فوت ہو جانے کے بعد سوتیلی مائیں سوتیلے بیٹوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ وہ ان کو لونڈیوں کی طرح فروخت کر دیتے تھے یا اپنے گھر میں ڈال لیتے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ "خدا کی قسم ہم زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں نازل کیا جو کچھ کہ نازل کیا اور مقرر فرمایا جو کچھ کہ مقرر فرمایا۔"

مختصر یہ کہ عجم ہو یا عرب، عورت ہر جگہ اپنے جائز معاشرتی، اخلاقی، تمدنی اور معاشی حقوق سے یکسر محروم تھی اور ماں، بہن، بیٹی یا بیوی کی حیثیت سے وہ جس حسنِ سلوک اور احترام کی مستحق تھی، دنیا کی کسی قوم میں اس کا تصور تک نہیں تھا ——— عورت ذات کے یہی مظلومانہ لیل و نہار تھے کہ کوہ فاران کی چوٹیوں سے خورشید رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا طلوع ہوا اور یہ عالم رنگ و بو اللہ کے نور سے جگمگا اٹھا۔ اللہ تعالیٰ نے

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنایا اس لیے بنی نوع انسان کا کوئی بھی طبقہ آپؐ کی رحمت و رافت سے محروم نہ رہا۔ رسول رحیم وکریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طبقۂ نسواں کو ذلت اور پستی کی گہرائیوں سے نکال کر عزت و شرف اور احترام و وقار کے اتنے بلند مرتبے پر فائز کیا کہ اس کے ساتھ حسن سلوک اور اس کا احترام، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور فلاح دارین کا باعث ٹھہرا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الٰہی کی روشنی میں طبقۂ نسواں کو جو حقوق عطا فرمائے اور ان کی ہر شخصی حیثیت میں ان کو جو مقام دیا، دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

انسانی معاشرے میں عورت کی چار اہم حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک ماں ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک بیٹی ہے۔ تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک بیوی ہے۔ چوتھی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک بہن ہے۔ آئیے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے یا بالفاظِ دیگر اللہ اور رسولؐ نے عورت ذات کو کیا مقام دیا ہے۔

عورت بحیثیت ماں

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، ان کی تعظیم و تکریم اور معروف میں ان کی اطاعت کے جو تاکیدی احکام دیئے ہیں، اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ سورۃ البقرہ، سورۃ النساء، سورۃ الانعام، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ لقمان، سورۃ العنکبوت اور سورۃ الاحقاف میں یہ احکام مختلف اسالیب میں ملتے ہیں۔ سورۃ لقمان میں جو حکم ہے اس کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماں کا حق باپ کے حق پر فائق ہے یہی بات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی واضح ہوتی

ہے۔ اس سلسلے میں چند مستند احادیثِ نبوی ملاحظہ ہوں:

○ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے دریافت کیا کہ مجھ پر خدمت اور حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، تمہاری ماں کا، میں پھر کہتا ہوں تمہاری ماں کا، میں پھر کہتا ہوں تمہاری ماں کا، اس کے بعد تمہارے باپ کا حق ہے۔

○ معاویہ بن جاہمہؓ سے روایت ہے کہ میرے والد جاہمہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ارادہ جہاد میں جانے کا ہے اور میں آپؐ کی خدمت میں مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپؐ نے ان سے پوچھا، کیا تمہاری ماں ہے؟ انہوں نے عرض کیا، جی ہاں ہے۔ آپؐ نے فرمایا، تو پھر اسی کے پاس اور اسی کی خدمت میں رہو۔ اُس کے قدموں میں تمہاری جنت ہے۔

(مُسندِ احمد، سُنَن نسائی)

○ حضرت مغیرہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا، بلاشبہ اللہ نے تم پر اپنی ماؤں کی نافرمانی اور دُختر کُشی حرام کردی ہے۔

(صحیح بخاری۔ صحیح مسلم)

○ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں ہجرت اور جہاد پر آپؐ کی بیعت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر و ثواب چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، تیرے والدین میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟ اس نے کہا، دونوں ہی زندہ ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، کیا تم اللہ تعالیٰ سے اجر چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا، جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، پھر اپنے والدین کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرو اور ان کی خدمت کرو۔

(صحیح مسلم)

○ حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، خاک آلودہ ہو ناک اس کی (یعنی وہ ذلیل اور رسوا ہو) یہ بات آپؐ نے تین مرتبہ فرمائی۔ آپؐ سے پوچھا گیا، یارسول اللہ! وہ کون؟ آپؐ نے فرمایا، وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا یا ان میں سے کسی ایک ہی کو۔ پھر (ان کی خدمت اور اطاعت کرکے) بہشت میں داخل نہ ہوا۔ (صحیح مسلم)

○ حضرت اسماءؓ بنتِ ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ میری والدہ (جو مشرکہ تھی) صلح (حدیبیہ) کے بعد (مکہ سے مدینہ) آئی۔ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا، یارسولؐ اللہ! میری والدہ میرے پاس آئی ہے اور وہ اسلام سے بیزار ہے کیا میں اس سے (اچھا) سلوک کروں؟

آپؐ نے فرمایا، ہاں اس سے (اچھا) سلوک کر۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

○ حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آیا اور کہا کہ میری والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ وہ کوئی وصیت نہ کر پائی۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ بات کرتی تو صدقہ کرنے کو کہتی، اب اگر میں اس کے لیے صدقہ کر دوں تو کیا اس کا اجر اس کو ملے گا؟

آپؐ نے فرمایا، ہاں اب تمہارے صدقہ کرنے سے اس کو ثواب ملے گا۔

(صحیح مسلم)

○ مشہور صحابی سید الخزرج حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی والدہ حضرت عمرہ بنتِ مسعود رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہا نے وفات پائی تو آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشاد کے مطابق انہوں نے والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے پانی کی ایک سبیل قائم کی (بروایت دیگر ایک کنواں کھدوایا) اس نے "سقایہ آلِ سعد" کے نام سے شہرت پائی۔ (مسند احمد)

اُسوۂ نبوی ﷺ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آپ کے بچپن ہی میں وفات پا گئی تھیں آپ کی ولادت باسعادت کے بعد چند دن بی بی ثویبہؓ نے آپ کو دودھ پلایا۔ پھر بی بی حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تقریباً پانچ سال تک آپ کو دودھ پلانے اور پالنے کا شرف حاصل ہوا۔ والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد ننھے حضورؐ کی نگہداشت اور خدمت کی عزت حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حاصل ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تینوں بیبیوں کا ہمیشہ بہت اکرام اور لحاظ رہا۔ بی بی ثویبہؓ نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے مدینہ میں اقامت اختیار نہ کر سکیں۔ ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ان کے لیے خرچ اور کپڑا بھیجا کرتے تھے۔

بی بی حلیمہؓ کے بارے میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو تین مرتبہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ نے ان کی بیحد تعظیم و تکریم کی۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے شادی کے بعد ایک دفعہ حضرت حلیمہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے علاقے میں قحط سالی کی شکایت کی۔ حضورؐ نے ان کو چالیس بکریاں اور سامان سے لدا ہوا ایک اونٹ عطا فرمایا۔

طبقات ابن سعد ہی کی ایک اور روایت میں محمدؒ بن منکدر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے بچپن میں آپؐ کو دودھ پلایا تھا۔ اسے دیکھ کر حضورؐ "میری ماں" "میری ماں" کہتے ہوئے اٹھے اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا۔

علامہ سہیلیؒ نے "روض الانف" میں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ

حضرت حلیمہؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ نے ان کو کچھ اونٹنیاں مرحمت کیں جن کو لے کر وہ دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔

حضرت اُمِّ ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بہت طویل زندگی پائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ساری حیاتِ اطہر ان کے سامنے گزری۔ یہاں تک کہ وہ آپؐ کی رحلت کے بعد بھی کافی عرصہ تک حیات رہیں۔ حضرت اُمِّ ایمنؓ حضورؐ کو وراثۃً بطور کنیز ملی تھیں لیکن آپؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ انہوں نے حضورؐ کو گود میں کھلایا تھا اس لیے آپ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میری والدہ کے بعد اُمِّ ایمن میری ماں ہیں چنانچہ آپؐ انہیں اُمّی کہہ کر بلایا کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کی مالی مدد بھی فرماتے رہتے تھے۔ اگر کبھی وہ اپنی کوئی حاجت لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں تو آپؐ ان کی وہ حاجت فوراً پوری کر دیتے تھے۔

(طبقات ابن سعد۔ صحیح مسلم وغیرہ)

عورت بحیثیت بیوی

میاں بیوی کا تعلق ایک باہمی معاہدہ یعنی نکاح سے قائم ہوتا ہے۔ نکاح کا مقصد اور مطلب یہ ہے کہ وہ گواہوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے نام پر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونے کا عہد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شوہر اور بیوی دونوں کے کچھ فرائض اور حقوق مقرر فرمائے ہیں اور دونوں کو ان کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے (دیکھیے سُورۃ بقرہ، سُورۃ النّسآء، سُورۃ الرّوم، سُورۃ الاحزاب، سورۃ النور)۔ چونکہ عورت کی خوشگوار اور پُرسکون زندگی کا دارومدار اکثر بیشتر شوہر کے طرزِ عمل پر ہوتا ہے اس لیے مردوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النّسآء۔ آیۃ ۱۹)

(یعنی ان (عورتوں) کے ساتھ حُسنِ سلوک کی (بھلے طریقہ کی) زندگی بسر کرو)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہلِ خانہ (بیوی یا بیویوں) کے ساتھ حسنِ سلوک کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں آپؐ کے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے:

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی ایمان والا شوہر اپنی مومنہ بیوی سے نفرت نہیں کرتا۔ اگر اس کی کوئی عادت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی۔ (صحیح مسلم)

○ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص کامل الایمان ہے۔ جس کا اخلاقی برتاؤ سب کے ساتھ بہت اچھا ہو اور (خاص کر) بیوی کے ساتھ جس کا سلوک لطف و محبّت کا ہو (جامع ترمذی)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمانوں میں ان آدمیوں کا ایمان زیادہ کامل ہے جن کے اخلاق بہتر ہیں اور تم میں اچھے اور خیر کے زیادہ حامل وہ آدمی ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں زیادہ اچھے ہیں۔ (جامع ترمذی)

○ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے بہتر ہے۔ (جامع ترمذی، ابن ماجہ)

○ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ آدمی تم میں زیادہ اچھا اور بھلا ہے جو اپنے گھر والوں (بیوی یا بیویوں) کے حق میں اچھا ہو —— اور میں اپنے گھر والوں (اپنی بیویوں) کے حق میں اچھا ہوں۔ (جامع ترمذی)

مسندِ دارمی اور سُننِ ابنِ ماجہ میں یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

سے مروی ہے۔

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، لوگو بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں میری وصیت مانو (یعنی ان کے ساتھ نرمی اور لطف و محبت کا برتاؤ رکھو) ان کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی کے اوپر کے حصّے میں زیادہ کجی ہوتی ہے اگر تم اس کجی کو (بزور) بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر اسے یونہی اپنے حال پر چھوڑ دوگے تو پھر وہ ہمیشہ ویسی ہی ٹیڑھی رہے گی اس لیے بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی میری وصیّت کو قبول کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بیوہ خواتین کے بارے میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ بیوہ عورت اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا (یعنی ان کی خبر گیری کرنے والا) مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔ (عن ابوہریرہؓ)

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ازدواجی زندگی کا جو نمونہ اُمّت کے سامنے پیش فرمایا، اس کی تفصیل "رسولِ رحمت کی گھریلو زندگی" کے عنوان کے تحت بیان کی گئی ہے۔

عورت بحیثیت بیٹی

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عرب میں بیٹی کی پیدائش کو ذلّت اور ننگ و عار کا باعث سمجھا جاتا تھا اور اس سے نہایت سفّاکانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ قرآنِ پاک کی کئی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس سفّاکانہ روش کی سخت

مذمت کی ہے، اسے بہت بڑی خطا قرار دیا ہے اور لوگوں کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ وہ مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد (اناث) کو قتل کریں۔
(دیکھیے سُورۃ الانعام، سورۃ النحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ الزخرف، سُورۃ التکویر)

رحمت عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بیٹیوں کو نہ صرف زندہ درگور بننے سے منع فرمایا بلکہ اولادِ نرینہ کو ان پر ترجیح دینے سے بھی روکا اور بیٹیوں کی عمدہ طریقے سے پرورش کو حصولِ جنّت کا ذریعہ بتایا۔

اس سلسلے میں آپؐ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

○ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، جس کے ہاں بیٹی پیدا ہو، پس وہ نہ اسے زندہ درگور کرے اور نہ ذلت کی حالت میں رکھے اور نہ اولادِ نرینہ کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنّت میں داخل کرے گا۔ (ابوداؤد)

○ حضرت انس رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جس نے دو لڑکیوں کی ان کے بالغ ہونے تک پرورش کی وہ اور میں قیامت کے روز اس طرح آئیں گے (آپؐ نے اپنی دو انگلیوں، انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر دکھایا)۔ (صحیح مسلم)

○ ابنِ عباس رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی اور انہیں تعلیم و تربیت دی اور ان کے ساتھ رحمت اور شفقت کا برتاؤ کیا یہاں تک کہ اللہ انہیں بے نیاز کر دے (یعنی ان کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے گھر پہنچ جائیں) تو ایسے شخص کے لیے اللہ نے جنّت واجب کر دی اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ اگر دو ہی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا، دو لڑکیوں کی سرپرستی پر بھی اجر ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اگر لوگ ایک لڑکی کے بارے

پوچھتے تو آپؐ ایک کے بارے میں بھی یہی شہادت دیتے۔
(مشکوٰۃ شریف)

○ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ مجھ سے اس نے سوال کیا۔ اس وقت میرے پاس صرف ایک کھجور تھی، وہی میں نے اس کو دے دی۔ اس نے اس کھجور کو دو ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں میں تقسیم کر دیا اور خود کچھ نہ کھایا، پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے یہ واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا، جو شخص لڑکیوں کے ساتھ آزمائش میں مبتلا کیا جائے (یعنی اس کے ہاں لڑکیاں ہی پیدا ہوں) اور پھر وہ ان کے ساتھ احسان و سلوک کرے تو یہ بیٹیاں اس کے لیے دوزخ کی آگ سے ڈھال بن جائیں گی۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹیاں عطا کی تھیں۔ آپؐ کو ان سب سے بے حد پیار اور لگاؤ تھا۔ نہایت محبّت اور شفقت سے ان کی پرورش کی اور چاروں کو اچھے گھروں میں بیاہ دیا۔ اس کی تفصیل "اولاد سے محبّت" کے عنوان کے تحت بیان کی گئی ہے۔

عورت بحیثیت بہن

اوپر عورت کی جو تین حیثیتیں بیان کی گئی ہیں، بہن ان میں سے کسی ایک زمرے میں ضرور آجاتی ہے۔ ویسے ایک بھائی کو خاص طور پر بھی اپنی بہن کے ساتھ حُسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ پیچھے ایک حدیث

میں بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کا ذکر بھی آچکا ہے۔ دو حدیثیں اور ملاحظہ ہوں:

○ کلیب بن منفعہ سے روایت ہے کہ میرے دادا نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ! میں کس کے ساتھ حُسنِ سلوک کروں؟ آپؐ نے فرمایا، اپنی ماں، بہن، بھائی اور اپنے غلام کے ساتھ جو تم سے قریب ہو، یہ واجب حق ہے اور قرابت داروں کے حقوق کی حق شناسی کرو۔ (ادب المفرد، بخاریؒ)

○ حضرت مقدام بن معدی کرب رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنہُ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو فرماتے سُنا، اللہ تعالیٰ تمہیں ماؤں کے ساتھ (حُسنِ سلوک کا) حکم دیتا ہے، پھر تمہارے باپوں کے بارے میں ہدایت فرماتا ہے، پھر تمہیں قریب سے قریب تر کے بارے میں ہدایت فرماتا ہے۔

(ادب المفرد، بخاری)

قریب سے قریب تر میں بہن بھائی لازماً آجاتے ہیں۔

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کوئی حقیقی (سگی) بہن نہیں تھی البتہ قریب اور دُور کے رشتوں سے آپؐ کی کئی بہنیں تھیں۔ ان کے ساتھ آپؐ کے حُسنِ سلوک کی چند مثالیں "قرابت داروں سے حُسنِ سلوک" (صلہ رحمی) کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

طبقۂ نسواں پر اللہ اور رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزید احسانات

اوپر ہم نے صرف چند مثالیں دی ہیں جن میں مردوں کو (باپ بیٹے شوہر اور بھائی) کی حیثیت سے خواتین (بیٹی، ماں، بیوی اور بہن) کے ساتھ حُسنِ سلوک کا پابند کیا گیا ہے۔ اب ہم چند ایسے حُقوق کا ذکر کرتے ہیں۔ جو

خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی طرف سے عورت ذات کو عطا کیے گئے۔

① عورت کو وراثت پانے کے وسیع حقوق دیئے گئے۔ وہ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے (اور بعض صورتوں میں دوسرے قریبی رشتہ داروں سے) وراثت پانے کی حقدار ہے۔ نیز وہ شوہر سے شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً مہر پانے کی بھی حقدار ہے۔

② عورت (خواہ وہ کتنی ہی مالدار ہو) خاوند سے ہر حال میں نفقہ پانے کی حقدار ہے۔

③ عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا گیا اور شادی کے لیے اس کی رضامندی ضروری قرار دی گئی۔ اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اس کا نکاح نہیں کرسکتا۔

④ ناکارہ، ظالم اور ناپسندیدہ خاوند سے نجات حاصل کرنے کے لیے عورت کو خلع کا حق دیا گیا۔

⑤ فوجداری اور دیوانی مقدمات میں، اور جان مال عزّت اور آبرو کے تحفظ میں عورت کو مرد کے برابر رکھا گیا۔

⑥ عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم کی نعمت حاصل کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔

⑦ عورت کے لیے روحانیت اور روحانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کے راستے کھول دیئے گئے۔ اس کی عبادت کا اجر و ثواب مردوں کی عبادت کے اجر و ثواب کے برابر قرار دیا گیا۔

⑧ بیوہ، مطلّقہ یا فسخ نکاح والی عورتوں کو غیر مشروط طور پر نکاحِ ثانی کا حق دیا گیا۔

⑨ وراثت اور مہر سے حاصل شدہ رقم کی عورت کو (بلا شرکتِ غیرے) مالک قرار دیا گیا۔ اگر وہ اپنا سرمایہ تجارت میں لگا کر یا محنت مزدوری کر کے کچھ حاصل کرتی ہے تو وہ بھی اس کی ملکیت قرار دیا گیا۔

⑩ عورت کا عمومی دائرۂ کار وہی مقرر کیا گیا جو اس کی جسمانی ساخت اور اس کی فطری صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے خواتین کو جو حقوق دیئے ہیں اور عزت و احترام کا جو مقام دیا ہے، انصاف پسند غیر مسلم دانشور بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

مشہور غیر مسلم دانشور لے آر وادیا نے اپنی کتاب ETHICS OF FEMINISM میں اسلام میں خواتین کے حقوق و احترام کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

"پیغمبرؐ نے عورتوں کو اس وقار و عظمت سے سرفراز کیا جس کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے، کم ہے۔ وہ ذاتی ملکیت کا حق رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ شادی کے موقع پر خاوند پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ بصورتِ مہر عورت کو حسبِ استطاعت روپیہ ادا کرے جو اس کی ملکیت ہوگا۔ اس کے بعد ازدواجی زندگی میں وہ جو کچھ بھی کمائے اس کی خود مالک ہے۔ باپ، خاوند، اور بچوں کی جائداد میں اس کا حصّہ مقرر ہے جس کو وہ قانوناً لے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ناقابلِ اصلاح حالت میں خاوند سے خُلع لینے کا حق رکھتی ہے۔ غرضیکہ ایک مسلمان عورت عزت و احترام کا بہت بلند مقام رکھتی ہے بیوی اور ماں دونوں حیثیتوں سے افرادِ خاندان پر اس کا اثر غالب رہتا ہے۔"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ جہانبانی

حضور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم صاحبِ قابَ قوسین اور صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس تمام کمالات و صفات کی جامع ہے ؎

حُسنِ یوسفؑ، دمِ عیسٰیؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

حضورؐ کی ذاتِ اطہر، انسانیت اور عبدیت کا منتہائے کمال ہے اور آپؐ سے بے نیاز ہو کر مغفرت اور نجات کی امید کرنا محض خام خیالی بلکہ گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں آپ کو "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْن" (سارے جہانوں کے لیے رحمت) رَءُوْفٌ رَّحِيْم (نہایت شفقت کرنے والا مہربان) سراجِ منیر (روشن چراغ) بشیر (خوشخبری دینے والا) اور نذیر (اللہ سے ڈرانے والا) کہہ کر پکارا ہے اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو بنی نوعِ انسان کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ لاریب حضورؐ کا اسوۂ حسنہ قرآنِ کریم کی عملی تفسیر ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔ وہ ایک مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو کا داخلی نگران اور خارجی معیار ہے۔ خلوت ہو یا جلوت، گھر ہو یا میدان، تجارت ہو یا سیاست، امن ہو یا جنگ، تنگ دستی ہو یا آسودہ حالی، سفر ہو یا قیام، غم ہو یا خوشی، ہر حالت میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہمارے لیے بہترین لائحۂ عمل موجود ہے۔

جہاں تک رسالت اور نبوّت کا تعلق ہے تو آپؐ صرف رسول اور نبی ہی نہیں تھے بلکہ خاتم النبیین اور سیّد المرسلین تھے۔ آپؐ صرف اہلِ عرب

ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت وقتی یا کسی خاص زمانے کے لیے نہیں تھی بلکہ دائمی اور ابدالآباد تک کے لیے تھی۔ آپؐ جس دین کے داعی تھے وہ روح اور جسم دونوں پر حاوی تھا اور دنیا و آخرت دونوں میں حسنات کا ضامن تھا۔ اس میں عبادت کے ساتھ سیاست اور درویشی کے ساتھ جہانبانی لازم و ملزوم تھی محسنِ انسانیت اور رہبر کامل ہونے کی حیثیت سے حضورؐ نے جہاں معاشرہ معیشت اور تہذیب و تمدن کے گیسو سنوارے وہاں تدبیر و سیاست کو بھی اپنے ناخنِ حکمت سے سلجھایا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مکہ سے ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں آپؐ کو ایک اسلامی حکومت کے مؤسس اور سربراہ مملکت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی، لیکن مستشرقین کا یہ کہنا کہ آپؐ مکہ میں تو فی الواقع پیغمبر تھے لیکن مدینہ جا کر بادشاہ ہو گئے، بدیہی طور پر غلط ہے۔ ان کوتاہ بینوں کو صرف یہ نظر آیا کہ حضورؐ جنگ کے میدانوں میں فوجوں کی قیادت فرما رہے ہیں، بادشاہوں اور حاکموں کے نام فرمان لکھوا رہے ہیں۔ عُمّال و ولاۃ اور دعاۃ و محصّلین کا تقرر فرما رہے ہیں۔ حکومتوں کے سُفرا اور قوموں کے وفود کو شرفِ باریابی بخش رہے ہیں۔ لیکن ان کی نظر اس حقیقت پر نہ گئی کہ بھلا دنیا میں کوئی ایسا بادشاہ بھی ہوا ہے جو تخت و تاج، خدم و حشم، شان و شوکت، کرّ و فر، قصر و ایوان، مال و زر، حاجب و دربان اور پولیس و دفتر سے یکسر بے نیاز ہو، جس کی اقامت گاہ، پوشش، غذا اور معاشرت ایسی ہو جو محمد عربی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تھی، جس کی جہانبانی "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ" کے اصول کی آئینہ دار ہو، اور جس کے نزدیک حکومت اور امارت کا معیار یہ ہو:

"تمہارے بہترین حاکم اور امراء وہ ہیں جن سے تم محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت رکھتے ہیں۔ تم ان کے لیے دعائیں مانگتے

ہو اور وہ تمہارے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے عداوت رکھتے ہیں، تم ان پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں"۔
(صحیح مسلم عن عوفؓ بن مالک)

حضورؐ ایک وسیع و عریض مملکت کے سربراہ بھی تھے اور عساکرِ اسلامی کے سپریم کمانڈر بھی، لیکن تمام مخلوقِ خدا آپؐ کے نزدیک خدا کا کنبہ تھی اور اس پر آپؐ کا سحابِ لطف و کرم ہر آن جھوم جھوم کر برستا رہتا تھا۔ آپؐ کے نزدیک ایک مسلمان کی تعریف یہ تھی کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور جو اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی بات پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (صحیحین)

یہ لوگوں سے آپؐ کی بے پناہ محبّت، خیر خواہی اور ہمدردی ہی تھی کہ وہ آپؐ کو اپنی جان اور اولاد سے بڑھ کر محبوب سمجھتے تھے۔ لوگوں کی آپؐ سے محبّت اور عقیدت کی کیا کیفیّت تھی اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں :—

صحیحین میں حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر تھا کہ حضرت بلالؓ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کے وضو والا پانی لائے۔ تمام لوگ ان کی طرف دوڑ پڑے اور اس پانی سے جس کو جتنا بھی ملا اس نے اپنے چہرے پر مل لیا اور جس کو پانی نہ ملا اس نے پانی والے کے ہاتھ کی نمی ہی پر اکتفا کیا۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم باہر نکلے تو لوگوں نے آپؐ کے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے چہروں پر ملنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی آپؐ کے دستِ مبارک پکڑے اور اپنے چہرے پر رکھے۔

"صحیح مسلم" میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کو سر منڈاتے دیکھا حضورؐ کے صحابہؓ آپؐ کے

اردگرد کھڑے تھے۔ کوئی بال مبارک بھی گرتا تو وہ لپک کر اس کو پکڑ لیتے (اور اپنے پاس بطور تبرک محفوظ کر لیتے)۔

کتب سیر و احادیث میں بے شمار روایتیں ایسی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صحابیؓ ایسا نہ تھا جس کے دل میں حضورؐ پر اپنی جان نثار کرنے کا جذبہ موجزن نہ رہتا ہو۔ مکہ میں ایک مرتبہ یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مشرکین نے حضورؐ کو گرفتار کر لیا ہے یا آپؐ کو شہید کر دیا ہے۔ حضرت زبیرؓ بن العوام نے (جن کا عنفوانِ شباب تھا) یہ خبر سنی تو تڑپ اٹھے اور تلوار سونت کر حضورؐ کے کاشانۂ اقدس کی طرف دوڑ پڑے۔ وہاں پہنچ کر مہبطِ وحی و رسالت کو خیر و عافیت کے ساتھ دیکھا تو جان میں جان آئی۔ حضورؐ نے پوچھا:

"کیوں بھائی خیر تو ہے تم اس وقت شمشیرِ برہنہ سونت کر کیسے آ رہے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں میں نے سنا تھا آپؐ کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا ہے یا شاید آپؐ شہید کر دیئے گئے ہیں۔"

ارشاد ہوا: "اچھا اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو تم کیا کرتے؟"

عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! خدا کی قسم میں اہل مکہ سے لڑ مرتا۔"

(اسد الغابہ لابن اثیرؒ)

غزوۂ بدر پر روانہ ہونے سے پہلے حضورؐ نے لڑائی کے بارے میں صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا تو حضرت مقدادؓ بن الاسود نے کھڑے ہو کر بڑے جوش سے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! ہم وہ نہیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح کہہ دیں کہ تو اور تیرا رب جا کر لڑے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ ہم تو

کہتے ہیں چلیئے جدھر آپؐ کا رب آپؐ کو حکم دیتا ہے اُدھر چلیئے۔ اس اللہ کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں ہماری جان ہے (جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ ہم آپ کے دائیں لڑیں گے بائیں لڑیں گے، آگے لڑیں گے اور پیچھے لڑیں گے۔ واللہ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کرتی ہے آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔" (صحیح بخاری)

اسی موقع پر سیّد الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری نے اُٹھ کر یہ الفاظ کہے:

"یا رسولؐ اللہ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی رسالت کی تصدیق کی، آپؐ کی فرمانبرداری کا عہد کیا، پس جو بھی مرضی مبارک میں ہو، کیجیے۔ ربِ اکبر کی قسم جس نے آپؐ کو رسول بنا کر بھیجا، آپؐ ہمیں سمندر میں کودنے کا حکم دیں گے تو ہم کود جائیں گے۔ ہمارا ایک متنفس بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ انشاء اللہ آپ ہمیں میدان جنگ میں ثابت قدم پائیں گے۔ اللہ ہماری طرف سے آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔" (زرقانی)

غزوۂ اُحد میں جب مشرکین نے آپؐ پر ہجوم کر رکھا تھا آپؐ نے آواز دی، کون ہے جو ان بدبختوں کو میرے پاس سے ہٹا سکتا ہے۔ ایک انصاری قریب تھے فوراً آگے بڑھے اور کفار سے لڑتے ہوئے اپنی جان آپؐ پر قربان کر دی۔ اسی طرح کفار آپؐ پر بار بار حملہ کرتے اور آپؐ بار بار اپنے جاں نثاروں کو آواز دیتے، جس کے کان میں آواز پڑتی تھی وہ دیوانہ وار آگے بڑھ کر آپؐ پر اپنی جان قربان کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ سات انصاری یکے بعد دیگرے حضورؐ پر فدا ہو گئے۔ (سیرت النبیؐ)

حضرت ابو دجانہؓ کی کمر آپؐ کی حفاظت کرتے کرتے تیروں سے

چھلنی ہوگئی، حضرت طلحہؓ کا ہاتھ شل ہوگیا لیکن کسی مشرک کو حضورؐ کے نزدیک نہ آنے دیا۔ (حیات الصحابہ، طبقات ابنِ سعد)

غزوۂ بنو مصطلق کے موقع پر رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے شانِ رسالت میں گستاخانہ کلمات کہے تو اس کے فرزند عبداللہؓ نے (جو نہایت مخلص صحابی تھے) اٹھ کر عرض کیا، یارسول اللہ اجازت دیں تو میں اپنے ہاتھ سے اپنے باپ کا سر قلم کر دوں۔ آپؐ کی شانِ رحیمی کو یہ گوارا نہ ہوا تو انہوں نے مدینہ پہنچ کر باپ کا راستہ روک لیا اور کہا جب تک تم اپنے ذلیل ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز ہونے کا اقرار نہ کرو گے، مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ باپ کے راستے سے اس وقت ہٹے جب حضورؐ نے حکم دیا۔

ذیقعدہ ۶ھ ہجری میں بیعت رضوان سے پہلے عروہؓ بن مسعود ثقفی قریش کی طرف سے سفیر ہو کر حدیبیہ آئے۔ انہوں نے یہاں جو نظارہ دیکھا اسے قریشِ مکہ کے پاس واپس جا کر ان الفاظ میں بیان کیا۔

"برادرانِ قریش، میں دنیا کے بڑے بڑے فرمانرواؤں (قیصرِ روم، کسریٰ ایران، نجاشیٔ حبشہ) کے درباروں میں گیا ہوں، لیکن محمدؐ کے ساتھی جس طرح محمدؐ کے والہ و شیدا ہیں اور جس قدر ان کی تعظیم کرتے ہیں، میں نے کسی بھی بادشاہ کے دربار میں عقیدت و وارفتگی کا یہ منظر نہیں دیکھا۔ محمدؐ تھوکتے ہیں تو یہ لوگ اسے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اپنے جسم اور چہرے پر مل لیتے ہیں۔ محمدؐ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ مستعمل پانی کے ایک ایک قطرے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جیسے آپس میں لڑ پڑیں گے۔ محمدؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کی تعمیل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ ان کے سامنے کوئی شخص بلند آواز سے گفتگو نہیں کرتا اور نہ ان کی

طرف آنکھ بھر کر دیکھتا ہے۔" (صحیح بخاری)

ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کسی شاہ یا شہنشاہ کہلانے والے کو ایسی شانِ محبوبیت حاصل ہو سکتی ہے؟ لیکن سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو تقریباً بارہ لاکھ مربع میل پر محیط مملکت کے ہمہ مقتدر اور محبوبِ خلائق سربراہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بادشاہ یا شہنشاہ کہلانا مطلق گوارا نہ تھا۔ اگر آپؐ جاہ پسند ہوتے یا بادشاہ بننا چاہتے تو یہ موقع آپؐ کو مکہ میں بھی مل سکتا تھا۔ کیونکہ خود اہلِ مکہ نے آپؐ کو سیادت و حکمرانی کی پیش کش کی تھی، لیکن آپؐ نے اسے محض اس لیے ٹھکرا دیا کہ وہ لوگ اللہ کی بادشاہی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مقصد ایک عرب مملکت کا قیام نہ تھا، بلکہ اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھا اور وہ یہ کہ اللہ کا دین سربلند کیا جائے، کیونکہ اسی میں نوعِ انسان کی فلاح و نجات کا راز مضمر تھا۔ تمکن فی الارض (حکومت) اور سیاسی غلبہ تو احکامِ الٰہی پر عمل کرنے کا قدرتی نتیجہ اور حاصل تھا جس کا قرآنِ حکیم میں مومنوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ آپؐ کے نزدیک حکومت "امانت" کی حیثیت رکھتی تھی۔ (اِنَّھَا اَمَانَۃٌ۔ صحیح مسلم)

ایک مرتبہ ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تو آپؐ کو دیکھ کر اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آپؐ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

"گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں۔ ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔" (صحیح بخاری)

صحیحین میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بادشاہی کا دعویٰ کرنے والوں کو للکارے گا کہ اب کہاں ہو؟

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بے شرم انسان

وہ ہوگا جس کا نام (لقب) شہنشاہ ہوگا۔

صحیح مسلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد منسوب ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور خبیث وہ شخص ہوگا جس کا نام (لقب) شہنشاہ رکھا گیا، حالانکہ (حقیقی) بادشاہ صرف اللہ ہے۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دورانِ گفتگو میں کہہ دیا "جو اللہ چاہے، آپؐ چاہیں۔" آپؐ نے فرمایا "تم نے مجھے خدا کا شریک اور ہمسر بنا دیا، یوں کہو کہ جو اللہ تعالیٰ (تنہا) چاہے۔"

ایک صاحب کی کنیت "ابوالحکم" تھی، آپؐ نے سُنی تو اسے پسند نہ کیا اور فرمایا:

"حَکَم (فیصلے کرنے والا) تو اللہ کی ذات ہے اور دنیا جہان کے تمام مقدمات کا مرجع بھی وہی ہے۔"

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دکان سے پائجامہ خریدا، اٹھنے لگے تو دکاندار نے آپؐ کا دستِ مبارک چومنا چاہا، لیکن آپؐ نے اسے پسند نہ کیا اور دستِ مبارک پیچھے ہٹا کر فرمایا:

"یہ تو اہلِ عجم کا دستور ہے، میں بادشاہ نہیں ہوں، تم ہی میں سے ایک ہوں۔"

اس سے پہلے کہ ہم سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ حکمرانی پر گفتگو کریں یہاں آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے چند مناظر دکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ اس دَور کے واقعات ہیں جب آپؐ کو شروع میں اہلِ مدینہ اور بعد میں سارے اہلِ عرب پر دینی و دنیوی ہر قسم کی مکمل سیادت حاصل تھی اور آپؐ کے ایک معمولی اشارے سے بے شمار تلواریں میانوں سے باہر آسکتی تھیں، قدموں پر زر و جواہر کے ڈھیر لگ سکتے تھے۔ عالیشان

قصر و ایوان تعمیر ہو سکتے تھے، غلاموں اور خادموں کے پرے کے پرے حاضر ہو سکتے تھے، لیکن ان سب اختیارات کے باوجود آپؐ کی مساوات پسندی، انکسار، تواضع اور زہد و قناعت کی یہ کیفیت تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کے پاس سواری کے جانور بہت کم تھے۔ ہر تین آدمیوں کے درمیان ایک اونٹ تھا۔ اس پر لوگ باری باری سوار ہوتے اور پھر اتر کر پیدل چلنے والوں کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپؐ اونٹ پر تشریف رکھیں، پیدل چلنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔" حضورؐ نے فرمایا: "میں تم سے کم پیادہ پا نہیں چل سکتا اور نہ تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔" (طبقات ابن سعد)

ہجرت کے بعد، پہلے مسجد قبا، اور پھر مسجد نبوی تعمیر ہوئی تو حضورؐ نے ان کی تعمیر میں عام لوگوں کی طرح حصہ لیا۔ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ مل کر گارا ڈھوتے اور دیواریں اٹھاتے تھے۔ وہ بہتیرا عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! آپؐ رہنے دیں ہم خود کام کر لیں گے لیکن آپؐ فرماتے، نہیں میں تمہارے شانہ بشانہ اس کام میں حصہ لوں گا۔ اسی طرح جنگِ خندق کے موقع پر آپؐ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ مل کر خندق کھودتے تھے۔ جسمِ اطہر گرد و غبار سے اٹ جاتا تھا اور تھکن سے چُور چُور ہو جاتے تھے، لیکن اس حال میں بھی کام جاری رکھتے تھے، حالانکہ ادگرد سینکڑوں جاں نثار موجود رہتے تھے اور آپؐ سے بار بار کام چھوڑنے کی استدعا کرتے تھے۔ (بخاری)

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ پر تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک مقام پر بکری ذبح کرنے اور پکانے کی تجویز ہوئی۔ صحابہؓ نے آپس میں کام بانٹ لیے۔ ایک صحابیؓ نے کہا، میں اسے ذبح کروں گا۔ دوسرے نے کہا، میں اس کا گوشت بناؤں گا، تیسرے نے کہا میں اسے

پکاؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان آپؐ تشریف رکھیے ہم خود سب کام کرلیں گے۔"

آپؐ نے فرمایا: "مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں تم سے اپنے آپ کو ممتاز کردوں۔" (زرقانی)

ایک مرتبہ حضرت خبابؓ بن الارت مدینے سے دور ایک سریہ پر تشریف لے گئے۔ ان کے گھر میں اور کوئی مرد نہیں تھا اور عورتیں دودھ دوہنا نہیں جانتی تھیں۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ بہ نفسِ نفیس ہر روز حضرت خبابؓ کے گھر تشریف لے جاتے اور ان کے جانوروں کا دودھ دوہ دیا کرتے۔ (ابن سعد)

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی لونڈیاں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور عرض کرتیں یا رسول اللہ، ہمارا فلاں کام ہے۔ آپؐ اپنا کام کاج چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کے ساتھ جاکر ان کا کام کر دیتے۔ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کی ایک مخبوط الحواس عورت آپؐ کے پاس آئی اور آپؐ کا دستِ مبارک پکڑ کر کہا:

"محمدؐ مجھے تم سے کچھ کام ہے، میرے ساتھ چلو۔"

حضورؐ نے فرمایا: "جہاں کہو جاؤں گا۔"

وہ آپؐ کو ایک گلی میں لے گئی اور وہیں بیٹھ کر آپؐ کو اپنا کام بتایا۔ آپؐ نے اسی وقت وہ کام کر دیا۔ (صحیح مسلم)

ایک دفعہ ایک بدو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس وقت آپؐ موٹے کنارے کی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے، اس نے چادر کے گوشے کو پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ چادر کا کنارہ آپؐ کی گردن مبارک میں کھب گیا اور اس میں نشان پڑ گئے۔ پھر اس نے کہا، "محمدؐ میرے یہ

دو اونٹ ہیں، ان پر لادنے کے لیے مجھے سامان دو، کیونکہ تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال تحمل سے فرمایا، "مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں۔"

پھر حضورؐ نے پوچھا:

"تم نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے، کیا تم اس پر ڈرتے نہیں ہو؟"

اس نے معاً کہا: "مجھے یقین ہے تم بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبسم ہو گئے اور اس کے ایک اونٹ پر کھجوریں اور دوسرے پر جَو لدوا دیئے۔ (ابو داؤد)

ایک دفعہ ایک اعرابی بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا۔ آپؐ نے عطا فرمایا اور پوچھا، اب خوش ہو، وہ درشتی سے بولا، نہیں، تم نے میرے ساتھ کچھ بھی سلوک نہیں کیا۔ صحابۂ کرامؓ اس کے لب و لہجہ پر تڑپ اٹھے، قریب تھا کہ اسے قتل کر دیتے، لیکن حضورؐ نے اشارے سے منع فرما دیا اور پھر گھر سے کچھ اور لا کر اسے دیا۔ اب وہ خوش ہو گیا اور دعائیں دینے لگا۔ حضورؐ نے نہایت محبت سے فرمایا:

"تیرا پہلا کام میرے ساتھیوں کو برا معلوم ہوا کیا تم پسند کرتے ہو کہ ان کے سامنے بھی یہی کلمات ادا کر دو جو اب کہہ رہے ہو۔ اس طرح ان کے دل بھی تیری طرف سے صاف ہو جائیں گے۔"

اس نے کہا: "میں کہہ دوں گا۔"

دوسرے دن صحابۂ کرامؓ کے سامنے اس سے سوال کیا کہ اب تو مجھ سے خوش ہے نا؟ اس نے کہا بے شک اور پھر دعا دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک شخص کی اونٹنی بھاگ گئی لوگ اس کے پیچھے بھاگتے تھے

اور وہ آگے بھاگتی تھی۔ مالک نے دوسرے لوگوں سے کہا،
تم سب رُک جاؤ یہ میری اونٹنی ہے اور میں ہی اسے سمجھتا ہوں۔
لوگ ہٹ گئے۔ اونٹنی ایک جگہ رُک گئی اور گھاس چرنے لگی۔
مالک نے اسے پکڑ کر کاٹھی ڈال دی۔ میری اور اس اعرابی کی
مثال ایسی ہی تھی، تم اسے قتل کر ڈالتے تو بیچارہ جہنم میں جاتا۔"
(کتاب الشفاء۔ قاضی عیاضؒ)

حضرت عدیؓ بن حاتم بنو طے کے وفد کے ساتھ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے تو عین اسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لیے حضورؐ کی خدمت میں آئی اور مجمع سے ذرا ہٹ کر بات سُن لینے کی درخواست کی۔ آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک گلی میں کھڑے رہے جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی۔ عدیؓ کہتے ہیں یہ منظر دیکھ کر مجھے یقین آگیا کہ آپؐ پیغمبر ہیں بادشاہ نہیں۔ (سیرت ابن ہشام)

ایک دفعہ حضورؐ کے پاس کہیں سے چادریں آئیں۔ آپؐ نے ان میں سے اکثر تقسیم فرما دیں اور پھر خانۂ اقدس کے اندر تشریف لے گئے۔ اس وقت ایک صحابی حضرت مخرمہؓ اپنے بیٹے مسورؓ کے ہمراہ اپنا حصہ لینے پہنچے۔ مخرمہؓ نے اپنے کمسن فرزند سے کہا: "حضورؐ کو آواز دے کر بلاؤ۔" مسورؓ نے کہا: "ابا جان! میری کیا حیثیت ہے کہ میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو آواز دوں؟" مخرمہؓ نے کہا: "بیٹے رسولؐ اللہ جبار نہیں ہیں۔" اس پر مسورؓ نے جرأت کر کے آواز دی۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فوراً باہر تشریف لے آئے اور ان کو دیبا کی ایک قبا عنایت فرمائی۔ (صحیح بخاری)

ایک دفعہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایک غزوہ سے واپس آتے ہوئے ایک درخت کے نیچے سو گئے۔ ایک کافر شمشیر بدست لوگوں کی نظر بچا کر آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا اور گستاخانہ جگا کر پوچھا، اب تم کو کون بچا

سکتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ"۔ یہ سن کر وہ کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ حضورؐ نے یہی تلوار اٹھا کر اس سے پوچھا "اب تجھے کون بچا سکتا ہے؟" فرطِ دہشت سے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل کرنے یا صحابہؓ کے حوالے کرنے کے بجائے فرمایا "جاؤ میں بدلہ نہیں لیا کرتا"۔ (صحیح بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے بے حد محبت تھی۔ وہ آتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر ان کی پیشانی کو چوم لیتے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ تنگ دستی کی وجہ سے چکی پیستی تھیں، یہاں تک کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ خود ہی پانی بھرتی تھیں اور گھر کے دوسرے کام کاج بھی انجام دیتی تھیں۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا حضورؐ سے ایک لونڈی مانگ لو۔ وہ حضرت علیؓ کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان کی معرفت عرض کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں، ان میں سے ایک کنیز مجھے عنایت ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ابھی تک اصحابِ صُفّہ کا کوئی انتظام نہیں ہوا، وہ بیچارے بڑی مصیبت میں ہیں۔ جب تک ان کا انتظام نہ ہو جائے میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔" (سنن ابوداؤد وغیرہ)

حضرت زیدؓ بن سعنہ پہلے یہودی تھے۔ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قحط زدہ گاؤں کے لوگوں کی مدد کے لیے زیدؓ سے کچھ رقم قرض لی اور ایک خاص مدت کے بعد کھجوروں کی صورت میں اس کی واپسی کا وعدہ فرمایا۔ زید یومِ وعدہ سے تین دن پہلے آ گئے اور قرض کی واپسی کے لیے شدید تقاضا کیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کی چادر مبارک جسمِ اطہر سے کھینچ لی اور کہا کہ عبدالمطلب کا خاندان ہی نادہندہ ہے۔ اس وقت حضرت عمر فاروقؓ بھی وہاں موجود تھے۔ زیدؓ

کی گستاخی پر غم و غصہ سے بے تاب ہو گئے اور تلوار کھینچ کر زیدؓ سے کہنے لگے، "او دشمنِ خدا تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟"

رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے متبسم ہو کر فرمایا:

"عمرؓ تمہیں لازم تھا کہ اسے جھڑکنے کے بجائے محبت سے سمجھاتے کہ نرمی سے کام لے اور مجھ سے اس کا قرض ادا کرنے کے لیے کہتے۔"

پھر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے زیدؓ سے فرمایا کہ ابھی وعدہ میں تین دن باقی ہیں لیکن خیر میں تمہارا قرض ادا کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اس کا قرض ابھی ادا کر دو اور بیس صاع کھجوریں زیادہ بھی دینا کیونکہ تم نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حلم و تحمل نے زیدؓ کو اسلام کی طرف مائل کر دیا اور وہ مشرف بایمان ہو گئے۔

(مستدرکِ حاکم)

سرورِ کونین صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر التزام تھا کہ اس میں اپنے یا بیگانے کافر یا مسلم، چھوٹے یا بڑے کسی میں تخصیص نہ فرماتے تھے۔ کسی کی بیماری یا موت کی خبر سنتے تو دل بھر آتا اور فوراً اس کی عیادت یا تعزیت کے لیے تنہا یا صحابہؓ کے ہمراہ تشریف لے جاتے۔

ایک یہودی لڑکا آپؐ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ بیمار پڑا تو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ پھر اسے تسلی دی اور فرمایا: "بیٹے اسلام قبول کر لے۔" وہ باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ باپ یہودی تھا لیکن حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حسنِ اخلاق سے متأثر ہو کر کہنے لگا: "بیٹے ابوالقاسم کی بات مان لے۔" چنانچہ لڑکا اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر مشرف بہ اسلام

ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اس خدا کی حمد جس نے اسے آتشِ جہنم سے بچالیا"۔ پھر وہاں سے تشریف لے آئے۔ (مستدرک حاکم)

ایک مرتبہ آپؐ کے ایک صحابی بیمار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے کئی مرتبہ تشریف لے گئے۔ قضائے الٰہی سے انہوں نے رات کے وقت وفات پائی۔ لوگوں نے انہیں رات ہی کو دفن کر دیا اور حضورؐ کو اس خیال سے اطلاع نہ دی کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ صبح جب آپؐ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو شکایت کی کہ تم نے مجھے خبر کیوں نہ کی۔ پھر ان کی قبر پر جاکر نمازِ جنازہ پڑھی۔ (صحیح بخاری)

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا۔ قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا تو لوگوں نے چپکے سے دفن کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہ دی۔ جب متواتر کئی روز حضورؐ نے اسے مسجد میں نہ دیکھا تو اس کا حال دریافت کیا۔ لوگوں نے عرض کیا، وہ فوت ہوگیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ لوگوں نے کہا کہ اس کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ حضورؐ کو اس کے مرنے کی اطلاع دی جاتی۔ (یعنی معمولی آدمی تھا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اس خیال کو سخت ناپسند فرمایا۔ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی۔ (صحیح بخاری)

ایک دفعہ حضرت جابر بن عبداللہؓ انصاری بیمار ہوگئے۔ ان کا گھر کافی فاصلے پر تھا، لیکن حضورؐ ان کی عیادت کے لیے پاپیادہ تشریف لے جاتے تھے۔ (ابوداؤد)

ایک رات کا ذکر ہے کہ اہلِ مدینہ (ایک غیر مانوس آواز آنے کی وجہ سے) گھبرا گئے (کہ شاید رات کے وقت غنیم نے دھاوا بول دیا ہے) اور جس طرف سے آواز آئی تھی اُدھر دوڑ پڑے۔ راستے میں وہ یہ دیکھ کر ششدر

رہ گئے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی راستے پر شہر کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ تنہا خطرے کی طرف تشریف لے گئے تھے اور فرما رہے تھے، ڈرو نہیں ڈرو نہیں (یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے) اس وقت آپؐ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے گھوڑے پر یونہی (بغیر زین کے ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور آپؐ کی گردن مبارک میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔

(صحیح بخاری)

غزوات میں آپؐ خود فوج کی قیادت فرماتے تھے اور ایک ایک مجاہد پر نظر رکھتے تھے۔ میدان رزم میں دشمن خواہ کتنا ہی دباؤ ڈالتا اور صورتِ حال کتنی ہی نازک ہوتی آپؐ کے پائے استقلال میں جنبش نہ آتی تھی۔ خطرناک موقعوں پر بڑے بڑے دلاور صحابہؓ آپؐ کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

سیدالعرب والعجمؐ کا مسکن چند چھوٹے چھوٹے حجروں پر مشتمل تھا۔ انہی میں ازواج مطہراتؓ رہتی تھیں۔ ہر حجرے کی وسعت تین ساڑھے تین گز کے قریب تھی۔ ان کی اونچائی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر ہاتھ بلند کرتا تو وہ چھت کو چھو جاتا۔ حجروں کی دیواریں مٹی کی تھیں اور ان پر کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں کی چھت تھی۔ ان حجروں کے ساتھ نہ کوئی صحن تھا اور نہ دالان۔ مٹی کی دیواروں میں بعض اوقات شگاف پڑ جاتے تھے جن سے دھوپ اندر آتی تھی۔ بارش میں بال کے کمبل حجروں کے گرد لپیٹنے پڑتے تھے تاکہ پانی اندر نہ آئے۔ ہر حجرے کے دروازے پر ٹاٹ یا کپڑے کا پردہ یا ایک ایک پٹ کا کواڑ تھا۔ ان حجروں کے علاوہ ایک معمولی سا بالاخانہ تھا جس کی کل کائنات یہ تھی، ایک بستر، ایک تکیہ جس میں چھال بھری ہوئی تھی، ایک چارپائی، ایک چٹائی، ایک یا دو مشکیزے، ایک گھڑا اور ایک پیالہ۔

(مسند ابوداؤد، ادب المفرد، صحیح بخاری وغیرہ)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کی کھال

کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ نذر کیا۔ آپؐ نے (تحفہ دینے والے کی دلداری کی خاطر) پہن لیا اور نماز ادا فرمائی۔ پھر اسے نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا اور فرمایا: "پرہیزگاروں کے لیے یہ لباس مناسب نہیں ہے۔" (صحیح بخاری)

ازواج مطہراتؓ کا لباس بھی موٹے کپڑے کا ہوتا تھا۔ اگر حضورؐ کبھی ان کو سونے کا زیور پہنے دیکھ لیتے تو اسی وقت اتروا دیتے۔ (نسائی)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ یعنی آپؐ کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا، دوسرا نہیں تھا جو تہہ کر کے رکھا جاتا۔ (ابنِ ماجہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ہمارے سامنے ایک پرانا تہمد اور ایک پرانے کمبل جیسا کپڑا جس پر پیوند لگا ہوا تھا نکالا اور فرمایا، رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات انہی دو کپڑوں میں ہوئی تھی۔ (بخاری ومسلم)

بستر مبارک کبھی کمبل کا ہوتا تھا اور کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی اور کبھی معمولی کپڑے کا، جو دو تہہ کر دیا جاتا تھا۔ (شمائل ترمذی)

ایک دفعہ ایک ریشمی کپڑا بک رہا تھا، حضرت عمر فاروقؓ نے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! یہ کپڑا خرید لیں اور جمعہ کے دن یا سفیروں کی آمد کے موقع پر زیب بدن فرمایا کریں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔"

(صحیح بخاری)

ایک دفعہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بوریئے پر استراحت فرما رہے تھے، اُٹھے تو جسمِ اطہر پر بوریے کے نشان پڑ گئے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! اگر اجازت ہو تو ہم کوئی گدا بنوا کر پیش کریں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

نے فرمایا، "مجھے دنیا سے کیا کام؟ میرا تو دنیا سے صرف اتنا تعلق ہے جیسے کوئی سوار تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جائے اور پھر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔" (جامع ترمذی)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تو آپؐ کی سواری کا کجاوہ چار درہم سے زیادہ کا نہ تھا۔ (ابن سعد)

ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر آپؐ جو چادر اوڑھے ہوئے تھے اس کی قیمت چار درہم تھی۔ خادم رسول اللہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ (بالعموم) جو کی روٹی کھاتے تھے۔ یہ روٹی ایسے موٹے آٹے کی ہوتی کہ پانی کے گھونٹ کے بغیر حلق سے نیچے نہ اترتی تھی۔ آپؐ کے لیے کبھی پتلی چپاتی نہ پکائی گئی۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

حضرت اُمِ ایمنؓ نے ایک مرتبہ آٹا چھان کر اس کی روٹی پکانی چاہی۔ حضورؐ نے پوچھا یہ کیسا آٹا ہے؟ وہ بولیں ہمارے وطن میں ایسی ہی روٹی پکتی ہے۔ میں نے چاہا آج آپؐ کو اس قسم کی روٹی کھلاؤں۔ ارشاد ہوا نہیں، اس میں جو بھوسی نکلی ہے وہ اسی میں ڈال دو اور اسے دوبارہ گوندھو۔ (ابنِ ماجہ)

سرورِ عالمؐ اور آپؐ کے اہل و عیال کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ (ترمذی)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ متواتر ایک ایک دو دو مہینے گزر جاتے تھے اور ہمارے گھروں میں چولہا نہ جلتا تھا۔ اہل خانہ کھجور اور پانی پر گزران کرتے تھے۔ بعض انصار حضورؐ کے لیے دودھ بھیجتے تو آپؐ وہ ازواج کو پلا دیتے۔ (صحیحین)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا سلف لاتے، جوتا پھٹ جاتا تو اس کو خود گانٹھ لیتے، غلاموں اور مسکینوں کے

ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے، کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ صحابہ کے درمیان اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ کوئی اجنبی آپؐ کو نہ پہچان سکتا۔ (شمائل ترمذی)

حضورؐ اپنی تعظیم کے لیے لوگوں کو اٹھنے سے منع فرماتے (ابن ماجہ)

ایلاء کے زمانہ (سنہ ۹ ہجری) میں جب تمام عرب یمن، بحرین وغیرہ مسخر ہو چکے تھے اور اموالِ غنیمت اور سالانہ محاصل کی بھرمار تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ حضورؐ کی بالاخانے والی کوٹھڑی میں حاضر ہوئے تو دیکھا۔ کہ سیّد العرب والعجمؐ کے جسمِ اطہر پر صرف ایک تہمد ہے۔ ایک کھری چارپائی ہے۔ سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے۔ ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں۔ کھونٹی پر مشکیزہ کی کچھ کھالیں لٹک رہی ہیں اور جسمِ اطہر پر چارپائیؐ کے بان کی بدھیاں پڑ گئی ہیں۔

حضورؐ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ اشکبار ہو گئے۔ آپؐ نے سبب پوچھا تو عرض کی، "یا رسولؐ اللہ یہ آپؐ کا خانۂ اقدس ہے اور یہ اس کا سامان۔ قیصر و کسریٰ تو دنیا کے مزے لوٹیں اور اللہ کے برگزیدہ رسولؐ کے گھر کا یہ حال ہو۔"

حضورؐ نے فرمایا: "اے ابنِ خطاب! کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔" (صحیح مسلم)

سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جب سفرِ آخرت اختیار فرمایا تو تھوڑے سے جَو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ رحلت سے پہلی شب حضرت عائشہؓ نے پڑوسن سے چراغ کے لیے تیل منگوایا جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے کئی پیوند لگے ہوئے تھے اور آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تین صاع جَو پر گروی رکھی ہوئی تھی۔ (ترمذی۔ بخاری و مسلم)

اوپر جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل غلط

ہوگا کہ اس زمانے کے حکمران اور اہلِ سیاست ٹھاٹ باٹ اور طمطراق کی زندگی سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اسی لیے حضورؐ کا طرزِ معاشرت ایسا سادہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور اہلِ سیاست کے مزاج میں ہمیشہ سے تانا شاہی رہی ہے اور اہلِ عرب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ان کے حکمرانوں، سرداروں اور امیروں کی زندگی بڑی پُرتکلف تھی، اپنے حسب و نسب، مال و دولت، سامانِ عیش، قوت و شوکت اور غلاموں کی کثرت پر ان کو اتنا ناز تھا کہ ایک دوسرے سے مفاخرہ کیا کرتے تھے۔ حمیری یمنی اور غسانی بادشاہوں کے درباروں میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ قیصر و کسریٰ کے درباروں سے کچھ کم نہیں تھا۔ اہلِ مدینہ میں بھی بادشاہت کا تصوّر اس کے پورے لوازمات سمیت موجود تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے مدینہ منوّرہ میں نزول اجلال فرمانے سے پہلے اوس و خزرج نے اتفاقِ رائے سے عبداللہ بن اُبَیّ کو اپنا بادشاہ بنانا منظور کرلیا تھا اور اس کے لیے تاج بھی تیار کرلیا تھا، لیکن سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں دنیوی کرّوفر اور جاہ و جلال کے بجائے خلافتِ الٰہی کا عکس تھا اور جو نمود و نمائش اور شان و شوکت کا مظہر ہونے کے بجائے سادگی، دردمندی، محبّت، شفقت، عدل و مساوات اور خدمتِ خلق کا آئینہ دار تھا۔

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ سرورِ دوعالم فخرِ بنی آدم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا نظامِ حکمرانی کیسا تھا اور بحیثیت ایک حاکم، فرمانروا، مدبّر اور ماہرِ سیاست کے آپؐ کا مقام و مرتبہ کیا تھا؟ اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ حضورؐ کی بعثت کا اصل مقصد دعوتِ دین، اصلاحِ خلق اور تزکیۂ نفوس تھا۔ اس کے علاوہ تمام فرائض محض ضمنی تھے گویا حکمرانی اور سیاست و تدبّر وغیرہ۔ آپؐ کے بے مثل فضائل و کمالات کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے

ذرا آپؐ کی ذاتِ اقدس کی ہمہ گیری اور جامعیت ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) آپؐ خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔

(۲) آپؐ کو دنیاوی حکومت بھی حاصل ہے۔

(۳) دینی سیادت کی یہ شان ہے کہ آپؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے۔

(۴) شخصی اور اخلاقی عظمت سے بھی آپؐ مکمل طور پر بہرہ ور ہیں۔

(۵) شخصیت کے رعب و دبدبہ، وجاہت اور حسب و نسب کی برتری کے لحاظ سے بھی آپؐ کی کوئی مثال نہیں ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ایک شخص جب آپؐ کو ان الفاظ سے مخاطب کرتا ہے۔

"اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند۔ اے ہم سب میں بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند" تو آپؐ فرماتے ہیں:

"لوگو پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گرا نہ دے۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں۔ اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا، میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔"

(مسندِ احمد بن حنبل)

راتوں کو نماز میں اتنی دیر کھڑے رہتے ہیں کہ پائے مبارک پر ورم آ جاتا ہے۔ بعض صحابہؓ عرض کرتے ہیں، "یا رسول اللہ! آپ کی مغفرت تو اللہ کر چکا ہے۔ آپؐ اتنی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں۔"

ارشاد ہوتا ہے، "کیا میں عبدِ شکور (اللہ کا شکر ادا کرنے والا بندہ) نہ بنوں۔"

آپؐ کی سیرتِ طیبہ میں جہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ ملک کے داخلی اور خارجی معاملات سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں، میدانِ جہاد میں فوجوں کی قیادت فرما رہے ہیں، مجرموں اور خطا کاروں پر حد جاری فرما رہے ہیں۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کو دعوت حق کے خطوط بھیج رہے ہیں وہاں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ باں ہمہ عظمت و مرتبہ آپؐ غریبوں کی دست گیری، یتیموں کی غمخواری اور پریشان حالوں کی دلجوئی فرما رہے ہیں، بازاروں میں جا کر دیکھ رہے ہیں کہ کوئی ناپ تول میں کمی تو نہیں کر رہا۔ بازار سے سودا سلف خرید کر لا رہے ہیں۔ مریضوں کی عیادت کے لیے ان کے گھر پیادہ پا تشریف لے جا رہے ہیں۔ کوئی مر جاتا ہے تو گھر سے لے کر قبر میں رکھنے تک جنازے میں شریک ہو رہے ہیں۔ دوسرے مسلمان بھوکے ہیں تو خود بھی شکمِ مبارک پر دو دو پتھر باندھ رکھے ہیں۔ قرآنِ پاک کی تفسیر بھی فرما رہے ہیں اور حسانؓ بن ثابت کے اشعار بھی سن رہے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر بھی فرما رہے ہیں، اصحاب کے ساتھ خوش طبعی کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ نمازیں بھی ظاہری طریقوں کی پوری پابندی کے ساتھ ادا فرما رہے ہیں، حج کے تمام مناسک بھی ادا فرما رہے ہیں، اور ماہ رمضان میں سحر و افطار کے پورے التزام کے ساتھ روزے بھی رکھ رہے ہیں۔ گویا تمام معاملات اور عبادات ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

ہر مسلمان کا اس بات پر ایمان ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر ہے اور یہ ہے بھی ناقابل تردید حقیقت کہ جس دین کی دعوت لے کر آپؐ اٹھے تھے اس کی اساس قرآنِ پاک ہے جو بنی نوعِ انسان کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض شعبوں کے بارے میں قرآنِ حکیم میں تفصیلی احکام موجود ہیں اور بعض کے صرف مبادی اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کے بارے میں قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر، تشریح، تعبیر اور توضیح حضورؐ کے اسوۂ حسنہ میں نہ ملتی ہو، اس لیے سنتِ رسولؐ بھی ہمارے لیے سرچشمۂ حیات ہے۔ خود قرآنِ حکیم نے اس پر یوں مہرِ تصدیق

ثبت کی ہے۔

(۱) " اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔"
(النسآء : ۸۰)

(۲) "جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے باز رہو۔" (الحشر : ۷)

سید الانام صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ سیاست دین کے تابع ہے۔

ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (اقبالؒ)

قرآنِ حکیم کی رو سے اسلامی مملکت کے کارفرماؤں کی تعریف یہ ہے:

" مسلمان وہ ہیں جن کو اگر اللہ زمین میں قوت (تمکن فی الارض) عطا کرے تو نماز قائم کریں (یعنی حاکمیت الٰہی کے علمبردار ہوں اور اللہ کی عبادت کریں) زکوٰۃ دیں (مستحقین کی مالی امداد کریں) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں اور برائیوں سے روکیں۔" (الحج)

ظاہر ہے سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بڑھ کر اس تعریف کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے "سیرۃ النبیؐ" میں حضورؐ کی شانِ جہانبانی کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

" حکومتِ الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں، لیکن جب دعوتِ الٰہی سیاستِ ملکی کی دیواروں سے ٹکراتی ہے یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشار حال کے کانٹوں میں الجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم کو نمارده و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے۔ پیغمبروں میں عیسیٰؑ و یحییٰؑ بھی گزرے ہیں جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اور موسیٰؑ اور داؤدؑ

وسلیمانؑ بھی جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے، لیکن محمدؐ رسول اللہ عیسیٰؑ ویحییٰؑ بھی تھے اور داؤدؑ اور موسیٰؑ بھی، عرب کے خزانے دست تصرف میں تھے لیکن کاشانۂ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا نہ غذائے لطیف، نہ جسم مبارک پر لباس شاہانہ تھا نہ جیب وآستین میں درہم و دینار، عین اس وقت جب اس پر قیصر وکسریٰ کا دھوکا ہوتا تھا، وہ گلیم پوش مکہ کا یتیم اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا۔"

قرآن حکیم میں اسلام کے اصولِ حکمرانی کسی ایک جگہ بیان نہیں کیے گیے بلکہ انہیں مختلف سورتوں میں بیان کیا گیا ہے، ان سب اصولوں کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ سب "اللہ کی حاکمیت" ہی کے دائرے میں آتے ہیں، رسول کی اطاعت، عدل بین الناس، مساوات بین المسلمین، خدمتِ خلق یا مخلوقِ خدا کی خیر خواہی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، قیامِ امن، صلح، جنگ وغیرہ سب کی اساس "اللہ کی حاکمیت پر ہے۔ گویا اسلامی مملکت ایک نظریاتی مملکت ہے جس میں "عالمِ ارض" اور "عالمِ سماء" دونوں جمع ہیں کیونکہ دین ایک "کُل" ہے اس کی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ معاشرے سے کٹ کر اور معاملاتِ زندگی سے کنارہ کش رہ کر دین دین ہی نہیں رہ سکتا۔ دین کار پردازانِ حکومت پر فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اللہ کی خشیت کو اپنے دل میں جاگزیں کر کے کاروبارِ حکومت چلائیں۔ لوگوں کو قانونِ خداوندی کا سچا پیروکار بنائیں، بُرائی مٹائیں، نیکی کو پھیلائیں، معاشی انصاف اور سماجی مساوات قائم کریں اور اپنے آپ کو مخلوقِ خدا کی خیر خواہی بھلائی اور خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ سرورِ عالمؐ نے جو نظامِ جہانبانی یا نظامِ معاشرت قائم فرمایا اس کے نمایاں پہلو یہ تھے:

① اللہ کی حاکمیت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور عمل کے ذریعے دنیا کو بتایا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اصل حاکمیت اسی کو حاصل ہے۔ اسی کے احکام اور ہدایات ملک کا قانون ہیں۔ اس نے جو حدیں مقرر کی ہیں ان کی پابندی کرنا لازمی ہے۔ کاروبارِ حکومت بھی قانونِ خداوندی کے تحت ہی چلایا جا سکتا ہے۔ رسول انسانی زندگی میں خدا کی قانونی حکومت کا نمائندہ ہے اور اس بنا پر (فرمانِ الٰہی ہی کے مطابق) رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ اسلامی مملکت کا سربراہ آمر نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو اپنا غلام بنا لے اور نہ وہ اپنی ذات کو قانونِ خداوندی سے بالاتر سمجھتا ہے بلکہ دوسرے تمام لوگوں کی طرح قانونِ خداوندی کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ حکومت کو خدا کی طرف سے امانت سمجھتا ہے۔ وہ اللہ کا خلیفہ بھی ہے اور مسلمانوں کا امام بھی، وہ اُمت کا راعی بھی ہے اور اولوالامر بھی۔

② عدل

عدل وانصاف کسی بھی حکومت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے عدل وانصاف پر غیر معمولی زور دیتا ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل وانصاف کو جس معراج کمال پر پہنچا دیا، تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آپؐ کا عدل اپنے بیگانے، دوست، دشمن، مسلم غیر مسلم، امیر غریب سب کے لیے یکساں اور بلا امتیاز تھا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص لوگوں کو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں۔ (ابوداؤد)

ایک مرتبہ حضرت واثلہؓ بن اسقع نے عرض کیا :

"یا رسولؐ اللہ! عصبیّت کیا ہے ؟"

فرمایا ، "ظلم میں اپنی قوم کا مددگار ہونا۔" (ابوداؤد)

سیرتِ طیبہ میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ کے پاس کوئی مقدمہ لایا گیا جس میں ایک فریق مسلم اور دوسرا غیر مسلم تھا۔ آپؐ نے شہادتیں سننے کے بعد غیر مسلم کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ اسی طرح جب تک کسی کے خلاف کامل ثبوت نہ مل جائے آپؐ حد جاری نہیں فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ کے ایک محبوب صحابی حضرت عبداللہؓ بن سہل کھجوروں کی بٹائی کے لیے خیبر گئے۔ ان کے ابن عم "مُحَیِّصَہؓ" بھی ساتھ تھے۔ عبداللہؓ گلی میں سے گزر رہے تھے کہ کسی نے ان کو شہید کر ڈالا۔ بظاہر یہ کارستانی یہودیوں کی تھی۔ حضرت مُحَیِّصَہؓ نے واپس مدینہ آکر بارگاہِ نبوّت میں استغاثہ دائر کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، "کیا تم حلف اٹھا سکتے ہو کہ عبداللہ یہودیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے؟" انھوں نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ! میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا" حضورؐ نے فرمایا، "تو پھر یہودیوں سے حلف لیا جائے۔" انھوں نے کہا، "یا رسولؐ اللہ! ان لوگوں پر کیا اعتبار وہ تو سو جھوٹی قسمیں کھالیں گے۔" ——— خیبر میں صرف یہودی ہی آباد تھے اس لیے قرائن کے مطابق وہی حضرت عبداللہؓ کے قاتل ہو سکتے تھے، لیکن کوئی موقع کی شہادت موجود نہیں تھی، اس لیے حضورؐ نے یہودیوں سے باز پرس نہ فرمائی اور خون بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوا دیئے۔

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ خادمِ رسول حضرت انسؓ بن مالک کی پھوپھی حضرت رُبَیِّعؓ بنت نضر کے ہاتھ سے ایک انصاری لڑکی کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس کے اہلِ خاندان نے بارگاہِ نبوّت میں قصاص کا دعویٰ کیا۔

حضرت رُبیّعؓ بھی بڑی جلیل القدر صحابیہ تھیں اور ان کے فرزند سراقہؓ بھی غزوۂ بدر میں رتبۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے، لیکن حضورؐ نے ان کی جلالتِ قدر کے باوجود فیصلہ صادر فرمایا کہ دانت کے بدلے دانت اور جان کے بدلے جان ہی خدائی قانون ہے۔ عظیم المرتبت صحابی حضرت انسؓ بن نضر (جو حضرت رُبیّعؓ کے بھائی تھے) بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے بہن کی محبّت کے جوش میں فرمایا:

"خدا کی قسم رُبیّع کا دانت نہ توڑا جائے گا۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"بھئی خدا کا حکم یہی ہے۔ ہاں اگر مدعی دِیَت قبول کرے تو قصاص ٹل سکتا ہے۔"

خدا کی قدرت مضروب لڑکی کے متعلقین دِیَت لینے پر راضی ہو گئے اور حضرت رُبیّعِؓ قصاص سے بچ گئیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ فتح مکّہ کے موقع پر فاطمہ بنتِ اسود مخزومیہ سے چوری کی لغزش سرزد ہو گئی اور وہ پکڑی گئیں۔ بنو مخزوم کے لوگ گھبرائے ہوئے محبوبِ رسولؐ حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ حضورؐ سے اس خاتون کے لیے رعایت کی سفارش کریں۔ جب حضرت اسامہؓ نے حضورؐ سے التجا کی کہ اس خاتون سے رعایت فرمائیں تو آپؐ کے روئے مبارک پر تکدّر کے آثار پیدا ہوئے اور آپؐ نے فرمایا:

"کیا تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے بارے میں گفتگو کرتے ہو؟"

حضرت اسامہؓ لرزا ٹھے اور عرض کی:

"یا رسولؐ اللہ میرے لیے اللہ سے مغفرت طلب فرمائیے۔"

شام ہوئی تو حضورؐ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

”پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف (معزز یا امیر) آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں کوئی کمزور (معمولی) آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔“

حضورؐ کی سیرتِ طیبہ میں آپؐ کے عدل کے ایسے بیسیوں واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عدل آپؐ کی جہانبانی کا جزو لاینفک تھا۔ یہ عدل اوروں ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ آپؐ اپنی ذاتِ اقدس پر بھی اس کا اطلاق فرماتے تھے۔

ایک دفعہ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص آپؐ سے چمٹ گیا۔ دستِ مبارک میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس سے اس شخص کو ٹھوکا دیا۔ اس سے اس کے منہ پر خراش آگئی۔ حضورؐ نے فرمایا، ”آؤ مجھ سے بدلہ لے لو۔“

اس نے عرض کیا: ”یا رسولؐ اللہ! میں نے معاف کر دیا۔“

ایک دفعہ حضرت اُسیدؓ بن حُضَیر انصاری مجلسِ نبویؐ میں ننگے بدن بیٹھے تھے اور ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ حضورؐ نے ایک چھڑی سے انہیں ٹھوکا دیا۔ انھوں نے کہا، یا رسولؐ اللہ آپؐ کی چھڑی نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی۔“

حضورؐ نے فرمایا، ”مجھ سے انتقام لے لو۔“

انھوں نے عرض کیا، ”اے خدا کے رسول میں ننگے بدن تھا اور آپؐ کے جسم مبارک پر کپڑے ہیں۔“

حضورؐ نے فوراً اپنا پیراہن مبارک اٹھا دیا اور فرمایا:

”آؤ اب بدلہ لے لو۔“

حضرت اُسیدؓ حضورؐ سے لپٹ گئے اور آپؐ کے جسدِ اقدس کو بار بار چومنے لگے۔

مرض الوفات میں آپؐ نے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ اگر مجھ پر کسی کا قرض ہے یا میں نے کسی کی جان مال اور آبرو کو نقصان پہنچایا ہو تو میری جان مال اور آبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ اپنا بدلہ لے لے۔ سارا مجمع مہر بلب تھا۔ البتہ ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو آپؐ نے اسی وقت دلوا دیئے۔ (سیرۃ ابنِ ہشام)

(۳) مساوات و اُخوّت

دربارِ رسالت میں آقا و غلام، کبیر و صغیر اور امیر و غریب سب یکساں تھے اور تمام مسلمانوں کے حقوق رنگ و نسل اور زبان و وطن کے امتیاز کے بغیر برابر تھے۔ اگر کسی کو فضیلت حاصل تھی تو وہ صرف تقویٰ کی بناء پر تھی۔ خاندان کا غرور اور دوسروں کے نسب پر طعن کرنا آپؐ کے نزدیک عہدِ جاہلیت کی نشانیاں تھیں (صحیح مسلم)

آپؐ نے قریش کا غرورِ نسب اس طرح مٹایا کہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ بنتِ جحش کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا اور اپنی بنتِ عم ضباعہؓ بنتِ زبیر بن عبدالمطلب کو غریب الوطن صحابی حضرت مقدادؓ بن الاسود کندی سے بیاہ دیا۔

دینی اور دنیاوی تمام امور میں آپؐ دوسروں کے ساتھ شانہ بشانہ ہو کر کام کرتے تھے اور یہ کبھی پسند نہ فرماتے تھے کہ دوسرے کام کرتے رہیں اور آپؐ بیٹھے رہیں۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر ہو یا خندق کی کھدائی، دُکھ ہو، یا سُکھ، آپؐ ہر حال میں صحابہؓ کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ حدیہ کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب تیس ہزار جاں نثار آپؐ کے ہم رکاب تھے،

حضرت عبداللہ ذوالبجادینؓ نے وفات پائی تو آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے ساتھ مل کر رات کی تاریکی میں خود ان کی قبر کھودی۔

(سیرۃ ابن ہشام)

آپؐ کی مساوات پسندی اور انکسار و تواضع کے بہت سے واقعات اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔" حضورؐ نے یہ فرما کر اس رشتہ کو اور مستحکم کر دیا کہ مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ ایک مسلمان کا خون دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے کہ اس کا ہر حصّہ دوسرے حصے کو مضبوط کیے ہوتا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ مصیبت میں ڈالے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے اللہ اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی سختی دور کرتا ہے۔ اللہ قیامت کے دن اس کی کوئی سختی دور کرے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی ستر پوشی کرتا ہے اللہ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کرے گا۔ (بخاری۔ مسلم)

غلاموں اور زیر دستوں کے بارے میں حضورؐ نے حکم دیا کہ غلام تمہارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے زیر دست کر دیا ہے پس جس شخص کے بھائی کو اللہ تعالیٰ زیر دست کر دے اس کو چاہیے کہ جو خود کھائے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے اس کو بھی وہی پہنائے۔

(صحیحین)

(۴) امر بالمعروف ونہی عن المنکر

یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ یوں تو ہر مسلمان کا فریضہ

ہے لیکن اسلامی حکومت پر یہ فرض بطور خاص عائد ہوتا ہے حضورؐ نے مسلمانوں کے لیے "کرنے کے کاموں" اور "نہ کرنے کے کاموں" میں واضح طور پر تخصیص فرما دی اور پھر ان کے طرزِ عمل پر نہایت التزام کے ساتھ نظر رکھی۔ یہاں تک کہ وہ بھلائی کے خوگر اور بدی سے متنفر ہو گئے۔

اسلام اخلاقِ حسنہ یا حسنِ سیرت و کردار کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ فی الحقیقت اخلاقِ حسنہ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا حصہ ہیں حضورؐ کا ارشاد ہے "میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔"

چنانچہ حضورؐ نے مسلمانوں کی سیرت اور کردار کی تعمیر پر خاص توجہ دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عرب کے صحرا نشینوں میں ایسے بلند کردار انسانوں کی ایک عظیم جماعت تیار ہو گئی جنھوں نے تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں دنیا کی رہنمائی کی۔

(۵) (د) فوج اور عسکری مہمات

کسی ملک کی قوت و شوکت کا انحصار اس کی فوج پر ہوتا ہے اس لیے فوج کو خاص مراعات کا مستحق سمجھا جاتا ہے لیکن سرورِ عالمؐ نے جو فوج تیار فرمائی وہ کسی حکومت کی فوج نہیں تھی بلکہ اس میں شامل سبھی لوگ اللہ کے سپاہی تھے۔ ان لوگوں کی نہ کوئی تنخواہ مقرر تھی اور نہ ان کا مقصد مالِ غنیمت یا کشور کشائی تھا۔ ان کا جینا، لڑنا اور مرنا سب کچھ اللہ کی خاطر تھا۔ اس خدائی فوج میں بھرتی کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ جونہی اعلانِ جہاد ہوتا، ہر تندرست بالغ اور لڑنے کے قابل مسلمان اس بات کا مکلف ہو جاتا کہ اعلانِ جہاد پر لبیک کہے اور راہِ حق میں جان کی بازی لگا دے۔ اس فوج کو صرف مندرجہ ذیل صورتوں میں تلوار اٹھانے

کی اجازت تھی۔

○ مُلک وملّت کے دفاع اور حفاظت کے لیے جب دشمن حملہ آور ہو یا حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔

○ فتنہ وفساد اور سرکشی کو ختم کرنے کے لیے۔

○ ظلم واستبداد کے استیصال کے لیے۔ ضعیفوں اور مظلوموں کی مدد کے لیے۔

بڑے معرکوں کی قیادت حضورؐ خود فرماتے تھے البتہ چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا کی سرداری اکابر صحابہؓ کو عطا ہوتی تھی۔ بدر، احد، خندق، مُریسیع، خیبر، فتح مکّہ، حنین، طائف اور تبوک میں آپؐ نے فوج کی قیادت خود فرمائی۔ اس کا مقصد ترتیبِ فوج سے زیادہ لشکر کی اخلاقی اور روحانی نگہداشت تھا۔ چنانچہ آپؐ مجاہدین کی معمولی سے معمولی بے اعتدالیوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔

حضورؐ نے مجاہدین کو سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ لڑائی میں بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مذہبی پیشواؤں یا خادموں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ کوئی مہم روانہ فرماتے تو سردارِ فوج کو تاکید کر دیتے کہ کسی بوڑھے کو، بچے کو، کمسن کو، اور عورت کو قتل نہ کرنا۔

جنگ کی حالت میں عہد وپیمان کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ لیکن حضورؐ نے اس حالت میں بھی مسلمانوں کو عہد شکنی کی اجازت نہیں دی۔ غزوۂ بدر سے چند دن پہلے مشہور صحابی حضرت حذیفہؓ بن الیمانؓ اپنے والد حضرت حسیلؓ بن الیمان کے ہمراہ مدینہ سے مکّہ گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے غزوہ کا حال سُنا تو اس میں شرکت کے لیے مکّہ سے روانہ ہوئے۔ راستے میں مشرکین نے روکا کہ محمدؐ کے پاس جاتے ہو؟ انھوں نے کہا، ہم تو اپنے گھر (مدینہ) جا رہے ہیں۔ مشرکین نے کہا، تمہارے جانے پر

ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم محمدؐ کی حمایت میں ہمارے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاؤ گے۔ دونوں نے طوعاً وکرہاً مشرکین کی شرط مان لی اور ان کے پنجے سے چھوٹ کر مدینہ پہنچے۔ حضورؐ ابھی غزوہ کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے۔ دونوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا اور لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مانگی۔ اگرچہ اس وقت ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی لیکن حضورؐ نے فرمایا:

"تم اپنا عہد پورا کرو اور واپس جاؤ ہم کو اللہ تعالیٰ کی مدد درکار ہے۔"

چنانچہ وہ دونوں دل پر پتھر رکھ کر واپس چلے گئے۔

عرب میں دشمنوں کی لاشوں کا مُثلہ کرنے کا عام رواج تھا۔ یعنی ہونٹ، کان، ناک اور بعض دوسرے حصے کاٹ ڈالتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو اس وحشیانہ حرکت کی سختی سے ممانعت کر دی۔ اسی طرح حضورؐ نے جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں کوئی اذیت نہ پہنچائی جائے اور نہ انہیں کھانے پینے کی تکلیف ہونے پائے۔ غزوہ بدر کے بعد چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ بعض صحابہ کرام خود بھوکے پڑے رہتے تھے لیکن اپنے قیدیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے تھے۔ غزوہ حنین میں بنو ہوازن نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا لیکن فتح کے بعد حضورؐ نے ان کے چھ ہزار قیدیوں کو اس شان سے چھوڑ دیا کہ ہر ایک کو عمدہ کپڑوں کا ایک جوڑا بھی عطا فرمایا۔

گزشتہ زمانے میں فوجیں جس علاقے میں سے ہو کر گزرتی تھیں وہاں سخت تباہی و بربادی پھیلتی تھی۔ باغ اور کھیت اجڑ جاتے تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا تھا لیکن حضورؐ نے مجاہدین کو ان مذموم حرکتوں سے یکسر منع فرما دیا اور عام منادی کرا دی کہ جو کوئی بھی اس قسم کی حرکات کا مرتکب ہو گا اس کا جہاد جہاد ہی نہیں۔

فاتحین عام طور پر مفتوحین پر سخت ظلم ڈھایا کرتے تھے اور قتلِ عام سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے لیکن حضورؐ نے دشمنوں پر غلبہ پاکر ان سے ہمیشہ نہایت کریمانہ اور فیاضانہ برتاؤ کیا۔ یہودِ خیبر مسلمانوں کے خلاف کئی سازشوں میں شریک رہے تھے اور مسلمانوں کا سخت مقابلہ کیا تھا لیکن حضورؐ نے خیبر کی فتح کے بعد ان کو کوئی اذیت نہ پہنچائی اور ان کے اظہارِ اطاعت ہی کو کافی سمجھا۔ فتح مکّہ کے بعد حضورؐ نے قتلِ عام کے بجائے عفوِ عام کا اعلان کیا جس سے وہ تمام لوگ مستفیض ہوئے جو تیرہ سال تک آپؐ کو ایذائیں پہنچاتے رہے تھے یہاں تک کہ آپؐ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔

اگرچہ تمام صحابہ کرامؓ حضورؐ سے والہانہ عقیدت و محبّت رکھتے تھے اور آپؐ کے ایک معمولی اشارے پر اپنی جان قربان کر سکتے تھے لیکن آپؐ نے ان کے جوش اور جذبے کے باوصف عسکری تدابیر اور تیاریوں سے کبھی اغماض نہ برتا۔ مسلمانوں کو ہمیشہ قوی اور صحت مند رہنے کے اصول سمجھاتے مردانہ ورزشوں گھڑ دوڑ، نیزہ بازی، اور تیر اندازی وغیرہ کا شوق دلاتے۔ ان کو فنونِ حرب و ضرب سیکھنے اور سکھانے کے مواقع بہم پہنچاتے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے تاکہ وہ مختلف راستوں سے واقف ہو جائیں اور دشمن کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھیں۔

بعض صحابہؓ کو دبابے اور دوسرے قلعہ شکن ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دلوائی۔ جہاں تک ہو سکا لڑائی سے بچنے کی کوشش کی اور صلح کو لڑائی پر ترجیح دی۔

ب) حُکّام، وُلاۃ اور دوسرے عہدیداروں کا تقرر

حکومت کے مختلف عہدوں کے لیے آپؐ ایسے اشخاص منتخب فرماتے تھے جو ہر لحاظ سے ان کے اہل ہوتے تھے لیکن جو شخص خود کوئی عہدہ طلب

کرتا وہ حضورؐ کے نزدیک نااہل قرار پاتا۔ صحیحین میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ خدا کی قسم میں اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتا جو اس کا طالب یا حریص ہو۔

حضورؐ نے جن صحابہؓ کو مختلف صوبوں کا والی (گورنر) بنایا، وہ تمام علم وفضل اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔ ان اصحاب کو روانہ کرتے وقت حضورؐ یہ ہدایات دیتے تھے کہ "لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور ان کو دہشت زدہ نہ کرنا۔ آپس میں اتفاق رکھنا اور اختلاف سے بچنا۔۔۔ ان کے علاوہ ان کو اپنے فرائض بھی سمجھا دیتے تھے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ حضورؐ حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجنے لگے تو ان سے پوچھا "معاذؓ مقدمات کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟"

انہوں نے عرض کیا، "قرآن مجید کی رُو سے۔" حضورؐ نے پوچھا "اگر قرآن میں تمہیں اس مسئلہ کے بارے میں کوئی حکم نہ ملے تو کیا کرو گے؟"

"انہوں نے عرض کیا، "حضورؐ کی احادیث کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔"

حضورؐ نے فرمایا، "اگر حدیث میں بھی کوئی ہدایت نہ ملے؟" عرض کیا "یا رسول اللہ! پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔"

ارشاد ہوا "اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے رسولؐ کے صحابی کو اس چیز کی توفیق دی جس کو اللہ کا رسول محبوب رکھتا ہے۔"

مملکت اسلامیہ کے بڑے صوبے یہ تھے، مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، بحرین عمان، تیماء، نجران، یمن (حضورؐ نے اس کو پانچ حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا، صنعاء، حضرموت، جند، کندہ وصدف، زبید، عدن اور ساحلی علاقے)

مدینہ منورہ مملکت کا مرکز تھا۔ خاص شہر اور اس کے نواحی علاقوں کے انتظامات ومعاملات کی انجام دہی ونگرانی خود ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے تھے۔ دوسرے مقامات کے عمّال کے فرائض کا دائرہ بہت وسیع ہوتا تھا۔ وہ ملکی انتظام، قضا اور تحصیلِ خراج و زکوٰۃ وغیرہ کے علاوہ تبلیغِ اسلام اور تعلیم دین کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ اگر کوئی عامل مہاجرین میں سے ہوتا تو حضورؐ اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔ ۹ھ ہجری میں حضورؐ نے ولاۃ کے علاوہ زکوٰۃ، جزیہ، صدقہ وغیرہ وصول کرنے کے لیے ہر ایک قبیلہ کے لیے الگ الگ محصّل مقرر فرمائے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

حضرت عمرؓ فاروق (شہر مدینہ) حضرت ابو عبیدہؓ بن الجرّاح (نجران) حضرت عمروؓ بن العاص (بنو فزارہ) حضرت عدیؓ بن حاتم (بنو طے و بنو سعد) حضرت عبداللہؓ بن اللتبیہ (بنو ازد) حضرت عبادؓ بن بشر (بنو سلیم و بنو مزینہ) حضرت ابو جہمؓ بن حذیفہ (بنو لیث) حضرت ضحاکؓ بن سفیان (بنو کلاب) حضرت بریدہؓ بن حصیب (بنو غفار و بنو اسلم) حضرت بسرؓ بن سفیان (بنو کعب) وغیرہ۔

حضورؐ نے اپنے خاندان پر زکوٰۃ و صدقہ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ اسی لیے آپؐ نے خاندان کے کسی فرد کو کبھی زکوٰۃ و صدقہ کا محصّل مقرر نہیں فرمایا۔

محصّلین زکوٰۃ و جزیہ کو روانہ کرتے وقت آپؐ ایک فرمان عطا فرماتے تھے جس میں زکوٰۃ و صدقہ کی تحصیل کے بارے میں مفصّل احکام درج ہوتے تھے۔ ان عُمّال و محصّلین کو بقدرِ ضرورت معاوضہ دیا جاتا تھا اور وہ مقررہ معاوضہ سے ایک حبّہ بھی زیادہ نہیں لے سکتے تھے۔ ان کو ہدایا و تحائف لینے کی بھی ممانعت تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کے ایک محصّلِ زکوٰۃ و جزیہ نے لوگوں سے کچھ ہدیے قبول کر لیے جب وہ واپس آ کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے تو عرض کی:

"یا رسول اللہؐ! اتنا سرکاری مال وصول کر کے لایا ہوں اور اتنا مال لوگوں نے مجھے بطور ہدیہ دیا ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا، "یہ تمہیں گھر بیٹھے کیوں نہیں مل گیا؟" چنانچہ آپؐ

نے ان سے سب مال لے کر بیت المال میں جمع کرا دیا اور پھر مجمع عام میں ایک خطبہ دیا جس میں لوگوں کو اس طرح سے ہدیے لینے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ حضورؐ نے کسی قسم کے واجبات وصول کرنے کے لیے تشدد کی بھی قطعی ممانعت فرما دی تھی۔

عہدِ رسالت میں حضورؐ ہی عدلیہ کے سربراہ تھے اور آپؐ ہی قاضیوں کا تقرر فرماتے تھے۔ آپؐ نے جن صحابہؓ کو وقتاً فوقتاً قضا کی خدمت سونپی ان میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت اُبیؓ بن کعب اور حضرت معاذؓ بن جبل کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے عہدیداروں کے علاوہ حضورؐ نے مبلغین اور معلمین کی ایک جماعت بھی بطور خاص تیار کی۔ اس جماعت کے اصحاب مختلف قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور لوگوں کو دینی تعلیم دیتے تھے۔ حضورؐ نے ائمۂ نماز کے تقرر کا بھی سرکاری سطح پر اہتمام کیا۔ امامِ نماز کے انتخاب کے لیے آپؐ نے یہ اصول مقرر فرمائے تھے۔

(۱) جو سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہو۔ اگر اس میں سب برابر ہوں تو

(۲) جو سب سے زیادہ سنت سے واقف ہو۔ اگر اس میں سب برابر ہوں تو

(۳) جس نے پہلے ہجرت کی ہو اگر اس میں بھی کوئی فوقیت نہ رکھتا ہو تو

(۴) جس کی عمر زیادہ ہو (صحیح مسلم)

بڑی بڑی مسجدوں میں آپؐ نے مؤذن کا عہدہ بھی قائم فرما دیا تھا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ مسجد نبوی کے مؤذن تھے، حضرت سعد القرظؓ مسجد قباء کے اور ابو محذورہ جمحیؓ مسجد الحرام مکہ معظمہ کے مؤذن تھے۔

(ج) آمدنی اور خرچ (صیغۂ مالیات)

عہدِ نبوّت میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے غنیمت، فے، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج۔

غنیمت کا مال صرف فتوحات کے مواقع پر آتا تھا۔ اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے تھا۔ (الانفال آیۃ ۴۱)

باقی تمام مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

فے۔ دشمن کا جو مال بغیر جنگ کے ہاتھ آتا فے کہلاتا تھا۔ یہ تمام کا تمام غریبوں، مسکینوں، دوسرے مستحقین اور اُمورِ خیر پر صرف کیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر فرض تھی اور مقررہ نصاب کے مطابق چار مدّوں سے وصول کی جاتی تھی۔ نقد روپیہ (بشمول سونا چاندی) باغوں اور زمین کی پیداوار، مویشی اور اسبابِ تجارت۔

۲۰ مثقال سونے، دوسو درہم چاندی اور ۵ اونٹوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں تھی۔

غلام اور گھوڑے بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے بشرطیکہ وہ تجارت کے لیے نہ رکھے گئے ہوں۔

سبزی اور ۵ وسق (تقریباً ۱۸ من) سے کم پیداوار پر بھی زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی۔

زکوٰۃ جہاں سے وصول کی جاتی تھی وہیں کے مستحقین پر صرف کر دی جاتی تھی۔

قرآنِ حکیم کے مطابق مستحقین میں فقراء و مساکین، مقروض، مسافر، نومسلم، غلام جن کو خرید کر آزاد کرنا مقصود ہو، اور محصلینِ زکوٰۃ (بمدِ تنخواہ) شامل تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے اُمورِ خیر پر صرف کی جاتی تھی۔

جزیہ وہ رقم تھی جو مقررہ شرح پر غیر مسلموں سے ان کی حفاظتِ مال و جان کے عوض لی جاتی تھی۔ بچے، عورتیں اور مذہبی خُدّام اس سے مستثنیٰ تھے۔

خراج۔ عہدِ نبوّت میں خراج زمین کی پیداوار کے اس حصے کو کہتے تھے جو غیر مسلم کاشتکاروں سے حقِ مالکانہ کے عوض لیا جاتا تھا۔ اس حصے کی مقدار باہمی سمجھوتے کے ذریعے طے کی جاتی تھی۔

(د) احتساب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی الگ محکمہ تو قائم نہیں فرمایا تھا البتہ آپؐ بذاتِ خود اپنے خلق عظیم کے باوجود معاملات و اخلاقیات کی نگرانی نہایت سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنی اصلاحات پر عمل کراتے تھے اور جو نہ کرتا اسے سزا دیتے تھے۔ ایک دفعہ بازار تشریف لے گئے۔ ایک جگہ غلے کا ڈھیر دیکھا، اس کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نمی محسوس ہوئی، پوچھا "یہ کیا ہے؟" دکاندار نے عرض کیا: "بارش کی وجہ سے بھیگ گیا ہے۔"

فرمایا، "تو پھر اسے اوپر کیوں نہ کر لیا تھا کہ لوگوں کو نظر آئے۔

جو لوگوں کو فریب دے وہ ہم میں سے نہیں۔" (صحیح مسلم)

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات کتب حدیث میں ملتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت قیسؓ بن سعدؓ انصاری جو بڑے قوی الجثہ تھے، ہمیشہ آپؐ کے ساتھ رہتے تھے تاکہ مجرموں اور خطاکاروں کو پکڑیں قیسؓ گویا پولیس کی حیثیت رکھتے تھے۔

مسلمانوں کے باہمی تنازعات کا بھی آپ سختی سے محاسبہ فرماتے تھے۔ ان کو ایک دوسرے سے الجھنے کی ممانعت فرماتے تھے اگر وہ باز نہ آتے تو بزور روک دیتے یا فریقین میں مصالحت کرا دیتے تھے۔

(ر) کتابت و انشاء

ملکی نظم و نسق میں کتابت و انشاء کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاجِ ثبوت نہیں۔ حضورؐ نے بھی اس شعبہ پر خصوصی توجہ دی اور بڑے بڑے صحابہؓ کو کتابت و انشاء کی خدمت تفویض فرمائی۔ یہ حضرات وحی کی کتابت بھی کرتے تھے، احکام، فرامین اور معاہدے بھی لکھتے تھے اور بادشاہوں اور رئیسوں

کے نام مکاتیب بھی قلمبند کرتے تھے۔

(س) اشاعت تعلیم

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن رحمت عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تحصیل علم کو جہاد کا درجہ دے دیا اور فرمایا کہ طلب علم ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے۔ آپؐ نے طلب علم کو مہد سے لحد تک جاری رکھنے کی تلقین فرمائی اور علم کی فضیلت یوں بیان فرمائی کہ طالبانِ علم کے لیے فرشتے اپنے بال و پر فرشِ راہ کرتے ہیں۔

ایک موقع پر فرمایا کہ:

"عالم کو عابد پر اتنی فضیلت حاصل ہے جتنی مجھ کو تم سے کسی معمولی فرد پر حاصل ہے۔"

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نگاہ میں تعلیم کی کیا اہمیت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ بدر میں قید ہونے والے پڑھے لکھے نادار مشرکین سے رہائی کے لیے یہ فدیہ لیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ مدینہ منورہ میں آپؐ نے حضرت سعیدؓ بن العاص کو خاص اس مقصد کے لیے مامور فرمایا کہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر کے بعد آپؐ نے باقاعدہ ایک درسگاہ قائم فرمائی جس میں اصحاب صُفّہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس درسگاہ میں مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے لوگ بھی اکتساب علم کے لیے آتے تھے اور ضروری نصاب کی تکمیل کے بعد اپنے وطن واپس جاتے تھے۔ بیرونی قبائل کی درخواست پر ان کی تعلیم کے لیے مدینہ سے بھی معلمین بھیجے جاتے تھے۔ حضورؐ نے کاتب وحی حضرت زیدؓ بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے یہ زبان چند دنوں میں سیکھ لی۔

اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں حضورؐ کی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپؐ کے وصال کے وقت ہزاروں ایسے صحابہ موجود تھے جو عالم ہونے کے ساتھ باقاعدہ حضورؐ کی حدیثیں لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور خواتین بھی۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے بہت جلد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی زمامِ کار سنبھال لی۔

(ص) زراعت، شجرکاری اور متفرق فلاحی کام

عرب ایک وسیع و عریض ملک تھا اور اس کا بیشتر حصہ ریگستان اور بے آباد تھا۔ حضورؐ نے لوگوں کو بکثرت جاگیریں عطا فرمائیں اور افتادہ زمینیں آباد کرنے کی ترغیب دی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:
"اگر کسی کے پاس زمین ہو تو اس کو چاہیے کہ اس کی کاشت کرے ورنہ اپنے کسی بھائی کو دے دے۔" (یعنی زمین بے کار نہ پڑی رہے) اسی طرح آپؐ نے لوگوں کو شجرکاری کی تلقین فرمائی۔ حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"جب ایک مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس میں سے پرند، انسان یا کوئی چوپایہ کھاتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔" (صحیح بخاری)

حضورؐ نے آب رسانی کے بھی خاص انتظام فرمائے اور لوگوں کو فراہمیٔ آب کے سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی تلقین فرمائی۔ آپؐ نے دو تین مرتبہ مردم شماری بھی کروائی اور ایک رجسٹر میں تمام لوگوں کے نام درج کرنے کا حکم دیا۔ تعمیر مساجد کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ باہر سے آنے والے اور دوسرے لوگوں کی مہمانداری کا مستقل انتظام فرمایا۔ حفظانِ صحت اور پاکیزگی کے اصول لوگوں کو سمجھائے اور ان پر عمل کرایا۔ مریضوں کی عیادت اور مرنے والوں

کی تجہیز و تکفین میں شرکت کو آپؐ نے دینی فریضہ بنا دیا۔

⑥ شوریٰ

شوریٰ کے لغوی معنی ہیں وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے اور مشورہ کے معنی ہیں ایک دوسرے کی طرف رائے کو پھیر کر رائے نکالنا یا حاصل کرنا (راغب اصفہانی) اللہ تعالیٰ نے شوریٰ کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ قرآنِ حکیم کی ایک سورۃ کا عنوان ہی "الشوریٰ" قرار دیا ہے اس میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے:

"مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔"

سورۃ آلِ عمران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

"اور اے نبی ان سے معاملات میں مشورت کرو۔"

چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی، خانگی، اجتماعی اور ملی زندگی میں ہمیشہ شوریٰ کو اپنے دستور العمل کا لازمی حصہ قرار دیا۔ غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ احزاب، یوم حدیبیہ، واقعۂ افک ہر موقع پر آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے حضور کی صحابہؓ سے مشورت کے واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ مہبطِ وحی تھے اور انسانی رائے و مشورہ کے محتاج نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ سب سے زیادہ کثیر المشاورۃ تھے۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ چنانچہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں کسی حکومت کا یہ دعویٰ کہ وہ اسلامی ہے اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ شوریٰ کو اپنے نظامِ حکومت کا لازمی اصول بنا لے۔

(۷) داخلی اور خارجی حکمتِ عملی

اگرچہ پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عرب پر سیاسی غلبہ فتح مکہ (۸ھ ہجری) کے بعد حاصل ہوا لیکن اسلامی ریاست کی تاسیس اسی دن سے ہو گئی تھی جس دن آپؐ نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا۔ اس اسلامی ریاست کی بنیاد اس پیمانِ وفا پر رکھی گئی جو بیعتِ عقبۂ کبیرہ (۱۳ سنہ بعدِ بعثت) میں مدینہ کے اہلِ ایمان نے حضورؐ سے باندھا تھا۔ وہ جہاں آپؐ کی رسالت پر صدقِ دل سے ایمان لائے وہاں اپنی جانوں، مالوں، اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی اطاعت اور تائید و حمایت کا عہد بھی کیا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے جہاں ان کو جنّت کی بشارت دی وہاں ان سے یہ وعدہ بھی فرمایا کہ میں دکھ سکھ، صلح و جنگ، مرنے جینے ہر حال میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ یہ ایک قسم کا عمرانی معاہدہ تھا جو آپؐ کے اور اہلِ مدینہ کے مابین قرار پایا، چنانچہ آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اللہ کے برگزیدہ رسولؐ ہونے کے ساتھ آپؐ مدینہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ بھی تھے۔ وُرُودِ مدینہ سے آپؐ کے وصال تک کے عرصے میں یہ اسلامی ریاست وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے سارے عرب بشمول یمن، بحرین، عمان وغیرہ کو بھی اپنے احاطے میں لے لیا۔ اس دوران میں حضورؐ نے تبلیغِ حق، تزکیۂ نفوس، اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و کردار کے ساتھ ساتھ اسلامی مملکت کی داخلی و خارجی حکمتِ عملی کی تشکیل جن خطوط پر فرمائی وہ یہ ہیں:

(ا) بنیادی حقوق

آپؐ نے مملکت کے تمام مسلم و غیر مسلم باشندوں کو رنگ، نسل، وطن

یا دنیوی حیثیت کے امتیاز کے بغیر وہ تمام بنیادی حقوق عطا کیے جو قرآن حکیم نے متعین کیے ہیں۔ مثلاً جان و مال، عزت و آبرو اور نجی زندگی کا تحفظ، عورتوں، غلاموں اور زیر دستوں کے حقوق کا تحفظ، عقیدہ کی آزادی کا حق، مذہبی دلآزاری سے تحفظ، حاجت مندوں، مسکینوں اور معذوروں کے لیے وسائلِ ریاست سے متمتع ہونے کا حق وغیرہ۔

ب) غیر مسلموں سے معاہدے

اسلام چونکہ "دین میں کوئی جبر نہیں" کا علمبردار ہے اس لیے حضورؐ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے دائرۂ اسلام میں لانے کی حکمتِ عملی کبھی اختیار نہیں کی، تاہم قرآن کریم اسلامی مملکت کے باشندوں پر حکومت کے جو حقوق عائد کرتا ہے آپؐ نے غیر مسلموں سے وہ حقوق پورے کرنے کا مطالبہ ضرور کیا۔ قرآن کی رو سے باشندوں پر حکومت کے بڑے بڑے حقوق یہ ہیں:

- وہ اس کی اطاعت کریں۔
- قانون کی پابندی کریں اور امنِ عامہ میں خلل نہ ڈالیں۔
- اس کے تمام اچھے کاموں میں تعاون کریں۔
- رفاہی امور میں جان اور مال سے اس کی مدد کریں۔

عہدِ رسالتؐ میں مسلمانوں کو دو قسم کے غیر مسلموں سے واسطہ پڑا۔ کفار و مشرکین اور اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کفار و مشرکین چونکہ خدائے واحد پر عقیدہ رکھنے کی بنیاد ہی کے منکر ہیں اس لیے ان سے حکومتِ الٰہیہ کی اطاعت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی اسلام ان سے اس وقت تک لڑائی کی اجازت نہیں دیتا جب تک وہ دعوتِ اسلام میں مزاحم نہ ہوں اور مسلمانوں کو اذیت نہ دیں۔ اگر وہ برسرِ جنگ نہ ہوں

تو ان سے نیکی اور انصاف کی بنیاد پر معاہدہ کرنا بھی جائز ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے۔

"مشرکین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ وفا کرنے میں کوئی کمی نہ کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے عہد کو معاہدے کی مدت تک پورا کرو۔" (التوبہ)

مشرکینِ مکہ نے نہ صرف دعوتِ حق کی زبردست مخالفت کی بلکہ مسلمانوں کو سخت اذیتیں بھی دیں یہاں تک کہ وہ وطن سے نکلنے پر مجبور ہو گئے انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بار بار مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے یہی سبب تھا کہ حضورؐ نے انہیں ایک دشمن اور معاند قوم کی حیثیت دی اور ان سے قتال روا رکھا، لیکن جب ۶ سنہ ہجری میں انھوں نے مسلمانوں سے صلح کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو حضورؐ نے بھی صلح کرنے سے انکار نہیں فرمایا اور یوں صلح نامۂ حدیبیہ معرضِ وجود میں آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مشرکین نے صلحنامہ کی پابندی نہ کی اس لیے حضورؐ کو انہیں مطیع کرنے کے لیے طاقت استعمال کرنا پڑی۔ تاہم ان کو مغلوب کرنے کے بعد حضورؐ نے ان سے جو حسنِ سلوک کیا۔ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اب رہے اہلِ کتاب تو عرب میں ان کے دو بڑے گروہ تھے یہود و نصاریٰ حضورؐ نے ان دونوں قوموں سے امن و صلح اور باہمی تعاون کے معاہدے کیے۔ وُرُودِ مدینہ کے بعد تمام شہریوں (بشمول یہود) کی رضامندی سے ایک منشور (تحریری دستور) مرتب فرمایا۔ جس نے تاریخ میں "میثاقِ مدینہ" کے نام سے شہرت پائی۔ اس میثاق کی ۵۳ دفعات تھیں۔ پہلی چند دفعات مہاجرین و انصار سے متعلق تھیں اور باقی میں یہودیوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا تھا۔ ان میں سے چند اہم دفعات یہ تھیں:

(۱) یہودیوں کو مکمل مذہبی آزادی ہو گی۔

- شہری اور ثقافتی معاملات میں مسلمانوں اور یہودیوں کے حقوق ایک جیسے ہوں گے۔
- یہودی قریشِ مکہ یا ان کے کسی حلیف کی مدد نہیں کریں گے۔
- مدینہ پر کوئی دشمن چڑھ آئے گا تو یہودی اور مسلمان مل کر اس کا مقابلہ کریں گے البتہ ہر ایک اپنے مصارفِ جنگ خود برداشت کرے گا۔
- اگر فریقین کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

میثاق کی رو سے یہودِ مدینہ نے حضورؐ کی سیادت اور بالا دستی کو تسلیم کیا لیکن بدقسمتی سے یہ لوگ اپنے عہد پر قائم نہ رہے۔ جس کے نتیجے میں بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلا وطن ہونا پڑا۔ بنو قریظہ نے نہ صرف عہد شکنی کی بلکہ غزوۂ احزاب کے موقع پر مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی پاداش میں ان کے لڑنے والے آدمیوں کو قتل کیا گیا۔

۷ سنہ ہجری میں خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیما کے یہودیوں سے صلح کے معاہدے ہوئے۔ ان کی رُو سے بھی یہودیوں کو پوری پوری مذہبی آزادی اور دوسرے حقوق دیئے گئے، البتہ یہ شرطیں عائد کی گئیں کہ انہیں اسلامی حکومت کی رعیت بن کر رہنا ہوگا اور پیداوار کا نصف حصہ مالکوں کو دینا ہوگا۔ (اس وقت تک جزیہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔)

۹ سنہ ہجری میں نجران، دومۃ الجندل، ایلہ، مقنہ، جربا، اذرح، تبالہ، جرش اور یمن کے عیسائیوں اور یہودیوں سے صلح کے معاہدے ہوئے۔ بحرین کے مجوسیوں کو بھی معمولی سالانہ جزیہ (ہر عاقل، بالغ، مستطیع مرد پر ایک دینار سالانہ) کے عوض ہر قسم کے حقوق دیئے گئے۔ اسی طرح حضورؐ نے متعدد قبائل سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ گویا آپؐ کی داخلی

حکمتِ عملی سراسر امن و صلح پر مبنی تھی اور اس کا مقصد آس پاس کے علاقوں پر طاقت کے بل پر قبضہ جمانا نہ تھا۔ اس حکمتِ عملی نے تمام اہلِ عرب بالخصوص مسلمانوں کو رشتۂ اتحاد میں پرو دیا، اور ملک سے بدامنی کا خاتمہ ہو گیا۔

جہاں تک حضورؐ کی خارجہ حکمتِ عملی کا تعلق ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا احاطہ کرنا ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتابوں "عہدِ نبوی کا نظامِ حکمرانی" اور "رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس تفصیل کے مطابق آپؐ کی خارجہ حکمتِ عملی کے نمایاں پہلو یہ تھے۔

(۱) آپؐ نے عرب کی سرحدوں کو بیرونی خطرات سے محفوظ کر دیا۔

(۲) یمن، عمان، اور بحرین کو (جو فی الحقیقت عرب کا حصہ تھے) مجوسی ایران کے پنجے سے نجات دلائی۔

(۳) شام سے متصل عرب علاقوں (دومۃ الجندل، ایلہ، جربا، اذرح وغیرہ) سے رومیوں کے اثر و رسوخ کا خاتمہ کیا۔

(۴) پڑوسی ممالک (حبشہ، ایران، روم اور مصر) کے بادشاہوں کو خطوط لکھ کر دعوتِ اسلام دی اور ساتھ ہی ان پر واضح کیا کہ اگر انہوں نے یہ دعوت قبول نہ کی تو اپنی رعیّت کا وبال انہی کی گردن پر ہو گا۔

(۵) بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے کا موقع دینے کے بجائے آگے بڑھ کر سرحدوں پر اس کا مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ غزوۂ تبوک میں تیس ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ آپؐ کے پُرصعوبت سفر کا مقصد یہی تھا کہ خارج کا مقابلہ اس کی اپنی سرحدوں کے اندر کیا جائے۔

(۶) سفیروں کی جان کے تحفظ کو اپنی حکومت کا اصول قرار دیا۔ اگر

کسی دوسرے حکمران نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس کے خلاف جہاد کیا۔

مسیلمہ کذّاب نے بارگاہِ نبویؐ میں دو سفیر بھیجے۔ انہوں نے گستاخانہ لب ولہجہ اختیار کیا لیکن حضورؐ نے صرف اتنا فرمایا، اگر سفیروں کا قتل روا ہوتا تو میں تم کو قتل کروا دیتا۔

حضورؐ کے سفیر حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی کو حاکمِ بلقاء نے شہید کر ڈالا تو آپؐ نے ان کا انتقام لینے کے لیے تین ہزار کا لشکر روانہ فرمایا۔ سریّہ مُؤتہ اسی سلسلے میں پیش آیا۔

سنہ ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے جو خطبہ دیا وہ حقوقِ انسانی کے دائمی منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر عرفات کے میدان میں سوا لاکھ سے زیادہ مسلمان موجود تھے۔ آپؐ نے ان کو جو ہدایات دیں، ان کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ کی شانِ جہانبانی کیا تھی۔ چند ہدایات ملاحظہ ہوں:

○ تم میں سے زیادہ عزت و کرامت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے ڈرنے والا ہے۔

○ کسی عرب کو عجمی پر، کسی عجمی کو عرب پر، کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت بجز پرہیزگاری (تقویٰ) کے نہیں ہے۔

○ تمہارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام کر دی گئی ہیں۔ میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں کُشت و خون کرنے لگو۔

○ تم سب کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس فرمائے گا۔

○ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اور تم سب ایک اُمّت ہو۔

- جس طرح اپنی بیویوں پر تمہارا حق ہے اسی طرح تمہاری بیویوں کا حق تم پر ہے۔ ان کے ساتھ محبّت اور شفقت کا سلوک کرو۔
- تمہارے لیے اپنے کسی بھائی کی چیز پر قبضہ کرنا جائز نہیں جب تک وہ اپنی خوشی سے تمہارے حوالے نہ کر دے۔
- دیکھو، کسی سے ناانصافی مت کرو۔
- جو خود کھاتے ہو اپنے غلاموں کو کھلاؤ جو خود پہنتے ہو انہیں پہناؤ اور اگر وہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھیں جسے تم معاف نہ کر سکو تو ان سے علیحدگی اختیار کر لو کیونکہ وہ اللہ کے خادم ہیں ان سے بُرا سلوک مت کرو۔
- مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہوگا، باپ کے بدلے بیٹا اور بیٹے کے بدلے باپ نہیں پکڑا جائے گا۔
- قرض ہر حالت میں ادا کرو، عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرو۔ تحفے کا بدلہ دو، کسی کے ضامن بنو تو تاوان ادا کرو۔
- اگر تم کتاب اللہ پر قائم رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے، دینی معاملات میں غلو سے بچنا۔

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ معیشت

تاریخ عالم پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک روئے زمین پر بیسیوں انقلابات برپا ہوئے جن کے نتیجے میں بعض قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، بعض قعرِ مذلّت سے نکل کر اوجِ ثریا تک جا پہنچیں، بعض غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوئیں، اور بعض آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر ادبار و نکبت کا شکار ہو گئیں۔ برپا ہونے والے بڑے بڑے انقلابات کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بعض انقلاب محض سیاسی تھے، بعض محض اقتصادی، بعض محض ثقافتی اور بعض محض تعزیری وعلیٰ ہٰذا القیاس مگر آج سے چودہ سو سال پہلے جو انقلاب سرورِ کائنات فخرِ موجودات جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا، اُس سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب اس روئے زمین پر آج تک برپا نہیں ہوا۔ یہ انقلاب اخلاقی بھی تھا اور معاشرتی بھی۔ مادی بھی تھا اور روحانی بھی، سیاسی بھی تھا اور اقتصادی بھی، طبیعیاتی PHYSICAL بھی تھا اور مابعد الطبیعیاتی (META PHYSICAL) بھی۔ غرض یہ انقلاب زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ پہلے اس نے ریگ زارِ عرب کی کایا پلٹی اور پھر یہ سارے عالم کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور منارۂ نور بن گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فی الحقیقت محسنِ انسانیت تھے آپؐ کے برپا کیے ہوئے انقلاب کا خاص الخاص پہلو کفالتِ عامہ کے ایک انتہائی مؤثر اور حیات بخش نظام کا قیام ہے۔ اصطلاحی طور پر کفالتِ عامہ سے مراد ہے عام لوگوں یا مخلوقِ خدا کی مادّی ضروریات

کو پورا کرنا اور کفالتِ عامہ کے مؤثر نظام کا مطلب ہے فرسودہ نظام معیشت میں انقلابی تبدیلیاں لاکر اسلامی نظامِ معیشت قائم کرنا۔ اسلامی نظام معیشت کو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا، ہم بلا تأمل ایسا فلاحی نظام کہہ سکتے ہیں جو بیک وقت روحانی بھی تھا، اخلاقی بھی اور معاشی بھی۔ یہ تینوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط بلکہ ایک دوسرے کا جزوِ لاینفک ہیں کہ کسی ایک کے بھی بغیر اسلامی نظامِ معیشت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر تھی قرآن پاک کے احکام و منشاء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں سر مو فرق نہ تھا۔ آپؐ نے جو انقلاب برپا فرمایا یا جو نظام قائم فرمایا وہ یکسر قرآنی انقلاب یا قرآنی نظام تھا۔ قرآنِ پاک بنی نوعِ انسان کو معاش اور معیشت کا جو تصور دیتا ہے وہ اخلاقی اور روحانی دستور العمل ہے جو روح اور جسم دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اور دونوں کی نشو و نما اور بالیدگی کی ضمانت دیتا ہے۔ محسنِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے مطالعے سے معیشت میں آپؐ کے لائے ہوئے انقلاب کا جو نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے اس کا بنیادی نقطہ رزقِ حلال اور جائز ذرائع سے اس کے حصول کے لیے جدّ و جہد ہے۔ لیکن بات کسبِ حلال ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اسلام جائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال پر بھی انسان کو کلی تصرف (در اختیار) نہیں دیتا بلکہ اس پر کچھ ایسی شرائط اور پابندیاں عائد کرتا ہے جن پر عمل کرنے سے معاشرہ ایک ایسی جنت بن جاتا ہے جس میں شرفِ انسانی کا احترام بھی ہے اور انسان کی روحانی اور معاشی احتیاج کا علاج بھی۔ اس میں غریب پر زندگی دوبھر نہیں ہوتی اور امیر، امیر تر اور خزانے کا سانپ بننے کا موقع نہیں پا سکتا وہ غریبوں کو اپنی دولت میں حصہ دار بنانے پر مجبور

ہوتا ہے۔ اس میں کمزوروں، اپاہجوں، بوڑھوں، بے روزگاروں، یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ قوم کے غیر مسلم افراد بھی مسلمانوں کی طرح بیت المال سے اپنی احتیاج پوری کر سکتے ہیں۔ اسلامی نظامِ معیشت کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:-

(ا) رزقِ حلال

اسلام نے اُسی رزق کو حلال قرار دیا ہے جو نہ صرف دیکھنے میں پاکیزہ اور حلال ہو بلکہ اسے حاصل بھی جائز طریقوں سے کیا گیا ہو اور پھر اس میں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی ادا کیے گئے ہوں۔ جائز ذرائع سے رزقِ حلال کے لیے تگ و دو کرنے کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ حلال چیز بھی حرام ہو جاتی ہے۔ یہ ناجائز ذرائع ہیں ملاوٹ، غبن، قمار بازی، ذخیرہ اندوزی، دھوکے بازی، کم تولنا کم ماپنا رشوت خوری، کام چوری، کسی کا حق غصب کرنا، اپنے اختیارات کا غلط استع ان چیزوں کا کاروبار جو شریعت نے حرام قرار دی ہیں۔ حضور نے ہاتھ کی کما کو سب سے بہتر کمائی اور مزدور اور محنت کش کو اللہ کا دوست قرار دیا۔

(ب) نظامِ زکوٰۃ

زکوٰۃ ہر صاحبِ حیثیت یا صاحبِ نصاب پر فرض قرار دی گئی۔ یہ ہر غریب کا حق اور حاجت مندوں، معذروں اور یتیموں کی کفالہ کا ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے حُبِّ مال کم ہوتی ہے اور ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح نماز حقوق اللہ کا مغز ہے اسی طرح زکوٰ حقوق العباد کا مغز ہے۔ صحیح خطوط پر نظامِ زکوٰۃ کا قیام نہ صرف محتہ

اور غریبوں کی کفالت کا ضامن بلکہ گداگری کے خاتمہ کا بھی مؤثر ذریعہ ہے۔

ج) اِنفاق فی سبیل اللہ

اس کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور دولت مندوں سے کہا گیا ہے کہ تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن کو تم عزیز رکھتے ہو۔ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی اغنیا کو بار بار تاکید فرمائی کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و منال ہے اس میں غریبوں، یتیموں اور مسکینوں کا بھی حق ہے، ان کا حق انہیں لوٹا دو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ نکال کر اپنے آپ کو فارغ نہ سمجھ لو بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی بے دریغ صدقہ وخیرات کرتے رہا کرو۔

قرآنِ پاک میں بُخل، مال کو سینت سینت کر رکھنے اور یتیموں اور مساکین سے بدسلوکی کرنے کی سخت مذمّت کی گئی ہے۔ سورۂ ہُمَزہ میں ارشاد ہوا ہے، ہلاکت ہے ہر عیب چینی اور غیبت کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا اور اس کو گِن گِن کر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی بخش دے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

سورۂ ماعون میں فرمایا گیا ہے، کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو جزا کے دن کو جھوٹ سمجھتا ہے۔ یہی ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو خود کھانا کھلانا تو درکنار اس کی ترغیب بھی نہیں دیتا تو ایسے شخص کے لیے ہلاکت ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے ہر شخص کے پاس صبح کے وقت روزانہ دو فرشتے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے یا اللہ سخی کو نعم البدل عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے، یا اللہ کنجوس

کے مال کو تباہ کر دے۔

گویا رزقِ حلال، اِنفاق فی سبیل اللہ، سخاوت و ایثار، صلۂ رحمی، باہمی ہمدردی اور خدمتِ خلق، نظامِ زکوٰۃ کے ساتھ مل کر ایسا نظامِ معیشت وُجُود میں لاتے ہیں جس میں دُنیوی اور اُخروی خیر و فلاح کا راز مضمر ہے۔ رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی تاسیس کے بعد یہی نظامِ معیشت اس شان سے قائم فرمایا کہ زمین اللہ کے نُور سے جگمگا اٹھی اور ہر طرف رحمت و برکت کے سوتے پھوٹ نکلے یہاں تک کہ ملک بھر میں کوئی زکوٰۃ اور خیرات لینے والا بہت مشکل سے ملتا تھا۔

عہدِ رسالت کے تفریحی مشاغل

اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے وہ انسان کو وہم و خیال کے دائرے میں بند کر کے خلوت نشینی کی تلقین نہیں کرتا، بلکہ اس کو حقائق اور واقعات کی دنیا میں رہنا سکھاتا ہے مسلمان کہلانے والے کسی انسان کی زندگی جدوجہد، سعی و عمل اور سرگرمی سے خالی ہو، تو ہم ایسی زندگی کو اور تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں، لیکن اسلامی ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ فی الحقیقت اسلام سرتا پا جہاد اور مجاہدہ ہے، لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہمارے سامنے ہے۔ صحابہ کرام رض کی کتابِ سیرت کے ابواب ہمارے سامنے کھلے ہیں۔ اس عالمِ رنگ و بو کی وہ کون سی حقیقت اور کونسا مسئلہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان پاک زندگیوں میں ہمارے لیے نمونہ نہیں؟

آج بعض ذہنوں میں یہ غلط خیال بیٹھ گیا ہے یا بعض لوگ کسی خاص مقصد کے تحت نژادِ نو کے ذہنوں میں یہ غلط تاثر پیدا کر رہے ہیں کہ اسلام انسانی فطرت کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور معاشرے میں یبوست اور رہبانیت پیدا کرتا ہے، نہ وہ لوگوں کو تفریح کی اجازت دیتا ہے اور نہ اس میں جسم و روح کے لطف و انبساط اور نشاط کے لیے کوئی گنجائش ہے۔ اس غلط خیال کے زیرِ اثر نوجوانوں کو یہ کہتے سنا

جاتا ہے کہ اسلام تو بڑا خشک مذہب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینِ فطرت ہونے کی حیثیت سے اسلام انسانوں کی فطرت اور طبائع کا پورا پورا لحاظ کرتا ہے اور وہ انہیں عبادات و فرائض کے ساتھ ساتھ تفریحی مشاغل کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اس نے ایسے تمام تفریحی مشاغل جائز قرار دیئے ہیں جن سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو اور جو معاشرے میں خرابی پھیلانے کا باعث نہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے تصورِ تفریح اور مغرب کے تصورِ تفریح میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلام جن تفریحی مشاغل کی اجازت دیتا ہے، ان سے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں اور انسان حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور پر تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ دوسری طرف مغربی طرز کی بیشتر تفریحات (سینما، رقص و سرود، کلب، شاہد و شراب وغیرہ) سے وقتی طور پر تو نشاط حاصل ہوتی ہے لیکن انسان ایک ایسے عصبی تناؤ میں مبتلا ہو جاتا ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ایسی تفریحات معاشرے میں بے حیائی، فحاشی اور انارکی پھیلانے کا باعث ہوتی ہیں۔

مغرب زدہ انسان کی روح سکون سے نا آشنا ہو چکی ہے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے اور بے یقینی کی کیفیت ہر کہ ومہ پر طاری ہے۔ آج ہمارے جو لوگ مغربی انداز کی تفریحات میں کشش محسوس کرتے ہیں وہ اسلام کی برکات سے بے خبر ہیں اسی لیے اپنے معاشرے کو مغربی معاشرے کی طرز پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام جن روحانی اور جسمانی فوائد سے متمتع کرتا ہے، مغربی معاشرے میں ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اسلام کا انسانِ مطلوب اللہ کا اطاعت گزار بندہ اور راہِ حق کا مجاہد ہوتا ہے۔ وہ صرف وہی تفریحی

مشاغل اختیار کر سکتا ہے جن سے اُس کا تعلق اللہ سے کسی صورت میں بھی نہ ٹوٹتا ہو۔

قرآن کریم کی رُو سے ہمارے لیے رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کا اُسوۂ حسنہ ہی بہترین نمونہ ہے۔ اسی پر عمل کرنے میں ہماری نجات ہے اور یہی ہمارا ذریعۂ فوز و فلاح ہے۔

آج اسلام کے تصورِ تفریح کو سمجھنے کے لیے لامحالہ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جناب رسالت مآب صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کے عہد میں مسلمانوں کے تفریحی مشاغل کیا تھے اور حضورؐ کا طرزِ عمل اُن کے بارے میں کیا تھا۔ اسے پیشِ نظر رکھ کر ہم اپنے تفریحی مشاغل کے حدود کا تعین کر سکتے ہیں۔

رحمتِ دو عالم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے مردانہ ورزشوں اور کھیلوں کی حوصلہ افزائی فرمائی اور بعض میں خود حصہ لیا۔ یہ ورزش اور کھیل مسلمانوں کے لیے تفریحِ طبع کا سامان بھی مہیا کرتے اور اُن کی عبادات و واجبات کو مستعدی سے ادا کرنے پر بھی تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ جسمانی قوت میں اضافے کا موجب ہوتے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ قوی مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ اچھا اور محبوب ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں ہر وہ کسرت اور کھیل جائز ہے جس سے جسمانی قوت حاصل ہو۔ قاضی سلمان منصور پوریؒ نے "رحمۃ للعالمین" میں لکھا ہے کہ حضورؐ لوگوں کو مردانہ ورزشوں کا شوق دلایا کرتے۔

رکانہ عرب کا مشہور شہ زور پہلوان تھا۔ وہ اپنے پچھڑ جانے کو اسلام لانے کی شرط ٹھہراتا تھا۔ حضورؐ نے اس سے کشتی لڑی اور تین بار پچھاڑ دیا۔ یہ رکانہ فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ سیرابن اسحٰق میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ امام ترمذیؒ، امام ابوداؤدؒ اور

قاضی عیاض ؒ نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس قسم کا ایک واقعہ علامہ سُہَیلی ؒ نے بھی "روض الانف" میں قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابوالاشد جُمحی جس کا نام کلدہ تھا۔ اس کی جسمانی قوت اس قدر تھی کہ وہ گائے کے چمڑے پر کھڑا ہو جاتا اور دس دس آدمی مل کر اس چمڑے کو پکڑ کر کھینچتے تاکہ اس کو وہاں سے ہٹا دیں۔ چمڑا اپھٹ جاتا، لیکن وہ شخص اپنی جگہ سے ہلتا نہ تھا۔ اس نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کہا کہ اگر آپ مجھے پچھاڑ دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اُس سے کشتی لڑی اور کئی بار پچھاڑا، مگر وہ مسلمان نہ ہُوا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کشتی کے فن کو خود سیدالانام کی سندِ قبولیت حاصل ہے۔ اہل سیر نے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ وہ کشتی لڑا کرتے تھے۔ فی الحقیقت کشتی ایک اعلیٰ درجے کی مردانہ ورزش ہے جو تفریح اور قوت کے حصول کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

علامہ شبلی ؒ نے "سیرت النبی ﷺ" میں لکھا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کو گھوڑے کی سواری بہت مرغوب تھی اور آپ ﷺ بہت اچھے شہسوار تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حکم سے گھوڑوں کی دوڑ کرائی جاتی تھی، لمبی دوڑ پانچ یا چھ میل کی اور ہلکی دوڑ ایک میل کی ہوتی۔ علامہ شبلی ؒ نے وضاحت کی ہے کہ مدینے سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حصباء سے ثنیۃ الوداع تک چھ میل تھی، وہیں گھڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی۔

مُسند احمد بن حنبل ؒ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ واقعہ منقول ہے کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے گھوڑوں کا مقابلہ کرایا اور آگے نکل جانے والے کو انعام دیا۔

امام دارقطنی ؒ اور امام بیہقی ؒ نے بیان کیا ہے کہ رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سنجہ تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے اُسے بازی میں دوڑایا۔ اس نے بازی جیتی تو آپؐ کو خاص مسرت ہوئی۔

امام احمدؒ نے اپنی مُسندَ میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا کہ خادم رسولؐ حضرت انسؓ بن مالک سے سوال کیا گیا، کیا رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خود بازی لگائی تھی؟ انھوں نے جواب دیا:

"ہاں خدا کی قسم! آپؐ نے ایک گھوڑے کی بازی لگائی تھی جس کا نام سنجہ تھا، چنانچہ وہ دوسرے گھوڑوں پر سبقت لے گیا اور یہ دیکھ کر آپؐ خوش ہو گئے۔"

شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ مباح بازی یہ ہے کہ انعام دوڑ میں حصہ لینے والے فریقین کی جانب سے نہ ہو بلکہ کسی اور یا صرف ایک فریق کی طرف سے ہو، لیکن اگر فریقین کی جانب سے انعام ہو کہ جس کا گھوڑا جیت جائے گا، وہ دوسرے فریق سے اتنی رقم لینے کا حقدار ہو گا تو یہ جُوا ہے جو ممنوع ہے (یعنی شرط لگا کر ریس کرانا حرام ہے) اس سلسلے میں صحیحین کی یہ حدیث قابل غور ہے:

"رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک رحمٰن کے لیے، دوسرا انسان کے لیے اور تیسرا شیطان کے لیے۔ جو گھوڑا رحمان کے لیے ہوتا ہے، وہ اللہ کی راہ میں باندھا جاتا ہے اور جو شیطان کے لیے ہوتا ہے، وہ جُوے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جو انسان کے لیے ہوتا ہے، اُسے آدمی افزائشِ نسل کے لیے پالتا ہے اور وہ اس کی محتاجی دُور کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔"

صحیح بخاری، مُسندِ احمد اور کئی دوسری کتب حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اونٹوں کی دوڑ بھی کرایا کرتے تھے۔ حضورؐ کی خاص سواری

کی اونٹنی عضباء ہمیشہ دوڑ میں سبقت لے جاتی۔ ایک مرتبہ ایک بدّو کا اونٹ دوڑ میں عضباء سے آگے نکل گیا تو مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے کہ جو چیز گردن اٹھائے، اس کو نیچا دکھائے"

صحیح بخاری میں حضرت سلمہؓ بن الاکوعؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کو نشانہ بازی کا شوق دلایا کرتے تھے ——— آپؐ نشانہ بازی کی مشق کے لیے لوگوں کے دو فریق بنا دیتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا: "تیر چلاؤ، میں فلاں فریق کی جانب ہوں گا۔" یہ سُن کر دوسرا فریق تیر چلانے سے رُک گیا۔ وجہ پوچھی گئی، تو انھوں نے عرض کیا، جب اس فریق میں رسول اللہ شامل ہیں تو ہم اس کے مقابلے میں کیونکر تیر چلا سکتے ہیں۔ اس پر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، "تیر چلاؤ، میں تم سب کے ساتھ ہوں"

صحیح مسلم میں حضرت عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کافروں سے لڑنے کے لیے تم اپنی قوّت جس قدر مضبوط کر سکو، کرو۔ خبردار! قوّت تیر اندازی میں ہے، خبردار! قوّت تیر اندازی میں ہے۔

بزّارؒ اور طبرانیؒ نے حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ تم تیر اندازی ضرور سیکھو کہ یہ بہترین کھیل ہے۔

مسندِ ابی داؤد اور نسائی میں حضرت عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ رسولِ مقبول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"جس نے تیر اندازی سیکھ کر بے رغبتی سے اور بے پروائی سے چھوڑ دی تو اُس نے نہ صرف اللہ کی ایک نعمت چھوڑ دی بلکہ کفرانِ نعمت کیا۔"

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں بندوق ایجاد نہ ہوئی تھی۔ تیر بندوق کا کام دیتے تھے۔ دورِ حاضر میں تیر کی جگہ جدید جنگی اسلحے نے لے لی ہے۔ نشانہ بازی کی مشق میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ کوئی انسان یا پالتو جانور اس کا ہدف نہ بننے پائے کیونکہ ایسا ہدف بنانے والے پر حضورؐ نے لعنت بھیجی ہے (بخاری و مسلم) یعنی کسی ذی روح کو تکلیف پہنچا کر اپنی تفریح کا سامان کرنا جائز نہیں۔

پیراکی بھی جسمانی ورزش اور تفریح کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔ سیدنا حضرت عمرؓ فاروق فرمایا کرتے تھے:

"اپنی اولاد کو پیراکی اور تیراندازی سکھاؤ اور اُن سے کہو کہ وہ گھوڑے پر چھلانگ لگا کر سوار ہوا کریں۔" (مسندِ احمد)

دوڑنا اور دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا بھی ایک مفید ورزش ہے۔ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ بہت تیز رفتار تھے اور دوڑنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایسا کرنے کی بخوشی اجازت دے دیتے (مسندِ احمدؒ اور سُننِ ابی داؤد) میں روایت ہے کہ خود سیّد الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے دو موقعوں پر اپنی حرمِ محترم حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ دوڑ لگائی۔ ایک مرتبہ ایک غزوہ میں حضرت عائشہؓ رفیقِ سفر تھیں۔ ایک مقام پر آپؐ نے صحابہؓ کو آگے بڑھ جانے کا حکم دیا اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

"آؤ دوڑ لگائیں، دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔"

حضرت عائشہؓ دُبلی پتلی تھیں، آگے نکل گئیں۔ چند سال بعد پھر اسی قسم کا ایک اور موقع آیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں اب میرا جسم بھاری ہو گیا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسابقت میں مجھے ہرا دیا اور فرمایا، عائشہ! یہ اس دن کا جواب (بدلہ) ہے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے "اَلْاِصَابَہ" میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت سلمہؓ بن الاکوع گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑتے تھے اور اگر کسی اسپ سوار سے مقابلہ پیش آجاتا تو وہ اُس سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اُن پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ سلسہ ہجری میں غزوۂ ذی قرد (غابہ) سے واپسی کے سفر میں حضورؐ نے ان کو بڑے لطف و کرم سے اپنی اونٹنی عضباء پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔۔۔ دوسرے سب صحابۂ کرامؓ اپنی اپنی سواریوں پر آپؐ کے جلو میں تھے۔ یہ مقدس قافلہ ابھی مدینہ منورہ سے کئی میل دُور تھا کہ ایک انصاری صحابی، جن کو اپنی تیز رفتاری پر بڑا ناز تھا، بار بار آواز لگانے لگے:

"کیا کوئی مدینہ تک دوڑ میں مجھ سے بازی لے جا سکتا ہے؟"

حضرت سلمہؓ بن اکوع کے کانوں میں اُن کی آواز پڑی تو انہوں نے پکار کر اُن صاحب سے کہا:

"کیا تم کسی معزز شخص کی عزت نہیں کرتے؟ کیا تم کسی شریف آدمی سے نہیں ڈرتے؟"

انہوں نے کہا: "رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سوا کسی سے نہیں۔"

حضرت سلمہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، مجھے اجازت دیں کہ میں اس کے ساتھ دوڑ لگاؤں۔"

حضورؐ نے فرمایا: "جو تمہاری مرضی۔"

اب حضرت سلمہؓ نے انصاری صحابی سے مخاطب ہو کر کہا:

"تیار ہو جاؤ، میں تمہارے ساتھ دوڑ لگاؤں گا۔"

چنانچہ دونوں اپنی اپنی سواریوں سے اتر پڑے اور مدینے کی جانب دوڑنے لگے۔ حضرت سلمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اُسے تھوڑی

دیر مہلت دی اور اپنے آپ کو اُس سے پیچھے رکھا۔ پھر میں دوڑ کر اس سے مل گیا اور اُس کے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا :
" خدا کی قسم! اب میں تجھ سے آگے بڑھا۔" وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا :
" میرا بھی یہی خیال ہے۔" پس مدینے کے قریب میں اس سے آگے بڑھ گیا۔

حضرت عمرو بن امیۃ الضمری بھی بہت سُبک رفتار تھے۔ اہلِ سیر نے ان کی غیر معمولی تیز رفتاری کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ان کی تیز رفتاری پسند تھی اور آپؐ انہیں بعض اہم امور کی انجام دہی کے لیے روانہ فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی کرّم اللہ وجہہ، اور کئی دوسرے صحابہؓ بھی دوڑ لگانے میں بہت تیز تھے۔

نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے مشغلے بھی حضورؐ کو پسند تھے اور آپؐ ان فنون میں مہارت رکھنے والوں کی تحسین فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عید کے دن حبشیوں نے مسجد میں نیزہ بازی کے کرتب دکھانا چاہے، تو آپؐ نے اُن کو اجازت دے دی۔ (صحیح بخاری)

ہوا خوری یا کھلی ہوا میں سیر کرنے میں جو فائدے ہیں، وہ کسی وضاحت کے محتاج نہیں۔ ہوا خوری کے لیے صبح کا وقت نہایت موزوں ہے۔ سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کو صبح سویرے جاگنے کی بے حد تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کے ارشاد کے مطابق صبح سویرے اٹھنا کارِ ثواب بھی ہے اور روزی میں برکت کا باعث بھی۔ (مشکوٰۃ شریف)

سیر و سیاحت بھی تفریح کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ اس سے ایک طرف مختلف مقامات کو دیکھنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے دوسری طرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی حصولِ علم اور تجارت کے ذرائع تلاش کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم

میں "سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ" کی تلقین کی گئی ہے۔ حج جو دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک مرکز پر اجتماع ہے، اس میں بھی سیر و سیاحت کا پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلا شبہ حج پر جانے والوں کی نیت سیر و سیاحت کی نہیں ہوتی، لیکن جس طرح سفرِ حج خود بخود ہی سیاحت اور نئے نئے تجربوں کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح تجارت اور حصولِ علم کے لیے سفر کرنے سے بھی سیر و سیاحت ہو جاتی ہے۔ خود حضورؐ نے تجارتی قافلوں کے ساتھ طویل سفر کیے ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے تحصیل علم کے لیے سفر کرنے والوں کو بھی بے انتہا اجر و ثواب کی بشارت دی ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ صحابۂ کرامؓ سفر سے واپس آکر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تو حضورؐ ان سے سفر کے حالات پوچھا کرتے اور بڑی توجہ اور دلچسپی سے اُن کی باتیں سُنتے۔ بعض باتیں آپؐ کو اس قدر پسند آتیں کہ آپؐ بعد میں دوسرے صحابہؓ کو بھی بڑے لطف و انبساط سے یہ باتیں سنایا کرتے۔

خوشبو، تفریح اور نشاطِ طبع کے لیے نہایت کارآمد شے ہے۔ اطبّا کا قول ہے کہ خوشبو سے انسانی دماغ میں تازگی، توانائی اور تخیّل میں جدّت اور سُوجھ بُوجھ پیدا ہوتی ہے۔ خوشبو دل کو طاقت دیتی اور انسان میں حوصلہ اور اُمنگ پیدا کرتی ہے۔

صحیح بخاری اور شمائلِ ترمذی میں ہے کہ رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کو خوشبو کا استعمال بہت مرغوب تھا۔ حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ آپ خوشبو کا ہدیہ کبھی واپس نہ کرتے۔ ایک خاص قسم کا عطر یا خوشبو ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہتی۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچے سے آپؐ کا گزر ہوتا وہ معطّر ہو جاتا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو خوب پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں

کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے۔ (سیرۃ النبیؐ، علامہ شبلی، بحوالہ شمائل ترمذی)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص کو خوشبو دار پھول (ہدیے کے طور پر) دیا جائے وہ اُس کو واپس نہ کرے، اس لیے کہ وہ بہت ہلکا احسان ہے اور خوشبو اچھی چیز ہے۔

بہت سی دوسری روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ، عید، شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں صحابہؓ اور صحابیاتؓ میں خوشبو کے استعمال کا عام رواج تھا اور حضورؐ اسے پسند فرماتے تھے۔

رقص اور موسیقی ہمیشہ تفریح کا خاص ذریعہ سمجھے گئے ہیں لیکن اسلام کا ان دونوں فنون یا مشاغل کے بارے میں ایک خاص نظریہ ہے اور علماء نے اس پر طویل بحثیں کی ہیں۔ پہلے ہم رقص کو لیتے ہیں۔ بعض نے اس کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے اور بعض نے اسے اُس صورت میں حرام قرار دیا ہے کہ اس میں لچک اور مٹک پائی جائے اور یہ معیوب، خلافِ ادب اور بہیمی (جنسی) خواہشات کو برانگیختہ کرنے والا ہو۔ حافظ ابن حجرؒ، امام نوویؒ، امام رافعیؒ، امام سیوطیؒ، علامہ شعرانیؒ اور امام غزالیؒ اسی خیال کے مؤید ہیں۔

صحیح بخاری میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ عید کا دن تھا اور اہل سوڈان (حبشی) ڈھال اور چھوٹے نیزوں کے ساتھ رقص کر رہے تھے (اچھل کود رہے تھے یا کرتب دکھا رہے تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا تم اسے دیکھنا نہیں چاہتیں؟ میں نے کہا، ہاں چاہتی ہوں۔ آپؐ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا۔ میرا رخسار آپؐ کے رخسار کے ساتھ تھا اور آپؐ نے فرمایا شروع کرو! اے بنی ارفدہ! جب میں تھک گئی تو آپؐ نے فرمایا کیوں بس؟ میں نے

کہا جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، اچھا اب جاؤ۔ امام غزالیؒ اور بعض دوسرے علماء و صوفیہ نے اس روایت سے یہ نتیجہ مستنبط کیا ہے کہ رقص مطلق حرام نہیں ہے۔ مختلف روایات اور فقہاء کی آرا کو پیش نظر رکھ کر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ رقص بعض صورتوں میں شریعت کے منافی نہیں بلکہ مباح ہے، مثلاً جب یہ ورزشی کھیلوں، نیزہ بازی، شمشیرزنی، جوٹ وغیرہ کے سلسلے میں ہو۔ کوئی بات سن کر انسان بے اختیار ہو جائے اور وجد کرنے لگے یا وفورِ مسرت میں وقتی طور پر اچھل پڑے۔ اسی طرح کسی خاص علاقے کے لوگ اظہارِ مسرت کے لیے نظم و ضبط کے ساتھ اچھلیں کودیں جس میں لچک مٹک نہ ہو، جو خلافِ تہذیب نہ ہو اور جنسی جذبات نہ ابھارے، تو اسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ زن و مرد کا مل کر رقص کرنا یا صرف عورتوں کا رقص کرنا قطعاً حرام ہے۔ کیونکہ یہ صریحاً فحاشی اور بے حیائی ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وہ سادہ اور غیر فنی صورتیں رقص میں داخل نہیں جن کی حیثیت معصومانہ ورزش یا اچھل کود سے زیادہ نہیں نیز اس میں وہ رقص بھی داخل نہیں جو وجد و کیفیت کی اضطراری کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ البتہ عورتوں کے رقص کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام نے عورت کو ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے بہت اونچا مقام دیا ہے۔ وہ عفاف و عصمت کی قدروں کی خلاق اور اخلاص، متانت، وقار اور شرف انسانی کے تقاضوں کی امین اور محافظ ہے۔ اسلام اسے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ سرِعام ناچے اور جسم کے پیچ و خم کا اظہار کر کے تبرّجِ جاہلیۃ کی علمبردار بنے۔

اب ہم موسیقی کو لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے نزدیک یہ نفس کے سکون، دل کی خوشی اور کانوں میں رس گھولنے کا ذریعہ ہے۔ رقص کی طرح اس کے

بارے میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض نے غنا کو مطلق حرام قرار دیا ہے اور بعض چند شرائط اور قیود کے ساتھ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ مثلاً انہوں نے ایسا گانا جائز قرار دیا ہے جس میں فحاشی، عریانی، بدکلامی اور جذبات کو برانگیختہ کرنے یا گناہ پر ابھارنے والی کوئی بات نہ ہو۔ البتہ عورتوں کا غیر مردوں کے سامنے گانا یا مردوں کا خوش گلو عورتوں کے گانے سے محظوظ ہونا قطعاً ناجائز ہے۔ ہاں، ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں کہ نابالغ لڑکیوں نے دَف کے ساتھ یا دَف کے بغیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خوش الحانی سے اشعار پڑھے اور آپؐ نے انہیں منع نہیں فرمایا، بلکہ عید، شادی بیاہ اور مسرت کے دوسرے موقعوں پر آپؐ نے بطورِ خاص گانے کی اجازت دی۔

مشہور واقعہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے اور بنو نجار کے محلے میں پہنچے، تو انصار کی لڑکیاں دَف بجاتی ہوئی نکل آئیں اور یہ گیت گانے لگیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِی النَّجَّارِ   یَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِّنْ جَارِ

ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں   محمدؐ کیا ہی اچھے ہمسائے ہیں

حضورؐ نے لڑکیوں سے پوچھا: "کیا تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟"

انہوں نے عرض کیا: "ہاں، یا رسول اللہ۔"

حضورؐ نے تین مرتبہ فرمایا: "خدا کی قسم! میں بھی تم لوگوں (یعنی انصار) سے محبت رکھتا ہوں۔" (حاکمؒ وبیہقیؒ عن انسؓ بن مالک)

یہاں اس واقعے کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا جس میں مدینے کی خواتین چھتوں پر چڑھ کر یہ خیر مقدمی گیت گا رہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا   مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ

وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا   مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

اَیُّھَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

(ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہوگیا وداع کی پہاڑیوں سے۔ ہم پر شکر واجب ہے جب تک کوئی اللہ کو پکارنے والا باقی ہے۔ اے ہمارے درمیان مبعوث ہونے والے، آپ وہ منصب لے کر آئے ہیں جو واجب الاطاعت ہے۔)

حافظ بیہقیؒ اور ابوبکر المقریؒ نے لکھا ہے کہ خواتینِ مدینہ نے یہ گیت اُس وقت گایا جب حضورؐ ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ میں داخل ہوئے اِس کے برعکس امام بخاریؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے بیان کیا ہے کہ خواتین نے یہ اشعار اس وقت گائے جب ۹ھ ہجری میں حضورؐ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے۔ بہرحال واقعے کی صورت یکساں ہے۔ اس کے بارے میں بعض علماء نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ خواتین کا یہ اظہارِ مسرت غیر اختیاری تھا اور وہ حضورؐ کی زیارت اور خیر مقدم کے لیے بے تاب ہو کر چھتوں پر چڑھ گئی تھیں۔

صحیحین اور دوسری کتبِ حدیث میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہ واقعہ مروی ہے کہ (میرے والدِ بزرگوار) ابوبکرؓ تشریف لائے اُس وقت میرے گھر میں انصار کی دو لڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جو انصار نے جنگِ بُعاث کے موقع پر حسبِ دستور فخریہ طور پر کہے تھے۔ یہ لڑکیاں پیشہ ور مغنیہ نہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ناراض ہو کر فرمایا:

"یہ شیطان کی آوازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں؟"

یہ عید کا دن تھا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"ابوبکر، ہر قوم عید مناتی ہے اور آج ہماری عید کا دن ہے۔"

صحیح بخاری کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑے سے اپنا چہرۂ مبارک ڈھانپ رکھا تھا۔ ان لڑکیوں کو حضرت ابوبکر صدیق

نے ڈانٹا، تو حضورؐ نے اپنے رُخِ اقدس سے کپڑا ہٹا کر فرمایا :

دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ

(ابوبکر ان بچیوں کو چھوڑ دو (یعنی جو کچھ کر رہی ہیں کرنے دو) یہ عید کے دن ہیں)

صحیح بخاری اور مسندِ احمد میں اختصار کے ساتھ اور سُنن ابن ماجہ میں تفصیل کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی ایک پروردہ انصاری لڑکی کی شادی سادگی سے کر دی۔ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تشریف لائے، تو فرمایا "دُلہن کو تم نے روانہ کر دیا—؟ لوگوں نے عرض کیا: "جی ہاں"

فرمایا: "اس کے ساتھ کسی ایسی لڑکی کو بھیجتے جو یہ گاتی

اَتَيْنَاكُمْ اَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وَحَيَّاكُمْ

(ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے۔ اللہ ہمیں بھی زندہ رکھے اور تمہیں بھی)

تو اچھا ہوتا"

بخاری میں حضورؐ کا یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے "عائشہ، گیت اور راگ تو ہے نہیں۔"

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک عورت کی انصار کے ایک شخص سے شادی ہوئی، تو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: "اے عائشہ! ان لوگوں کے ساتھ تفریحِ طبع کا کوئی سامان نہیں حالانکہ انصار تفریحِ طبع کے دلدادہ ہیں۔"

مشہور صحابیہ حضرت رُبَیِّع بنتِ مُعَوِّذؓ انصاریہ کی شادی غزوۂ بدر کے کچھ عرصے بعد حضرت ایاسؓ بن بکیر لیثی سے ہوئی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نکاح کے دوسرے دن رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حضرت رُبَیِّعؓ کے گھر تشریف لے گئے اور بستر پر بیٹھ گئے۔ اس وقت کچھ لڑکیاں دَف بجا بجا کر شہدائے بدر کی تعریف میں اشعار پڑھ رہی تھیں (غالباً یہ اس لیے تھا

کہ حضرت رُبیعؓ کے والد اور چچا نے غزوۂ بدر میں شہادت پائی تھی اور شادی کے موقع پر اشعار اُن کے غم کو ہلکا کرنے کے لیے پڑھے جا رہے تھے) یہ اشعار پڑھتے ہوئے اُن لڑکیوں نے جب یہ مصرع پڑھا

وَفِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ

(اور ہم میں وہ نبی ہے جو کل کی خبر رکھتا ہے)

تو حضورؐ نے منع فرمایا کہ وہی پڑھو جو پہلے پڑھ رہی تھیں۔ (یعنی انہیں گانے سے منع نہیں فرمایا۔)

حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابہ" میں لکھا ہے کہ ایک انصاری صحابیہ حضرت ارنبؓ کو بہت سے گیت یاد تھے۔ حضورؐ نے انہیں انصار کی بعض شادیوں میں گیت گانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ترمذی شریف میں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کسی غزوہ کے لیے باہر تشریف لے گئے تھے۔ جب آپؐ بخیریت واپس تشریف لائے تو ایک سیاہ فام باندی (سوداؓ) آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ، میں نے مَنّت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپؐ کو صحیح سلامت واپس لے آیا، تو میں اس خوشی میں آپؐ کے سامنے دَف بجاؤں گی۔ آپؐ نے اُس سے فرمایا کہ اگر تُو نے یہ مَنّت مانی تھی، تو خیر اس کو پورا کر لے، ورنہ نہیں۔ اس پر وہ خوش ہو کر دَف بجانے لگی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ آئے، تو وہ فوراً دَف نیچے ڈال کر بیٹھ گئی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے "سیرۃ عائشہؓ" میں مُسندِ احمد کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایک لونڈی کو لیے ہوئے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ تم اس کو پہچانتی ہو؟ انہوں نے عرض کیا، نہیں یا رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا، یہ فلاں شخص کی لونڈی ہے، تم اس کا گانا سننا چاہتی ہو؟ انہوں نے اپنی مرضی ظاہر کی تو؟

تھوڑی دیر گاتی رہی۔ آپؐ نے گانا سن کر فرمایا، اس کے نتھنوں میں شیطان باجا بجاتا ہے، یعنی اس قسم کے گانے سے آپؐ نے کراہت کا اظہار فرمایا۔

صحیح بخاری (کتاب العیدین) میں ہے کہ عید کے دن بچے بچیوں کا معمول تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو کر باجے بجاتے تھے اور مسرت کے ترانے گاتے تھے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت عیاض اشعریؓ انبار میں تھے، عید کا دن آیا، تو تعجب سے پوچھا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بچے گاتے بجاتے تھے، اسی طرح تم لوگ کیوں نہیں گاتے بجاتے؟

اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایتیں کتب حدیث و سیر میں ملتی ہیں جن کی روشنی میں گانا گانے اور سننے کی حدود کا تعین کیا جا سکتا ہے، تاہم بہت سے علماء نے بوجوہ اسے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے اور آج کل جس قسم کی موسیقی کا رواج ہے، اس کے حرام ہونے میں تو واقعی کوئی کلام نہیں، البتہ خوش الحانی کے ساتھ پاکیزہ اشعار پڑھنے کے جواز پر تمام علماء نے جزم کیا ہے۔ عہد رسالت میں خود صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے سامنے خوش الحانی (لے) کے ساتھ اشعار پڑھے ہیں اور حضورؐ نے انہیں پسند فرمایا ہے، بلکہ ایک موقع پر اُن کی آواز میں آواز ملائی ہے۔

اسی طرح حُدی خوانی کے بے شمار واقعات کا ذکر عہد رسالت میں ملتا ہے۔ حُدی ایسی آواز سے شعر پڑھنے کو کہتے ہیں جس سے اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ سفر میں حضورؐ کی موجودگی میں حُدی خوانی کیا کرتے تھے۔ ارباب علم نے حُدی خوانی کو بھی ایک قسم کا ترنم قرار دیا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے "اِصابہ" میں لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ سفر میں حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح،

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور دوسرے متعدد صحابہؓ بھی آپؐ کے ہمراہ تھے۔ اُن میں حضرت خواتؓ بن جبیر بھی تھے جو بڑے خوش آواز شاعر تھے۔ لوگوں نے اُن سے کہا کہ ضرار بن خطاب کے اشعار گاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا نہیں، انہیں اپنے ہی اشعار سنانے دو۔ چنانچہ وہ صبح تک اپنے اشعار گاتے رہے۔ صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا اب بس کرو۔

ابنِ اثیرؒ نے "اُسدُ الغابہ" میں بیان کیا ہے کہ حضرت رباحؓ ایک صحابی تھے جو عرب کی ایک لَے کے بڑے ماہر تھے۔ وہ ایک سفر میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے ساتھ تھے۔ انہوں نے راستے میں الاپ شروع کیا، تو حضرت عبدالرّحمٰنؓ نے کہا، یہ کیا؟ رباحؓ بولے کوئی حرج نہیں، اس سے دل بہلاتے اور راستے کی کلفت دور کرتے ہیں۔

ہم نے رقص اور موسیقی کے سلسلے میں چند روایات بیان کر دی ہیں۔ مقصد کسی بحث میں الجھنا نہیں اور نہ ہمیں اپنی رائے کی صحت پر اصرار ہے۔ یہ علمائے دین کا منصب ہے کہ وہ اس قسم کے معاملات میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔ ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے اور انسانی طبائع کا پورا لحاظ کرتا ہے۔ وہ راحتِ قلب اور نشاطِ طبع کے حصول کے جائز طریقوں پر قدغن نہیں لگاتا۔

مجلس آرائی، شعروشاعری، لطیفہ گوئی، ہنسی مذاق وغیرہ بھی تفریح کے ذریعے ہیں۔ مجلس آرائی یہ ہے کہ چند گھڑیاں اپنے دوست احباب کے ساتھ مل کر گزاری جائیں، دین دنیا اور دُکھ سُکھ کی باتیں کی جائیں، بارِ خاطر کو ہلکا کرنے اور تکان دُور کرنے کے لیے ہنسی مذاق بھی کر لیا جائے۔

سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عام طور پر فجر کی نماز کے بعد مجلس منعقد فرمایا کرتے تھے۔ مجلسِ فجر کے علاوہ آپؐ دوسرے اوقات میں بھی وقفے وقفے سے مجالس منعقد فرماتے رہتے تھے۔ حضورؐ کی مجالس مطہرہ، تقدس،

متانت اور وقار کی حامل ہوتی تھیں۔ اُن میں ہدایت، ارشاد، اخلاق، اعمال، تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی باتیں ہوتی تھیں، لیکن ان ساری باتوں کے باوصف ان مجالسِ اقدس میں خشکی اور افسردگی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ حضورؐ اپنے ساتھیوں سے بے تکلفی اور خندہ روئی سے گفتگو فرماتے اور بعض اوقات آپؐ کا لطفِ طبع ساری مجلس کو شگفتہ کر دیتا۔ صحابۂ کرامؓ بھی ان مجالس میں پاکیزہ مزاح اور ظرافت کی باتیں کر لیتے جن سے سب حاضرینِ مجلس محظوظ ہوتے۔ ایک دن حضورؐ نے ایک مجلس میں یہ تمثیل بیان کی کہ جنّت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی۔ خدا نے اس سے پوچھا کیا (دنیا میں) تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی؟ اس نے کہا، ہاں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بیج ڈالے جو فوراً اُگے بڑھے اور فصل تیار ہو گئی۔ ایک اعرابی بھی مجلس میں موجود تھا۔ اس نے کہا یا رسولؐ اللہ، یہ سعادت تو کسی قرشی یا انصاری ہی کو نصیب ہو گی، ہم لوگ تو کاشت کار نہیں۔ حضورؐ ہنس پڑے۔ (صحیح بخاری)

ایک مرتبہ حضرت اُسیدؓ بن حُضَیر اشہلی انصاری مجلسِ نبویؐ میں ظریفانہ باتوں سے اپنے ساتھیوں کو ہنسا رہے تھے۔ جب اُن کے مزاح کی لے کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی، تو حضورؐ نے اُن کے پہلو میں ایک چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ انہوں نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! آپؐ کی چھڑی نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی۔"

حضورؐ نے فرمایا: "تم مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔"

بولے: "یا رسولؐ اللہ! آپؐ کی چھڑی تو میرے ننگے بدن کو لگی، لیکن آپؐ کے جسمِ مبارک پر قمیص ہے، بدلہ کیسے برابر ہو گا؟"

حضورؐ نے فوراً اپنا پیراہنِ مبارک اٹھا دیا اور فرمایا: "آؤ بھائی

اب بدلہ لے لو۔"

حضرت اُسیدؓ حضورؐ سے والہانہ لپٹ گئے اور آپؐ کے پہلوئے اقدس کو بار بار چومنے لگے، پھر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ، میری دلی تمنا تھی کہ آپؐ کے پہلوئے اقدس کو چومنے کی سعادت حاصل کروں، آج یہ تمنا پوری ہو گئی۔"

کُتُبِ سِیَر میں اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی مجالس جہاں ہدایت و اصلاح کا ذریعہ تھیں وہاں تکان اور افسردگی کو دور کرنے کا موجب بھی ہوتی تھیں۔

شعر و شاعری ایک ایسا مشغلہ ہے جو بعض طبائع پر جادو کا اثر کرتا ہے اور انہیں فرحت اور نشاط مہیا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر و شاعری کی تعریف بھی فرمائی اور اس کی مذمت بھی کی ہے۔ آپؐ نے اُس شعر و شاعری کو بُرا قرار دیا ہے جو مشرکانہ ہو اور لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرے، ان میں عاداتِ رذیلہ پیدا کرے اور اُن کے سفلی جذبات ابھار کر بدکاری کی ترغیب دے، جو فحش، عریاں اور یکسر جھوٹ ہو، اور جو اللہ کے ذکر سے دلوں کو غافل کر دے۔ اس کے برعکس آپؐ نے اس شعر و شاعری کو اچھا قرار دیا ہے جو لوگوں کے اندر نیکی کا جذبہ پیدا کرے، انہیں دین کی طرف مائل کرے اور انہیں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت و محبّت کی ترغیب دے، اس کے علاوہ اُن میں شرافت جواںمردی اور حسنِ عمل کی روح پیدا کرے۔

بیشتر صحابہؓ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ اُن میں سے بعض کو بارگاہِ نبوّت میں شعر و شاعری کی بناء پر خصوصیت حاصل تھی، مثلاً حضرت حسانؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت کعبؓ بن مالک۔ ان میں سے ہر ایک کا لقب "شاعرِ رسولؐ اللہ" تھا۔ حضورؐ ان تینوں کے

اشعار نہایت شوق سے سنتے اور داد دیتے تھے۔ وہ بھی حضورؐ کے نہایت مخلص جاں نثار تھے اور آپؐ کی طرف سے کفّار کے ہجویہ اشعار کا جواب دیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت حمزہؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ، حضرت جعفرؓ بن ابی طالب، حضرت خواتؓ بن جبیر اور دوسرے بیسیوں صحابہؓ شعر و شاعری میں درک رکھتے تھے، بلکہ ان میں سے بعض کا شمار فحول شعراء میں ہوتا ہے مثلاً حضرت لبیدؓ بن ربیعہ اور کعبؓ بن زہیر۔ زمانۂ حال کے ایک عرب مصنف جرجی زیدان نے "جمہرۃ العرب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی شعر نہ کہا ہو یا پڑھا نہ ہو بعض اہلِ سیر نے خود خاندانِ رسالتؐ کے بارے میں لکھا ہے کہ بنو عبدالمطلب کے مردوں اور عورتوں میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس نے شعر نہ کہا ہو۔ (اسوۂ صحابہ جلد دوم)

رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اگرچہ خود شاعری نہیں کی (کہ یہ کام شانِ رسالت کے خلاف تھا) لیکن سخن فہمی اور اچھے اشعار کی قدردانی میں آپؐ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ (بعض) شعر حکمت (پر مبنی) ہوتے ہیں (بخاری)

ایک مرتبہ آپؐ نے لبیدؓ بن ربیعہ کے زمانۂ جاہلیت کے کلام کا یہ مصرع سُنا:

اَلَا کُلُّ شَیْئٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٗ

(خبردار رہو، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ (یعنی فنا ہو جانے والی ہے)

تو فرمایا: "لبید کی یہ بات سب سے زیادہ سچی ہے"۔

حضرت کعبؓ بن زہیر نے اپنا (شہرۂ آفاق) قصیدہ "بانت سعاد" آپؐ کی خدمت میں پیش کیا، تو آپؐ نے اس کی داد یوں دی کہ اپنی ردائے مبارک

اتار کر کعبؓ کے کندھوں پر ڈال دی۔

ایک مرتبہ حضورؐ حضرت کعبؓ بن مالک انصاری کے گھر تشریف لے گئے اور اُن سے فرمائش کر کے دیر تک اشعار سنتے رہے اور آخر میں فرمایا: "کفار پر ان کی زد تیر سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

عرب کی نامور مرثیہ گو حضرت خنساؓ قبولِ اسلام کے لیے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں تو حضورؐ بڑی دیر تک اُن کا فصیح و بلیغ کلام سنتے رہے۔ وہ سناتی جاتی تھیں اور حضورؐ فرماتے جاتے تھے: "شاباش، اے خنساء"

حضورؐ کے فیضِ صحبت کے نتیجے میں صحابہ کرامؓ کے ذوقِ سخن کو بھی جِلا ملتی تھی اور وہ شعر و سخن کے بڑے ادا شناس بن گئے تھے۔

بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور ہنسی مذاق وغیرہ زندہ دلی کا دوسرا نام ہے۔ سرورِ کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شگفتہ مزاجی اور لطفِ طبع سے افسردگی دُور ہو جاتی تھی اور مجلس باغ و بہار بن جاتی تھی۔ آپؐ، صحابہ کرامؓ کو بھی مزاح کی اجازت دے دیتے تھے اور خود بھی اُن سے پاکیزہ مزاح فرما لیتے تھے۔ یہاں تک کہ صحابۂ کرامؓ دربارِ نبوت میں بھی ظریفانہ باتیں کر لیتے تھے۔ تاہم حضورؐ اس قسم کے ہنسی مذاق سے منع فرماتے تھے جس میں پھکڑپن ہو جو تہذیب اور اخلاق کے منافی ہو یا جس سے کسی دوسرے مسلمان کی دل آزاری ہوتی ہو۔

کُتُبِ سیر میں سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور صحابہ کرامؓ کی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

بعض اوقات صحابہ کرامؓ ہنسی مذاق میں اعتدال سے تجاوز کر جاتے، تو حضورؐ انہیں فوراً ٹوک دیتے، بالخصوص ایسے مذاق سے بشدت منع فرماتے جس سے دوسرے کو پریشانی اٹھانی پڑے، مثلاً کسی کی کوئی چیز چھپا دینا، جھوٹی خبر دینا، کھانے پینے کی اشیاء میں کوئی نشہ آور چیز ملا دینا۔

"ادب المفرد" میں ہے کہ صحابۂ رسولؐ مردہ دل اور خشک مزاج نہ

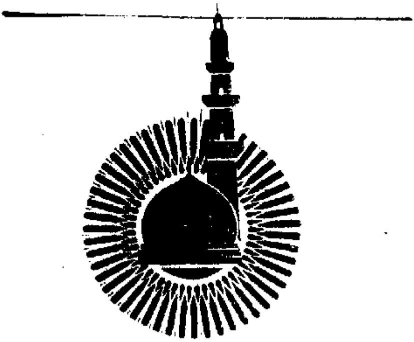
تھے۔ وہ اپنی مجلسوں میں اشعار پڑھتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کے واقعات کا تذکرہ کرتے تھے، لیکن جب کوئی دینی کام آپڑتا، تو اُن کی آنکھیں اس طرح الٹ جاتیں کہ گویا وہ مجنون ہیں۔ (امام بخاریؒ)

گویا مجلس آرائی اور ہنسی مذاق اُسی حد تک جائز ہے جس سے دین کے کاموں میں خلل نہ پڑے۔

قصّے کہانیاں سُننا اور سُنانا بھی تفریح کی ایک قسم ہے، لیکن اس کو پیشہ بنانا غلط ہے۔ قصّے کہانیوں میں سچے واقعات بھی ہو سکتے ہیں اور فرضی بھی۔ بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور صحابۂ کرام کبھی کبھار دل بہلانے کے لیے قصّے اور تمثیلیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شمائلِ ترمذی اور مُسندِ احمد میں حدیثِ خرافہ اور صحیح بخاری، سُننِ نسائی اور احیاء العلوم (امام غزالیؒ) میں ابو زرع وام زرع کے قصّے کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

تمام قوموں میں میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں کا رواج رہا ہے۔ یہ تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتے ہیں اور بعض دوسرے مقاصد کا ذریعۂ حصول بھی ہوتے ہیں۔ عرب میں بھی عُکاظ، مجنّہ، ذوالمجاز اور بہت سے دوسرے مقامات پر میلے لگتے تھے۔ ان میلوں میں تجارت بھی ہوتی تھی اور شعر و شاعری، فخاری اور مردانہ کھیلوں کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ اسی طرح وقفوں وقفوں سے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں تجارتی منڈیاں بھی لگتی تھیں۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بعثت کے بعد تبلیغِ حق کے لیے متعدد میلوں اور دوسرے اجتماعات میں تشریف لے گئے۔ ہجرت کے بعد آپؐ کبھی کبھی منڈی یا بازار میں تشریف لے جاتے تھے۔ اس سے آپؐ کا مقصد خرید و فروخت یا تاجروں کو لین دین کے صحیح طریقوں سے آگاہ کرنا ہوتا تھا۔ فقہاء نے ان روایات

کی روشنی میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ایسے میلے جو لہو ولعب کا اکھاڑہ نہ ہوں اور جن میں شرک، فحاشی، بے حیائی کی حرکتیں اور دوسرے خلافِ شریعت کام نہ ہوتے ہوں، اُن میں تجارت، تبلیغِ دین یا اصلاح وہدایت کے لیے شریک ہونا جائز ہے۔ باقی رہے کھیل تماشے، تو یہ اگر مردانہ کھیلوں کے مقابلوں یا مختلف کرتبوں، جائز قسم کی شعر وشاعری اور جانوروں وغیرہ کی نمائش تک محدود ہوں تو ان کے دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خود سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حبشیوں کی اچھل کود اور نیزہ بازی کے کرتب دیکھے ہیں۔



رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شگفتہ مزاجی

رحمتِ عالم فخرِ موجودات صاحبِ قابَ قوسین صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ اقدس بشریت اور عبدیت کی معراج اور انسانیت وعبدیت کا منتہائے کمال ہے لاریب حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی تمام کمالات وصفات کی جامع ہے ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے

غالبؔ ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

حضور پُرنور کی حیاتِ طیبہ کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیں وہ مطلع انوار معلوم ہوگا۔ ایسا ہی ایک پہلو آپؐ کی شگفتہ مزاجی کا ہے۔ سرکارؐ متانت اور وقار کے پیکرِ عظیم تھے۔ بلاضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے تھے۔ دربارِ نبوت میں حاضرین اس طرح خاموش سر جھکا کر بیٹھتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ کَاَنَّمَا عَلٰی رُؤُسِهِمُ الطَّيْرُ۔

ہر شخص کو ادب واحترام ملحوظِ خاطر رہتا اور ہر وقت ہدایت وارشاد اخلاق ودین، تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی باتیں ہوتی تھیں تاہم حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی متانت اور وقار میں خشکی اور افسردگی نہ تھی، آپؐ نہایت خندہ روئی سے گفتگو فرماتے تھے اور بعض اوقات اپنی شگفتہ مزاجی سے مجلس کو باغ وبہار بنا دیتے تھے اور روتوں کو ہنسا دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ سرکارؐ کے خدام اور جاں نثار بھی آپؐ کے سامنے لطفِ طبع کا مظاہرہ کرتے تھے۔ آپؐ اس پر متبسم یا خنداں ہو جاتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی کے متعدد واقعات کتبِ سیر میں مذکور ہیں، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

○ ایک دفعہ ایک ضعیف العمر صحابیہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی:—

"یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا میں بھی جنّت میں جا سکوں گی" (یا یہ کہ دعا فرمایئے کہ میں بھی جنّت میں جاؤں)

حضورؐ نے فرمایا:—

"کوئی بڑھیا جنّت میں نہیں جا سکے گی۔"

وہ رونے لگیں —— اب ارشاد ہوا:—

"بڑی بی! بوڑھیاں جنّت میں بوڑھیوں کی طرح نہیں جائیں گی بلکہ جوان ہو کر جائیں گی۔" (یعنی ان کا شباب عود کر آئے گا)

اس پر وہ بے اختیار ہنسنے لگیں۔

○ ایک دفعہ ایک دیہقانی آدمی (اعرابی) مدینہ منوّرہ آیا۔ اس نے اپنا اونٹ بٹھایا۔ اس کا زانو باندھا اور مسجدِ نبوی میں داخل ہو گیا —— حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پیچھے نماز ادا کی۔ جب سلام پھیر کر فارغ ہو گیا تو اپنے اونٹ کے پاس آیا۔ اس کا زانو کھولا اور اس پر سوار ہو گیا پھر بلند آواز سے کہا:—

"اے اللہ مجھ پر رحم فرما اور محمد (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) پر اور ہم کے سوا اور کسی کو اس میں شریک نہ کرنا۔"

سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے متبسّم ہو کر صحابۂ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:—

"تم اس میں اور اس کے اونٹ میں زیادہ ناسمجھ کس کو کہو گے۔ تم نے بھلا سنا اس نے کیا کہا ہے؟"

صحابۂ کرامؓ نے بھی ہنستے ہوئے عرض کیا:—"جی ہاں سنا"

ایک مرتبہ ایک نابینا صحابی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! کیا میری بخشش ہو جائے گی؟"

فرمایا: ——— "بھائی اندھے جنت میں نہیں جائیں گے۔"

نابینا صحابی رونے لگے۔ حضورؐ ہنس پڑے اور فرمایا:

"بھائی کوئی اندھا اندھے کی حیثیت سے جنت میں نہیں جائے گا۔ سب کی آنکھیں روشن ہوں گی۔"

حضورؐ کا ارشاد سن کر نابینا صحابی بے اختیار ہنس دیئے۔

○ حضرت عوفؓ بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غزوۂ تبوک میں حاضر ہوا۔ آپؐ چمڑے کے ایک چھوٹے سے خیمے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "اندر آجاؤ!"

میں نے عرض کیا: "کیا میں سارا ہی اندر آجاؤں یا رسول اللہ؟"

حضورؐ نے متبسم ہو کر فرمایا: "ہاں تم سارے ہی اندر آجاؤ۔"

(حضرت عوفؓ نے جو یوں کہا کہ کیا میں کل کا کل اندر آجاؤں ——— تو یہ خیمے کے بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے کہا تھا)

○ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابو طلحہ انصاریؓ اور ان کے گھر والوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ آپؐ کبھی کبھی حضرت ابو طلحہؓ کے گھر تشریف لے جاتے اور دوپہر کو وہیں آرام فرماتے۔ ابو طلحہؓ کے ایک کمسن فرزند ابو عمیرؓ تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا خوش آواز پرندہ پال رکھا تھا۔ اتفاق سے وہ مر گیا۔ ننھے ابو عمیرؓ کو بڑا صدمہ ہوا۔ اسی اثناء میں حضورؐ تشریف لائے۔ ابو عمیرؓ کا چہرہ اترا ہوا دیکھا تو ان کی والدہ اُمِّ سُلَیمؓ سے پوچھا:

"کیا بات ہے، آج ابو عمیر کچھ سست ہے؟"

انہوں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ ابو عمیرؓ کی چڑیا (نُغَیر) جس

کے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا۔ آج مر گئی ہے۔ اسی لیے وہ غمگین ہے۔"
حضورؐ نے ابو عمیر کو پاس بلایا اور اپنا دستِ مبارک ان کے سر پر رکھ کر فرمایا:
"یَا اَبَا عُمَیْرُ مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ"
(اے ابو عمیر تیری چڑیا نے کیا کیا)
ابو عمیرؓ حضورؐ کا ارشاد سُن کر ہنس پڑے اور پھر کھیل کود میں مشغول ہو گئے۔

○ رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ہجرت کے بعد چند دن قُبا میں قیام فرمایا۔ قُبا کے اثنائے قیام میں ایک دن آپؐ اپنے چند جاں نثاروں کے درمیان رونق افروز تھے اور کھجوریں تناول فرما رہے تھے کہ حضرت صہیبؓ رومی اچانک مجلسِ نبوی میں وارد ہوئے۔ اس وقت وہ مکّہ سے ہجرت کر کے قُبا پہنچے تھے۔ ان کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی آنکھ دُکھ رہی ہے۔ انہوں نے سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور حاضرینِ مجلس کو سلام کیا اور پھر کچھ کہے سُنے بغیر کھجوروں کے شغل میں شریک ہو گئے۔ ان کے کھانے کا انداز ان کی شدّتِ گرسنگی کی غمّازی کر رہا تھا۔ حضرت عُمر فاروق رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا "یا رسولؐ اللہ ملاحظہ فرمائیے۔ صہیب کی آنکھ دُکھ رہی ہے اور وہ کس شوق سے کھجوریں اڑا رہا ہے۔"
چونکہ آشوبِ چشم میں کھجور کھانا مضر ہوتا ہے اس لیے حضورؐ نے بھی حضرت صہیبؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:
"سبحان اللہ تمہاری آنکھ دُکھ رہی ہے اور کھجوریں کھا رہے ہو۔"
حضرت صہیبؓ نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ میں اس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو ٹھیک ہے۔"

ان کا جواب سن کر سرورِ عالم صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم اس قدر ہنسے کہ دندانِ مبارک کا نور ظاہر ہونے لگا۔

○ ایک دفعہ ایک خاتون سرورِ عالم صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ میرا شوہر علیل ہے۔ اس کی شفایابی کے لیے دعا فرمایئے۔"

حضورؐ نے فرمایا، "تمہارا خاوند وہی ہے جس کی آنکھ میں سفیدی ہے۔" وہ حیران ہوگئیں اور گھر جاکر اپنے خاوند کی آنکھ کھول کر دیکھنے لگیں۔ خاوند نے کہا، "کیا بات ہے۔" کہنے لگیں۔

"حضورؐ نے فرمایا ہے کہ تمہارے خاوند کی آنکھ میں سفیدی ہے۔"

وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے:

"کیا کوئی ایسا آدمی ہے جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہو۔"

اب وہ حضورؐ کے لطیف مزاح کو سمجھیں جس کا مقصد ان کے بیمار شوہر کی پژمردگی دُور کرنا تھا۔

○ حضرت انسؓ حضور صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کے خادم تھے اور ہر وقت آپؐ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں ازراہِ خوش طبعی یوں پکارا "یا ذوالاذنین" (اے دو کانوں والے)

○ ایک دن سرورِ عالم صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم صحابۂ کرامؓ کے حلقے میں رونق افروز تھے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ میرے بُت نے مجھے بہت نفع دیا۔"

سب حیران ہوکر ان کے منہ کی طرف تکنے لگے کہ بھلا بُت بھی کسی کو نفع دے سکتے ہیں۔ ان صاحب نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ میں سفر پر روانہ ہوا میں نے ستوؤں کا بُت بنایا، راستے میں کھانا ختم ہوگیا تو میں نے بُت کو توڑ کر کھایا۔ مجھے تو بُت

نے بہت نفع دیا ......"

سب ہنسنے لگے اور حضورؐ بھی متبسم ہو گئے ۔

○ ایک مجلس میں رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ایک شخص نے اللہ سے جنت میں کھیتی کرنے کی آرزو کا اظہار کیا ۔ پوچھا گیا، کیا تیری آرزو پوری ہو گئی ۔ بولا " ہاں لیکن چاہتا ہوں کہ میری کھیتی بوتے ہی تیار ہو جائے "۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی ۔ اس نے بیج ڈالے اور فوراً کھیتی تیار ہو کر کٹنے کے قابل ہو گئی ۔

ایک بدوی صحابی بھی اس مجلس میں موجود تھے، انہوں نے عرض کیا :

" یا رسولؐ اللہ یہ سعادت تو کسی قریشی یا انصاری ہی کو حاصل ہو گی جو کھیتی باڑی کرتے ہیں ۔ ہم کو تو اس کام سے کوئی لگاؤ نہیں ہے "

حضور (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) ان کی بات سُن کر ہنس پڑے ۔

○ ایک دفعہ ایک صحابی سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا :

" یا رسولؐ اللہ میں تو تباہ ہو گیا ۔"

حضورؐ نے پوچھا " کیا ہوا ؟ "

بولے " میں نے روزے کی حالت میں بیوی سے مقاربت کر لی ۔"

ارشاد ہوا :

" ایک غلام آزاد کر دو ۔"

انہوں نے عرض کیا : " یا رسولؐ اللہ! میں ایک غریب آدمی ہوں غلام میرے پاس نہیں ہے "۔

حضورؐ نے فرمایا :

" دو مہینے مسلسل روزے رکھو ۔"

بولے "مجھ میں اتنی طاقت نہیں۔" ارشاد ہوا:
"اچھا تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔"
انہوں نے عرض کیا: "اس کی بھی مقدرت نہیں ہے۔"
اسی اثناء میں کسی نے کھجوروں کی ایک تھیلی (یا ٹوکری) حضورؐ کو ہدیۃً پیش کی۔ آپؐ نے فرمایا "یہ لے جاؤ اور غریبوں میں تقسیم کر دو۔"
بولے "خدا کی قسم جس نے آپؐ کو پیغمبر بنا کر ہماری ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا، مجھ سے بڑھ کر مدینہ میں کوئی غریب نہ ہوگا۔"
حضورؐ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا:
"اچھا تم انہیں خود ہی کھا لو۔"

○ حضرت زاہرؓ بن حرام اشجعی ایک کم رُو بدوی صحابی تھے۔ وہ مدینہ کے قریب بادیہ میں رہتے تھے۔ جب کبھی مدینہ آتے تو حضورؐ کے لیے کوئی نہ کوئی دیہات کی سوغات ضرور لاتے۔ حضورؐ کو ان سے بڑی محبّت تھی۔ ایک دن وہ اپنی چیزیں فروخت کرنے شہر کے بازار میں آئے۔ حضورؐ اتفاقاً ادھر سے گزرے۔ زاہرؓ کو دیکھا تو ان کے پیچھے جا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کی آنکھوں کو بند کر لیا اور فرمایا، "کون ہے جو اس غلام کو خریدتا ہے۔"
انہوں نے آواز پہچان کر عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ اس تجارت میں آپؐ مجھ کو کھوٹا مال پائیں گے۔"
حضورؐ نے ہنس کر فرمایا، "نہیں خدا کے نزدیک تمہاری قیمت بہت زیادہ ہے۔"

○ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:
"یا رسولؐ اللہ! میرے بھائی کے پیٹ میں گرانی ہے۔" حضورؐ نے فرمایا، "اسے شہد پلاؤ۔"

وہ دوبارہ آئے اور کہا، "کوئی افاقہ نہیں ہوا"۔ حضورؐ نے فرمایا، "شہد پلاؤ"۔ سہ بارہ آئے اور کہا، "ابھی شکایت باقی ہے"۔ حضورؐ نے پھر شہد پلانے کا حکم دیا۔ چوتھی مرتبہ آئے اور اپنی شکایت دہرائی۔ حضورؐ نے فرمایا، "اللہ تعالیٰ سچا ہے (ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ اسے شہد ہی پلاؤ"۔ اس مرتبہ پلایا تو انہیں شفاء ہو گئی اور سارا فاسد مادہ خارج ہو گیا۔

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں ایک پھولدار سیاہ چادر آئی۔ آپؐ نے فرمایا، "یہ چادر کس کو دوں؟"

لوگ چپ رہے۔ حضورؐ نے فرمایا، "اُمِّ خالدؓ کو بلاؤ"۔

حضرت اُمِّ خالدؓ بنت خالدؓ بن سعید حبشہ میں اس وقت پیدا ہوئی تھیں۔ جب ان کے والدین مکہ سے ہجرت کر کے وہاں مقیم تھے۔ وہ حاضر ہوئیں تو حضورؐ نے نہایت شفقت سے وہ چادر ان کو پہنائی اور دو دفعہ فرمایا، "پہنو اور پرانی کرو"۔ پھر حضورؐ چادر کے بوٹوں پر ہاتھ رکھ کر اُمِّ خالدؓ کو دکھاتے اور فرماتے:

"اُمِّ خالد دیکھو یہ سنہ ہے یہ سنہ ہے"!

وہ زبانِ رسالت سے سنہ سنہ کے الفاظ سن کر باغ باغ ہو جاتی تھیں کیونکہ سنہ کے معنی حبش کی زبان میں خوشنما کو کہتے ہیں۔

○ ایک دفعہ حضرت اُمِّ ایمنؓ بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوئیں۔ انہوں نے حضورؐ کو گود میں کھلایا تھا اور آپؐ ان کی بہت تعظیم و تکریم فرماتے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضورؐ "اُمّی اُمّی" فرماتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ انہیں بٹھایا۔ پھر ان سے پوچھا، امّی! آج کیسے آنا ہوا؟"

حضرت اُمِّ ایمنؓ: یا رسولؐ اللہ! ہمیں ایک اونٹ کی ضرورت ہے۔

آج کل ہمارے پاس سواری کا کوئی جانور نہیں ہے۔ سفر پر جانا پڑ جائے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔

سرورِ عالمؐ: "اچھا تو اونٹ کا ایک بچہ حاضر کیے دیتا ہوں۔"

اُمِّ ایمنؓ: "میرے ماں باپ آپ پر قربان، اونٹ کے بچے کو میں کیا کروں گی وہ تو ہمارا بوجھ نہیں سہار سکے گا۔"

سرورِ عالمؐ: "آپ کو اونٹ کا بچہ ہی ملے گا اور میں اسی پر آپ کو سوار کراؤں گا۔" حضرت اُمِّ ایمنؓ کچھ افسردہ خاطر سی ہو گئیں۔ اسی اثناء میں حضورؐ نے ایک خادم کو اشارہ فرمایا وہ تھوڑی دیر میں ایک جوان فربہ اونٹ لے آئے اور اس کی مہار حضرت اُمِّ ایمنؓ کو تھما دی۔ حضورؐ نے فرمایا:

"امّی ذرا دیکھئے یہ اونٹ ہی کا بچہ ہے یا کچھ اور۔"

اب حضرت اُمِّ ایمنؓ حضورؐ کے لطیف مزاح کی تہہ تک پہنچیں، بے اختیار ہنس پڑیں اور دعائیں دینے لگیں۔ حاضرینِ مجلس بھی شگفتہ ہو گئے۔

○ ایک مرتبہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس طائف سے انگور آئے۔ اس وقت آپؐ کے ایک جاں نثار حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری کے کم سن صاحبزادے نعمان قریب ہی کھیل رہے تھے۔ آپؐ نے ان کو دو خوشے عنایت فرمائے اور فرمایا کہ ایک تمہارا ہے اور ایک تمہاری والدہ کا (جو جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی ہمشیرہ تھیں اور خود بھی صحابیہ تھیں) نعمانؓ دونوں خوشے راستہ میں خود ہی چٹ کر گئے اور والدہ کو خبر تک نہ کی۔ چند دن بعد وہ حضورؐ کی خدمت میں پھر آئے تو آپؐ نے پوچھا، "اپنی ماں کو انگور دے دیئے تھے؟"

انہوں نے کہا۔ "نہیں"

حضورؐ متبسم ہو گئے اور ان کا کان پکڑ کر فرمایا ——— "یا غدر!" (کیوں مکار)۔

○ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ننگی پیٹھ والے گدھے پر سوار ہو کر قباء کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت ابوہریرہ رضی مل گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: "آؤ ابوہریرہ میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

حضرت ابوہریرہ رضی نے جست کر کے گدھے پر بیٹھنا چاہا لیکن بھاری بدن کے آدمی تھے سوار نہ ہو سکے اور حضورؐ کو پکڑ لیا۔ حضورؐ بھی گدھے سے نیچے آ رہے اور حضرت ابوہریرہ رضی بھی گر پڑے۔ حضورؐ پھر سوار ہوئے اور فرمایا، "آ جاؤ" اب کی بار پھر حضورؐ کو ساتھ لے کر گر پڑے۔ تیسری مرتبہ آپؐ پھر سوار ہوئے اور فرمایا، "آؤ سوار ہو جاؤ"۔

حضرت ابوہریرہ رضی نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! اب معاف فرمایئے، ایسا نہ ہو، تیسری مرتبہ پھر گرا دوں۔"

حضورؐ ان کا جواب سن کر متبسم ہو گئے اور آگے تشریف لے گئے۔

○ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ دس برس کی عمر میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اس وقت ان کی کوئی کنیت نہ تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ "حمزہ" نام کی ایک سبزی کو بہت پسند کرتے ہیں تو آپؐ نے ان کی کنیت ابوحمزہ رکھ دی (یعنی حمزہ کا باپ یا حمزہ والا)

○ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پندرہ برس تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے۔ آپؐ کو ان سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ لوگوں میں وہ "حِبُّ النبیؐ" (محبوبِ نبیؐ) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد محبت تھی اور آپؐ ان کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ جب وہ بچے تھے تو حضورؐ ان کو اپنی ایک ران پر بٹھاتے اور اپنے نواسے سیدنا حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کو دوسری پر۔ پھر بارگاہ ربّ العزّت میں دعا کرتے، "الٰہی میں ان پر رحم کرتا ہوں تو بھی ان پر رحم فرما۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ان سے ازراہِ شفقت مزاح بھی فرماتے تھے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی "محبوب رسولؐ" مشہور ہو گئے تھے اور کاشانۂ نبویؐ میں ان کا آزادانہ آنا جانا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کاشانہ نبویؐ میں بیٹھے تھے اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی موجود تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہؓ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور حضرت عائشہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"عائشہ! اگر اسامہ لڑکی ہوتا تو میں اس کو خوب زیور پہناتا، بناتا سنوارتا تاکہ اس کے حسن و جمال کی شہرت ہوتی اور لوگ جگہ جگہ سے اس کے رشتے کے پیغام بھیجتے۔"

آپؐ کا یہ ارشاد ازراہِ تفنّن تھا۔

حضرت ابو عمرو نعیمان بن عمرو انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خوش مزاج صحابی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی نیا پھل مدینہ منورہ میں آتا وہ اسے دکاندار سے اُدھار خرید لاتے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے کہتے، یہ ہدیہ ہے۔ پھر جب دکاندار قیمت کا مطالبہ کرتا تو وہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے اور کہتے، یا رسولؐ اللہ اسے فلاں پھل کی قیمت ادا کر دیجیے۔

آپؐ ہنس کر فرماتے، وہ تو ہدیہ تھا۔

نعیمانؓ عرض کرتے:

"یا رسولؐ اللہ! میرے دل نے چاہا کہ آپؐ کے سوا نیا پھل پہلے کوئی اور نہ کھائے اس لیے لے آیا مگر قیمت میرے پاس

موجود نہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑتے اور قیمت ادا فرما دیتے۔

○ ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ اور کچھ دوسرے صحابہؓ کے ساتھ کہیں تشریف فرما تھے اور کھجوریں تناول فرما رہے تھے۔ آنحضورؐ اور دوسرے صحابہؓ کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیاں حضرت علیؓ کے آگے رکھتے جاتے تھے۔ جب کھجوریں ختم ہو گئیں تو حضورؐ نے مزاحاً فرمایا، گٹھلیاں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علی سب سے زیادہ کھجوریں کھا گئے۔

حضرت علیؓ نے ہنستے ہوئے جواب دیا، یا رسولؐ اللہ دوسرے کسی کے سامنے گٹھلیاں نہیں ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے سوا باقی سب گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا گئے۔

یہ جواب سن کر حضورؐ متبسّم ہو گئے۔

○ ایک دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک سادہ مزاج صحابی سے دریافت فرمایا : " بتاؤ تمہارے ماموں کی بہن سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

ان صاحب نے اپنا سر جھکا لیا اور سوچنے لگے۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا:

" ہوش کرو! تجھے اپنی ماں یاد نہیں رہی ؟"

○ ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے آنحضورؐ کی خدمت میں عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! سُنا ہے کہ جب دجّال ظاہر ہوگا تو دنیا میں قحط پڑ جائے گا۔ اس عام قحط میں دجّال لوگوں کی ضیافت کرے گا جس میں قسم قسم کے کھانے ہوں گے میرا خیال ہے کہ اگر میں اس زمانے میں ہوا تو پہلے اس کے کھانوں سے خوب پیٹ بھر دوں گا اور پھر اس سے منحرف ہو جاؤں گا۔" ان کی بات سُن کر حضورؐ متبسّم ہو گئے اور فرمایا: " اگر تم اُس زمانے میں ہوئے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کے پاس نظر آنے والی نعمتوں سے بے نیاز کر دے گا۔"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی

کسی شخص کی گھریلو زندگی سے مراد اس کی اِزدواجی یا اہلی (مُتَأَہِّل) زندگی ہوتی ہے اور اسی کا مطالعہ اس کی سیرت وکردار کو جانچنے کی صحیح میزان ہے۔ باہر کی زندگی تو کوئی بھی انسان ظاہرداری کی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو کسی ایسے رنگ روپ میں پیش کرسکتا ہے جو اس کے حقیقی اخلاق وکردار کا عکاس نہ ہو لیکن گھر کے اندر تصنّع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اگر بفرضِ محال اس سے کام لیا بھی جائے تو یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اپنے گھر کے اندر فطرتِ انسانی کسی تصنّع یا تکلّف سے کام لینے کی مُتحمِّل ہی نہیں ہو سکتی۔ فی الحقیقت کسی شخص کی گھریلو زندگی کا جائزہ لینے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا اپنے اہل وعیال کے ساتھ کیسا برتاؤ ہے اور کیا اس کی باہر کی زندگی (جس میں اس نے اپنے آپ کو ایک اعلیٰ اخلاق وکردار کے حامل انسان کی صورت میں پیش کیا ہے) اس کی گھر کے اندر کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے؟

ظاہر ہے کہ کسی شخص کی خالِص نجی زندگی کا اس قسم کا جائزہ اس کے اہلِ خانہ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کی شہادت ہی وہ کسوٹی ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہے یا اس کی گھریلو معاشرت کیسی ہے۔ اگر وہ اس کے حسنِ سلوک، بلند اخلاق اور لطف وکرم کی بے ساختہ شہادت دیں تو لامحالہ اس کی گھریلو زندگی کو ایک "مثالی زندگی" اور اس کے گھر کو دنیا کی جنّت کہا جاسکتا ہے۔

آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی حیاتِ طیّبہ کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بہترین نمونۂ زندگی قرار دیا ہے جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

((درحقیقت) تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپؐ کی گھریلو زندگی بھی شامل ہے اس لیے اسے بھی لازماً مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہونا چاہیے اور فی الواقع یہ بہترین نمونہ تھی۔

جامع ترمذی (بابُ المناقب) میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی نقل ہوا ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ۔

یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل وعیال (کنبہ، ازواج، اولاد) کے ساتھ اچھا (سلوک کرنے والا) ہے اور میں تم سب سے بڑھ کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا (سلوک کرنے والا) ہوں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے پیشِ نظر اس بات میں کسی کلام کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اپنے اہل کے ساتھ آپؐ کا سلوک دوسرے تمام لوگوں سے بہتر تھا۔ فی الحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں جو دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ آپؐ کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، شادی بیاہ، اہل وعیال، دن رات کی عبادت، پہننا اوڑھنا، نہانا دھونا کھانا پینا خلوت وجلوت، ملنا جلنا، عادات وخصائل، صلح وجنگ سفر وحضر وغیرہ سبھی چیزیں تفصیل کے ساتھ کُتبِ حدیث میں مذکور اور محفوظ ہیں۔ گھریلو معاشرتی زندگی کو خوشگوار اور مثالی بنانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کے سامنے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا اس کے متعدد پہلو تھے مثلاً اہل کے حقوق کی ادائیگی، عدل وانصاف، خدمتِ دین، خلوص، مہر ووفا، عفو ودرگزر، باہمی اعتماد، ذوقِ عبادت، دینی تربیت، تزکیۂ نفس، تعمیرِ سیرت وغیرہ۔ ایک محدود ضخامت کی کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر تفصیلی

نظر ڈالنا تو ممکن نہیں اس لیے ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کی چند جھلکیاں ہی پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

گھر کے اندر کی مصروفیات

○ سیدنا حضرت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے جاتے تو اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ ایک حصہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف فرماتے، دوسرا حصہ اپنے اہل وعیال کے ادائے حقوق میں خرچ کرتے تھے اور تیسرا حصہ اپنی ضروریات اور آرام کے لیے رکھتے تھے۔ پھر تیسرے حصے کو بھی دو حصوں میں تقسیم فرماتے تھے اس طرح کہ خاص خاص صحابۂ کرامؓ اس وقت آپؐ کے پاس آجاتے۔ آپؐ ان کو دینی اور دنیوی امور کی تعلیم دیتے جو ان کے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی مفید اور کار آمد ہوتی اور پھر ان سے فرماتے کہ یہ ہدایتیں ان لوگوں تک بھی پہنچا دو جو یہاں موجود نہیں ہیں اور جو لوگ کسی عذر یا شرم کی وجہ سے اپنی ضروریات مجھ تک نہیں پہنچا سکتے تم لوگ ان کی ضرورتیں مجھ تک پہنچایا کرو۔ (شمائلِ ترمذی)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خانۂ اقدس کے اندر کی ایک مجلس کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

○ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے تو صحابہؓ اس کثرت سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ سارا گھر بھر گیا۔ اتنے میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آئے، ان کو کوئی جگہ نہ مل سکی تو دروازے پر ہی بیٹھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اپنی چادر مبارک اکٹھی کرکے حضرت جریرؓ کی طرف پھینکی اور فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چادر مبارک کو اٹھا کر سر آنکھوں سے لگایا اور اسے چوم کر رونے لگے۔ پھر بڑے ادب کے

ساتھ یہ کہہ کر چادر مبارک حضورؐ کو واپس دے دی کہ یا رسول اللہ میں ناچیز آپؐ کی چادر مبارک پر کیسے بیٹھ سکتا ہوں، آپؐ نے میری عزت افزائی فرمائی، اللہ تعالیٰ آپؐ کی عزت بڑھائے۔" (احیاء علوم الدین جلد دوم)

ازواجِ مطہرات کی تربیت

اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بطورِ خاص ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی تھی اور تعددِ ازواج کا مقصد خواتین کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو دوسری خواتین میں اسلام کی تبلیغ کے علاوہ ان کو اسلامی اخلاق و تہذیب کے نئے اصول بھی سمجھا سکیں۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کی براہِ راست تربیت کی یہاں تک کہ وہ اسلامی اخلاقِ حسنہ کا مثالی نمونہ بن گئیں اور اللہ جل شانہٗ نے ان کو مومنین کی مائیں قرار دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کی تربیت اس طرح فرمائی کہ پہلے تو اخلاق، عادات، معمولات اور عبادات وغیرہ میں اپنی ذات اور عمل کو ان کے لیے نمونہ بنایا اور اگر کبھی ان سے کوئی نامناسب بات سرزد ہوئی تو نرمی اور محبت کے ساتھ ان کو سمجھا دیا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت عبادت گزار تھیں۔ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت زینبؓ نے چھت سے رسی باندھ رکھی ہے تاکہ جب نماز میں کھڑے کھڑے بہت تھک جائیں تو اس کو تھام لیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، یہ رسی کیسی ہے؟ آپؐ کو اس کی غرض بتائی گئی تو فرمایا، اسے کھول دو! جب تھک جاؤ تو بیٹھ جاؤ۔

(صحیح بخاری)

ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:——— "اللہ تو نہیں اکتا تا تم

اُکتا جاؤ گی۔"

مطلب یہ کہ عبادت اپنی طاقت سے بڑھ کر نہیں کرنی چاہیے۔

○ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اشارے سے بتایا کہ فلاں عورت ٹھنگنی (پست قد) ہے۔

آپؐ نے فوراً ان کو ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی:

"عائشہ! تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اسے اگر سمندر میں ڈال دیا جائے تو اس کی کڑواہٹ سے سمندر کا پانی بھی تلخ ہو جائے۔"

(مشکوٰۃ المصابیح)

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو کسی کی عیب جوئی سے منع فرمایا۔

○ ایک سفر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں جس اونٹ پر وہ سوار تھیں اس کو ہانکنے کے لیے مارنا شروع کر دیا۔ حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا:

"عائشہ! نرمی اختیار کرو۔ جس چیز میں نرمی ہوتی ہے وہ اس کی وجہ سے خوبصورت ہو جاتی ہے اور جس چیز سے اسے نکال لیا جائے وہ عیب دار ہو جاتی ہے۔"

(ادب المفرد)

○ ایک دفعہ ایک یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے آیا اور ازراہِ شرارت "السلامُ علیکم" کے بجائے السّامُ علیکم (تم پر موت) کہا حضرت عائشہؓ قریب ہی تھیں انہوں نے یہودی کی بکواس سنی تو غصّے سے یوں جواب دیا:

عَلَيْكَ السَّامُ وَاللَّعْنَة

(تم پر موت اور لعنت بھی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

"اے عائشہ! نرمی اختیار کرو اور سختی سے پرہیز کرو۔"

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! آپؐ نے سنا نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا؟"

آپؐ نے فرمایا، میں نے کہہ دیا تھا عَلَیْکُمْ (تم پر ہو) میری دعا قبول ہو جائے گی اس کی تو نہ ہو گی [1] (صحیح بخاری، کتاب الدعوات)

○ ایک صاحب بڑھاپے کی وجہ سے کچھ چڑچڑے ہو گئے تھے اس لیے لوگ ان سے دور دور ہی رہتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان سے بڑی نرمی اور محبت کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ جب وہ چلے گئے تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس شخص کو (اس کی تند مزاجی یا چڑچڑے پن کی وجہ سے) لوگ اچھائی سے یاد نہیں کرتے لیکن آپؐ نے تو بڑی نرمی سے گفتگو کی۔ آپؐ نے فرمایا، عائشہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک وہ شخص بہت برا ہو گا جس کو لوگ اس کی سخت کلامی کی وجہ سے چھوڑ گئے ہوں۔

(ابوداؤد باب فی حسن المعاشرہ)

○ ایک دفعہ سفر میں ازواجِ مطہرات بھی حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ تھیں۔ اتفاق سے حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جس اونٹ پر سوار تھیں وہ بیمار ہو گیا اور سواری کے قابل نہ رہا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان سے فرمایا، زینب اپنا ایک اونٹ صفیہ کو دے دو۔ انہوں نے (بربنائے رشک کہا، یا رسول اللہ! کیا اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دے دوں۔ اس پر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے

---

[1] یہ روایت "صحیح مسلم کتاب الادب" میں بھی ہے لیکن وہاں ایک کے بجائے چند یہودیوں کا خدمتِ نبویؐ میں آنا بیان کیا گیا ہے۔

پاس نہ گئے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد دوم)

○ خادمِ رسول اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مسلسل دس برس تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق اتنے طویل عرصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کبھی اُف تک نہ کہا اور کبھی یہ تک نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا ــــ اگر ازواجِ مطہراتؓ (میں سے کوئی) مجھے کسی کوتاہی پر ملامت کرتیں تو آپؐ فرماتے:

"چھوڑو، اسے کیوں ڈانٹتی ہو، تقدیر میں یہی تھا۔"

(احیاء علوم الدین جلد دوم)

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زوجہ سے راز میں کوئی بات کہی۔ انہوں نے وہ بات آپ کی ایک دوسری زوجہ تک پہنچا دی۔ اس کی خبر آپ کو وحی الٰہی سے ہوگئی اس پر ان پہلی بیوی صاحبہ سے باز پرس کی کہ تم نے یہ راز کیوں افشا کیا۔ باز پرس کا انداز یہ تھا کہ آپؐ نے پوری بات نہ دہرائی کیونکہ اس طرح ان کو بہت زیادہ ندامت ہوتی ــ بس صرف اشارتاً اتنا فرمایا کہ تم نے ہماری آپس کی بات دوسری تک کیوں پہنچا دی۔

یہ بھی تربیت کا ایک انداز تھا کہ بیویوں کو اپنے شوہروں کے رازوں کی حفاظت کرنی چاہیے اگر بیوی پر اعتماد کر کے اس سے کوئی راز کی بات کی جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس راز کو گھر کے کسی دوسرے فرد کے سامنے بھی افشا کرے۔ قرآن حکیم میں اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ○ (التحریم آیۃ ۳)

ترجمہ: (اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب نبی نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی اور وہ بات اس بیوی نے (کسی دوسری بیوی) کو بتادی اور اللہ نے نبی کو (اس افشائے راز) کی خبر کر دی تو نبی نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی نے اس بیوی کو وہ بات جتلا دی تو وہ بولی، آپ کو اس کی خبر کس نے دی۔ نبی نے کہا، مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے۔)

○ آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ازواجِ مُطَہَّرات میں حضرت حفصہؓ اور حضرت اُمِّ سلمہ رَضِیَ اللّٰہ تعالیٰ عَنْہُما لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صرف پڑھنا جانتی تھیں (ابوداؤد)

ان کی اس ظاہری تعلیم سے قطعِ نظر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو بھی اور دوسری تمام ازواج کو بھی علمِ دین سکھایا۔ علمِ دین میں کلامِ الٰہی کی معرفت، احکام و اسرارِ شریعت سے آگاہی، ضروریاتِ دین سے واقفیت، اخلاق کا تزکیہ وغیرہ سبھی چیزیں شامل تھیں۔ فیضانِ نبویؐ کے چشمۂ صافی سے سیراب ہو کر ازواجِ مُطَہَّراتؓ انسانیت کا بہترین نمونہ بن گئیں، علم و فضل کے اعتبار سے بھی اور عملی زندگی کے اعتبار سے بھی اور پھر رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تربیت کے نتیجے میں انہیں جو کچھ حاصل ہوا اُسے انہوں نے اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے دوسروں تک پہنچانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دورِ حاضر کے نامور عالمِ دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قول کے مطابق "آپؐ کی گھریلو اور معاشرتی زندگی کا ایک تہائی حصہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے احکام و تعلیمات ازواجِ مُطَہَّرات ہی کی رہینِ منت ہیں اور مسلمانوں نے باقاعدہ ان سے سیکھا، یاد کیا اور دوسروں کو بتایا اور سکھایا ہے۔" (نبیِ رحمت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)

○ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، سادگی، تواضع اور زہد و قناعت کا حسین امتزاج تھی (اس کی تفطیل اس کتاب کے بعض دوسرے ابواب میں دیکھی جا سکتی ہے) آپؐ کی ازواج مطہرات پر بھی یہی رنگ غالب آ گیا تھا اور انہوں نے زہد اور عسرت کی اس زندگی کو برضا و رغبت اختیار کر لیا تھا پھر بھی ایک دفعہ انہوں نے بتقاضائے بشری اپنے نفقہ میں اضافہ کی خواہش ظاہر کی۔ آنحضورؐ اپنی بیویوں کی خوشی کے لیے اپنے آپ کو زخارف دُنیوی سے ملوث نہیں کر سکتے تھے اس لیے ازواج کی یہ خواہش آپؐ کے لیے قدرے تردد کا باعث ہوئی۔ اس موقعہ پر یہ حکم الٰہی نازل ہوا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ○ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ○

(سورۃ الاحزاب آیۃ ۲۸ - ۲۹)

(اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو، اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے)

ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

"عائشہ! میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ جواب دینے میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین سے مشورہ کر کے فیصلہ کرو تو بہتر ہوگا۔"

پھر حضورؐ نے ان کے سامنے یہ آیتیں پڑھیں۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا،

یا رسول اللہ! اس میں والدین سے مشورہ کی کیا ضرورت ہے میں تو اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور آخرت کا گھر اختیار کرتی ہوں۔ اس کے بعد حضورؐ نے دوسری ازواج مطہرات سے بھی فرداً فرداً یہی بات پوچھی تو ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ (مسلم، نسائی، مسند احمد)

بلاشبہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ سب ازواج مطہرات نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اللہ، اس کے رسولؐ اور دارِ آخرت کو ترجیح دی۔ علامہ شبلی نعمانی نے "سیرۃ النبیؐ" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعزّہ، اولاد اور ازواج مطہرات کے ساتھ سخت محبت تھی۔ آپؐ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کر دیا تھا اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال و زر کے خزانے لٹا رہی تھی لیکن باایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کی طرح ان کو بھی زخارفِ دنیوی کا خوگر نہیں بنایا بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی اس بنا پر آپؐ کے تمام خاندان کی زندگی آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی تھی۔"

ازواجِ مطہراتؓ کی دلداری اور دلجوئی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کی تربیت کے ساتھ ان کے ناز بھی اٹھاتے تھے اور ان کی دلداری اور دلجوئی کا بھی خیال رکھتے تھے اگر کبھی ان کے درمیان بتقاضائے بشری رشک یا ایک دوسرے سے بڑھنے یا برابری کرنے کے جذبہ کی بنا پر کوئی ناخوشگوار بات ہو جاتی جو باہمی شکر رنجی کا باعث بنتی تو آپؐ اس کو نہایت احسن انداز سے دور فرما دیتے تھے بالفاظِ دیگر ناخوشگواری کی فضا کو بدل کر معمول کا ماحول پیدا فرما دیتے تھے۔ احادیث میں ایسے متعدد واقعات کا ذکر آتا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

○ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ بنت حُیَی رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کے پاس تشریف لے گئے، دیکھا تو وہ رو رہی ہیں۔ آپؐ نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے عرض کیا:

"عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ ہمارا رتبہ دوسری تمام ازواج سے اونچا ہے کیونکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپؐ کی بنتِ عم (چچازاد) بھی ہیں۔" [1]

آپؐ نے فرمایا:

"تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارون علیہ السلام میرے باپ، موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے شوہر ہیں اس لیے تمہارا رتبہ مجھ سے بلند کیسے ہو سکتا ہے۔" (ترمذی، ابواب المناقب)

○ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ کے پاس موجود تھے (یعنی ان زوجہؓ کے حجرے میں تشریف فرما تھے) کہ آپؐ کی ایک دوسری زوجہؓ نے ایک رکابی میں (خادم کے ہاتھ) کھانا بھیجا۔ جس زوجہ کے گھر آپؐ تشریف فرما تھے، انہوں نے خادم کے ہاتھ پر ہاتھ مارا جس سے رکابی گر کر ٹوٹ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹوٹی ہوئی رکابی کے ٹکڑے جمع کیے پھر اس میں سے جو کھانا زمین پر گرا تھا اس کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس کو سمیٹتے جاتے اور فرماتے جاتے، تمہاری ماں نے بھی ایسی ہی غیرت کی تھی۔ پھر آپؐ نے خادم کو روک لیا یہاں تک کہ (اس کے ذریعے) رکابی توڑنے والی زوجہ سے اُن زوجہ کو جن کی رکابی ٹوٹی تھی دوسری رکابی دلوا دی۔ (صحیح بخاری۔ کتاب النکاح)

یہ روایت "سُننِ نسائی" میں بھی کسی قدر اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔

---

[1] ایک اور روایت میں حضرت زینبؓ کی جگہ حضرت حفصہؓ کا نام آیا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ)

اس میں ناموں کی تصریح اس طرح ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف رکھتے تھے۔ کھانا بھیجنے والی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کھانا نہایت اچھا پکاتی تھیں۔ انہوں نے کوئی خاص کھانا پکا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جب کھانے کی رکابی ٹوٹ گئی تو حضور رکابی کے ٹکڑوں کو چنتے تھے اور مسکراتے ہوئے فرماتے تھے، عائشہ تاوان دینا ہوگا۔

(سیرۃ النبیؐ، نقوش رسول نمبر جلد ۴)

○ ایک دفعہ کسی سفر میں ازواج مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں۔ انجشہؓ نامی ایک ساربان بلند آواز سے حُدی پڑھنے لگے جس سے اونٹ تیز چلنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"انجشہ! دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔"

(صحیح بخاری)

ایک اور روایت میں آپؐ کا ارشاد یوں نقل کیا گیا ہے:

"اے انجشہ آہستہ آہستہ چل اور اونٹوں کو ہانکتے وقت خیال رکھ کہ ان پر آبگینے لدے ہوئے ہیں۔" (صحیح مسلم)

آپؐ کا یہ ارشاد اس بناء پر تھا کہ عورتیں فطرتاً نازک مزاج ہوتی ہیں اونٹوں کے تیز چلنے سے ان کو تکلیف ہو سکتی تھی، اسی لیے آپؐ نے ساربان کو حکم دیا کہ اونٹوں کو تیز نہ چلایا جائے۔

○ ایک دفعہ ایک طویل کہانی (تمثیل) نہایت لطف و محبت کے ساتھ سنی اور سنائی گئی۔ "شمائل ترمذی" کے مطابق یہ کہانی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سنائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی جبکہ "نسائی" کے مطابق یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنائی اور حضرت عائشہؓ نے سنی۔ یہ

پُرلطف کہانی یوں تھی :

ایک دن گیارہ سہیلیاں ایک جگہ مل کر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ ہر ایک اپنے اپنے خاوند کا حال کسی بناوٹ کے بغیر صحیح بیان کرے۔

پہلی بولی :

"میرا شوہر ناکارہ دُبلے اونٹ کے ایسے گوشت کی طرح ہے جو کسی پہاڑ پر رکھا ہو۔ نہ میدان ہے کہ وہاں تک کوئی پہنچ جائے نہ گوشت ہی اچھا ہے کہ اسے کوئی اٹھائے جائے۔"

دوسری بولی :

"میں اپنے شوہر کا حال بیان نہیں کروں گی، اگر بیان کروں تو اس قدر طویل ہے کہ ڈر ہے کچھ بیان کرنے سے رہ نہ جائے۔"

تیسری بولی :

"میرا خاوند بڑا درشت مزاج ہے اگر کسی بات میں بول پڑوں تو طلاق پا جاؤں اور خاموش رہوں تو سمجھو کہ نہ بیاہی ہوں نہ بن بیاہی۔"

چوتھی بولی :

"میرا شوہر تہامہ کی رات کی طرح معتدل مزاج ہے۔ نہ گرم ہے نہ ٹھنڈا۔ نہ اس سے کسی قسم کا خوف ہے نہ ملال۔"

پانچویں نے کہا :

"میرا شوہر گھر آتا ہے تو چیتا بن جاتا ہے اور جب باہر نکلتا ہے تو شیر ہو جاتا ہے۔ جو وعدہ کرتا ہے اس میں پھر پوچھنے کی حاجت نہیں۔"

چھٹی بولی :

"میرا شوہر جب کھانے پر آتا ہے تو اکیلا ہی سب چٹ کر جاتا ہے، اور پینے پر آتا ہے تو اکیلا سب چڑھا جاتا ہے۔ لیٹتا ہے تو خود سب اوڑھ لیتا ہے اور پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ

ہوش نہیں رہتا۔"

ساتویں بولی :

" میرا خاوند بے وقوف اور نامرد ہے۔ دنیا کی کوئی بیماری ایسی نہیں جو اسے نہ ہو۔ اخلاق کا ایسا کہ کبھی سر پھوڑ دے اور کبھی کچھ توڑ دے۔"

آٹھویں بولی :

" میرا شوہر چھونے میں خرگوش کی طرح نرم ہے اور خوشبو میں کوسم (زعفران) کی طرح مہکتا ہے۔"

نویں بولی :

" میرے شوہر کی وسیع حویلی ہے۔ متموّل ہے اس کی تلوار کا پر تلا لمبا ہے (یعنی دراز قامت ہے) اس کے چولہے میں راکھ کا ڈھیر ہوتا ہے (یعنی فیّاض اور مہمان نواز ہے) اس کے گھر پر مشورے لینے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔"

دسویں نے کہا :

" میرا شوہر مالک ہے، ایسا مالک جس کے پاس اونٹوں کا بڑا گلہ ہے۔ یہ اونٹ گھر میں بندھے رہتے ہیں، چرنے نہیں جاتے (اس خیال سے کہ معلوم نہیں کوئی مہمان کس وقت آجائے اور ان کے ذبح کرنے کی ضرورت پیش آجائے) باجے کی آواز سُن لیں تو سمجھ جائیں کہ موت کا دن آگیا (یعنی کوئی تقریب ہے)"

گیارہویں سہیلی کا نام " اُمِّ زُرع " تھا، اس نے اپنی لمبی کہانی اس طرح بیان کی :

" میرے خاوند کا نام ابو زُرع ہے۔ میں اس کی کیا تعریف کروں، اس نے زیورات سے مجھے لاد دیا اور کھلا کھلا کر میرے بازوؤں

پر چربی چڑھا دی۔ میرے دل کو مسرّت سے بھر دیا۔ بکری والوں کے گھرانے (یعنی ایک غریب گھرانے) میں مجھے پایا مگر ایسی وسیع و عریض حویلی میں لا رکھا جہاں گھوڑے ہنہناتے ہیں، کہیں اونٹ بلبلاتے ہیں اور کہیں غلّہ ملنے والے اور پھٹکنے والے مزدور ہیں۔ بولتی ہوں تو کوئی بُرا نہیں کہتا۔ سوتی ہوں تو صبح کر دیتی ہوں۔ کوئی میری نیند میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ پیتی ہوں تو سب پی جاتی ہوں۔ اُمِّ ابی زُرع۔ اُمِّ ابی زرع (میری خوشدامن) کیسی ہے؟ اس کے کپڑوں کی گٹھڑی بھاری ہے اور رہنے کا گھر وسیع ہے۔ ابوزُرع کا بیٹا، ابوزُرع کا بیٹا کیسا ہے؟ سوتا ہے تو شمشیرِ برہنہ معلوم ہوتا ہے، کھاتا ہے تو حلوان کا دست کھا جاتا ہے۔ ابوزُرع کی بیٹی، ابوزُرع کی بیٹی کیسی ہے؟ ماں باپ کی فرمانبردار اور سوکن کے لیے رشک۔

ابوزُرع کی لونڈی، ابوزُرع کی لونڈی کیسی ہے؟ وہ ایسی سگھڑ ہے کہ کبھی گھر کی بات باہر نہیں کرتی۔ مکان میں کوڑا کرکٹ جمع نہیں ہونے دیتی اور اس کو شیشے کی طرح صاف رکھتی ہے۔ اناج کو فضول ضائع نہیں کرتی۔"

کہانی ختم ہوئی تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"عائشہ! میں تمہارے لیے ایسا ہی ہوں، جیسا ابوزُرع، اُمِّ زُرع کے لیے۔"

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ میرے لیے اس سے بھی بہت زیادہ بڑھ کر ہیں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اسی قسم کی لطف و محبت

کی گفتگو ہو رہی ہوتی کہ دفعتاً اذان کی آواز آتی ــــ آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے، اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ آپؐ ہم کو پہچانتے ہی نہیں۔

(شمائل ترمذی مع شرح فضائل نبوی)

○ ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دورانِ گفتگو میں خرافہ کا ذکر آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا، کیا تمہیں معلوم ہے خرافہ کون تھا؟ انہوں نے عرض کیا، نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ قبیلہ عذرہ کا ایک شخص تھا۔ ایک دفعہ اس کو جن اٹھا کر لے گئے تھے۔ جنوں کی دنیا میں اس نے جو عجائبات دیکھے تھے واپس آ کر ان کو لوگوں سے بیان کیا تھا۔ اسی لیے لوگ جب کوئی عجیب بات سنتے ہیں تو کہتے ہیں، یہ تو خرافہ کی بات ہے[1]

(شمائل ترمذی باب حدیث خرافہ)

○ ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (شاید کسی بات پر خفا ہو کر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بلند آواز میں بول رہی تھیں اتفاق سے اسی وقت ان کے والدِ گرامی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے۔ انہیں اپنی لختِ جگر کا لب و لہجہ ناگوار گزرا۔ برہم ہو کر انہیں مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ حضورؐ فوراً آڑے آ گئے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چلے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متبسم ہو کر حضرت عائشہؓ سے فرمایا، ــــ "دیکھا، میں نے تم کو (والد کی مار سے) کیسا بچایا۔"

(ابوداؤد باب الادب)

---

[1] مولانا سید سلیمان ندویؒ نے "سیرۃ عائشہؓ" میں لکھا ہے کہ "ہماری زبان میں خرافہ کی جمع خرافات مستعمل ہے، خرافات کے لغوی معنی بیہودہ باتیں واہی تباہی گالی گلوچ وغیرہ کے ہیں۔ اردو زبان میں ایک لفظ "خرافیات" بھی مستعمل ہے۔ اس کا مطلب ہے خیالی قصے کہانیاں، دیومالا یا علم الاصنام ــــ خرافہ کی نسبت سے "خرافیات" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

○ ایک دفعہ عید کے دن چند حبشی (بروایت دیگر سوڈانی) چھوٹے نیزوں کے ساتھ رقص (اچھل کود) کا تماشا دکھا رہے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا، کیا تم یہ تماشا دیکھنا چاہتی ہو؟ انہوں نے عرض کیا، ہاں دیکھنا چاہتی ہوں۔ چنانچہ حضورؐ نے انہیں اپنے پیچھے کھڑا کیا اور وہ آپؐ کے دوش مبارک پر رخسار رکھ کر دیر تک یہ تماشا دیکھتی رہیں یہاں تک کہ حضورؐ نے فرمایا، کیوں ابھی تک جی نہیں بھرا؟ بولیں، نہیں۔ آپؐ چپ رہے، آخر جب تھک گئیں تو خود ہی ہٹ گئیں۔

(صحیح بخاری باب حسن المعاشرہ)

○ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: — "عائشہ! جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے"۔

انہوں نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ! وہ کیسے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"جب تم خوش ہوتی ہو اور کسی بات پر قسم کھانی ہوتی ہے تو یوں قسم کھاتی ہو، محمدؐ کے اللہ کی قسم اور جب تم ناراض ہوتی ہو تو اس طرح قسم کھاتی ہو، ابراہیمؑ کے اللہ کی قسم۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا:

"جی ہاں یا رسول اللہ! میں صرف آپؐ کا نام چھوڑ دیتی ہوں"۔

یہ حضرت عائشہؓ کا ناز تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ناز اٹھاتے تھے۔

(صحیح مسلم)

○ اُمّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب اونٹ پر سوار ہونے لگتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا زانو مبارک آگے بڑھا دیتے تاکہ وہ اس پر پاؤں رکھ کر آسانی سے سوار ہو جائیں۔ (سرایائے رسولؐ)

○ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹنی پر سوار

تھیں کہ اونٹنی کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور حضرت صفیہؓ دونوں گر پڑے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورؐ کی طرف دوڑے۔ آپؐ نے فرمایا، پہلے عورت کی خبر لو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

○ ایک دفعہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ان کے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملنے آئے۔ یہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے، وہ آپس میں مصروفِ گفتگو تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اُمّ حبیبہ! کیا معاویہ تمہیں بہت پیارا ہے؟"

انہوں نے عرض کیا: "ہاں یا رسول اللہ، بھائی مجھے بہت پیارا ہے۔"

ارشاد ہوا، "اگر یہ تمہیں بہت پیارا ہے تو مجھے بھی بہت پیارا ہے۔"

(رہبر کامل)

ظاہر ہے کہ حضورؐ کا ارشاد سن کر حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خوش ہو گئی ہوں گی۔ مختصر یہ کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہراتؓ کی جائز ناز برداری اور دلداری کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی کسی غلط بات پر ان کو ٹوکتے نہیں تھے۔ دلداری اور دلجوئی کے ساتھ آپ ان کی تربیت پر بھی خاص توجہ دیتے تھے تاکہ خواتین کی عملی رہنمائی اور رہبری کے لیے ایک مثالی جماعت تیار ہو سکے۔

○ ۷ھ ہجری یا ۸ھ ہجری کے دوران میں "سُورَۃُ التَّحْرِیْم" نازل ہوئی جس کی پہلی آیت یہ ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(اے نبی! تم کیوں اس چیز کو اپنے اوپر حرام کرتے ہو جو اللہ نے حلال کی ہے (کیا اس لیے کہ) تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ اللہ معاف کرنے

والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔
اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازواج کی خوشی اور دلداری کا اس قدر خیال تھا کہ ایک دفعہ آپؐ نے ان کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اگر اس معاملے کو وہیں رہنے دیا جاتا تو اس حلال چیز کا استعمال اُمّت کے لیے جائز نہ رہتا کیونکہ جس شے کو اللہ کے رسولؐ اپنے اوپر حرام کر لیں، افرادِ اُمّت اس کو حلال نہیں جان سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریم سے باز رہنے کا حکم دیا۔ بظاہر یہ آیت استفہامیہ معلوم ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت اس بات کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ چیز حلال ہے اور رسولؐ اللہ بھی اس کو حلال ہی سمجھیں۔

جمہور مفسرین نے اس آیت کے نزول کا پس منظر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم معمولاً ہر روز عصر کے بعد تمام ازواجِ مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور ہر ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھتے تھے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ آپؐ حضرت زینبؓ بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے کیونکہ حضرت زینبؓ کو کسی نے شہد بھیجا تھا اور وہ اس شہد کا شربت بنا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتی تھیں۔ اس پر بعض ازواجِ مطہراتؓ (حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ) نے بربنائے رشک آپس میں مل کر یہ طے کیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی کے پاس تشریف لائیں تو آپؐ کی خدمت میں عرض کیا جائے کہ حضورؐ کے دہن مبارک سے مغافیر کی بُو آتی ہے۔ مغافیر ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جس میں ایک قسم کی ناخوشگوار بُو ہوتی ہے۔ اگر شہد کی مکھی اس پھول سے شہد حاصل کرے تو اس شہد میں بھی بساند کا اثر آجاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بے حد

نظافت پسند تھے اور آپؐ کو یہ چیز کسی صورت میں گوارا نہیں تھی کہ آپؐ کے اندر کسی قسم کی بدبو پائی جائے۔ چنانچہ جب متعدد ازواج نے آپؐ سے مغافیر کی بُو آنے کی شکایت کی تو آپؐ نے عہد کر لیا کہ اب یہ شہد استعمال نہیں کریں گے۔ اس پر بارگاہِ الٰہی سے حکم نازل ہوا کہ جس چیز کو اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے اپنی بیویوں کی خوشی کی خاطر اسے اپنے اوپر حرام نہ کریں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

○ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مبارک میں کمال درجے کی سادگی تھی۔ گھر کے اندر ہوتے تو بے تکلفی سے گھر کے کاموں میں ازواجِ مطہرات کا ہاتھ بٹاتے، حجرے میں جھاڑو دے لیتے، بکریوں کا دودھ دوہ لیتے، اپنی پوشاک خود دھو لیتے، کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ جوتا پھٹ جاتا تو اس کو خود گانٹھ لیتے۔ بازار سے سودا سلف خرید لاتے۔ اپنی ناقہ کو خود باندھتے غرض اپنے تمام ذاتی کام بالعموم اپنے ہاتھ سے کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ خادموں کے ساتھ ایک برتن میں کھا لینے میں کوئی تکلف نہ تھا۔ اسی طرح غریبوں، مسکینوں کے ساتھ بلا تکلف بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ اپنے گھر کی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے اگرچہ خود کتنی ہی تکلیف برداشت کرنا پڑتی۔ (شمائل ترمذی، ابنِ ماجہ، حیاتِ محمدؐ از محمد حسین ہیکل)

ازواجِ مطہراتؓ کے درمیان عدل

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی شادی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہوئی۔ آپؐ کی عمر مبارک اس وقت پچیس ۲۵ سال کی اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس ۴۰ سال کی تھی۔ اس سے پہلے ان کے دو نکاح ہو چکے تھے اور وہ پہلے شوہروں کی وفات کے بعد عرصہ سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اگرچہ حضرت خدیجہؓ اور آپؐ کی عمروں میں پندرہ سال کا فرق تھا لیکن آپؐ

پورے پچیس ۲۵ سال تک ان کے ساتھ نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ حضرت خدیجہؓ کو اللہ تعالیٰ نے کثیر مال و دولت سے نوازا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کے بعد انہوں نے اپنی دولت دینِ حق کے لیے وقف کر دی اور نہایت ناسا عد حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل و جان سے ساتھ دیا۔ خواتین میں سب سے پہلے ان کو قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ ایک فرزند کے سوا حضورؐ کی باقی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے ہوئی۔ دینِ حق کے لیے ان کی قربانیوں اور ان کے محاسنِ اخلاق کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بے حد محبت تھی۔ ان کی زندگی میں آپؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اربابِ سیر کہتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو حضورؐ جوشِ محبت سے بے تاب ہو جاتے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ از شبلی نعمانیؒ)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح کیے اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد نو ۹ تک پہنچ گئی لیکن آپؐ نے تمام ازواج کے ساتھ حُسنِ سلوک اور حقوق کی ادائیگی میں پورا پورا عدل فرمایا کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی اور باقاعدہ باری مقرر کر کے ہر ایک کے ہاں تشریف لے جاتے رہے[1] تمام ازواجِ مطہراتؓ

---

[1] اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ وہ ان کے درمیان پورا پورا عدل کر سکیں اور یہ بھی فرما دیا ہے کہ ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ جس ذاتِ پاک (حق تعالیٰ) نے عام مسلمانوں پر چار کی قید عائد کی اسی ذاتِ پاک نے اپنے حبیب خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض عظیم مصالح کی خاطر اس قید سے مستثنیٰ فرمایا۔ تعددِ ازواج پر بحث کرنا اس کتاب کا موضوع نہیں ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصلحتیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے گھر (یعنی حجرے) پاس پاس تھے حضورؐ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد آپ تمام ازواج کے گھروں میں تشریف لے جاتے اور ایک ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتے۔ رات کو ازواج کے ہاں قیام کے لیے باری مقرر تھی جس کی باری ہوتی آپؐ اسی کے حجرے میں رات گزارتے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جن زوجہ کی باری ہوتی تھی حضورؐ ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے تو دوسری سب ازواجِ مطہراتؓ وہیں آجاتی تھیں اور دیر تک صحبت رہتی تھی۔ کچھ رات گئے سب رخصت ہو جاتی تھیں۔ سفر میں یہ معمول تھا کہ ازواجِ مطہراتؓ پر قرعہ ڈالا جاتا جن کا نام نکلتا وہی ہمسفر ہوتیں۔ (صحیح بخاری)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور حکمتیں جن کی بناء پر اللہ جلّ شانہٗ نے رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو تعددِ ازواج کے عام قانون سے مستثنیٰ فرمایا، یہاں ہم ان کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیں۔

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جو شریعت لائے اس کی رو سے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول جائز نہیں تھا جبکہ مردوں کی طرح عورتوں کی سیرت سازی بھی ضروری تھی۔ عورتوں میں تبلیغ و اصلاح کا کام عورتوں ہی کے ذریعے ممکن تھا۔ چنانچہ آپؐ نے مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدد خواتین سے نکاح کیے تاکہ ان کو براہِ راست خود تعلیم و تربیت دے کر ایک ایسی جماعت تیار کریں جن کی سیرت و کردار دوسری خواتین کے لیے نمونہ ہو اور پھر وہ شہروں، دیہاتوں اور صحراؤں میں رہنے والی ہر طبقے کی خواتین کو دین کی تعلیم دے سکیں اور ساتھ ہی اسلامی اخلاق و تہذیب کے اصول سمجھا سکیں۔

تعددِ ازواج میں یہ حکمت اور مصلحت بھی تھی کہ مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے ان سے دوستی کا تعلق قائم کیا جائے اور ان کی عداوت کو ختم (یا کم) کیا جائے کیونکہ عربوں کی روایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی وہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض اوقات ایک سے زیادہ ازواج کو سفر میں معیت کا شرف حاصل ہوتا۔ خوراک لباس مکان وغیرہ جملہ امور میں تمام ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپؐ کا سلوک مساویانہ تھا۔ (ازواجِ مطہرات کے گھروں یعنی حجروں کی کیفیت اور گھر میں آپ کی سادہ معاشرت کا حال آپؐ کی "شانِ جہانبانی" کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے) ان کے گزارے کے لیے پہلے یہ انتظام کیا گیا کہ پہلے بنونضیر کے نخلستان میں ان کا حصہ مقرر کر دیا گیا، اس کی آمدنی سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہوتی۔ خیبر فتح ہوا تو ہر زوجہ محترمہ کے لیے اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا۔ (ایک وسق گندم کے وزن کے اعتبار سے ۱۳۰ کلو ۵۰۰ گرام یا تقریباً ۳½ من کے برابر ہوتا تھا)۔ اربابِ سیر کا بیان ہے کہ تمام ازواج سے مساویانہ سلوک میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ وہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا اور سارا قبیلہ اس سے لڑنے کو باعثِ ننگ جانتا تھا۔ ازواجِ مطہرات کا تعلق بنوتیم، بنوعدی، بنوامیہ، بنومخزوم اور یہود کے بعض خاندانوں سے تھا، حضورؐ سے شادی کے بعد ان خاندانوں میں سے اگر کسی سے پہلے ہی دوستی تھی تو وہ اور مستحکم ہو گئی اور اگر ان کا رویہ دشمنی کا تھا تو اس دشمنی کا زور ٹوٹ گیا۔ مختصر یہ کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد آپؐ نے جتنی شادیاں کیں، ان میں کوئی دینی یا سیاسی مصلحت اور حکمت، مسلمانوں کا کوئی مفادِ عام، کسی مفسدے کا سدِ باب یا ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ کارفرما تھا چہ جائیکہ ان میں نفسانی خواہشات کا عمل دخل ہو (جیسا کہ بعض مستشرقین نے ہرزہ سرائی کی ہے) اس وقت آپؐ کی عمر مبارک پچاس۵۰ سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوا باقی سب خواتین جو آپؐ کے عقدِ نکاح میں آئیں، بیوہ تھیں بلکہ بعض بچوں والی تھیں۔ (ان بچوں کی پرورش اور تربیت بھی حضورؐ نے نہایت محبت اور شفقت سے فرمائی) حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بعد جن خواتین کو "ازواجِ مطہرات" کی مقدس جماعت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، مزاج، خاندانی حیثیت اور عمر وغیرہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو قطعاً کوئی کلام نہیں البتہ حضورؐ کا میلانِ طبع حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف زیادہ تھا اور کیسی اور سبب سے نہیں بلکہ صرف ان کے ضبطِ علم، تفقہ فی الدین، ذہانت و فطانت، شوقِ عبادت اور زُہد فی الدُّنیا کی وجہ سے تھا۔ اس کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے اعتبار سے ان میں خاصا فرق تھا اور بعض اوقات ان میں تقاضائے بشریت مُنافست (رشک یا ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش) کا اظہار ہو جاتا تھا لیکن اس میں بدخواہی یا کینہ کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ سب کے دل صاف تھے اور زہد و قناعت، صبر و شکر، دین سے محبت، اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کا جذبہ سب میں مشترک تھا اور پھر اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا اثر کہ سب کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ ان کے نام اور مختصر حالات یہ ہیں:

حضرت سَوْدَہؓ بنتِ زَمعہ

یہ قریش کے خاندانِ بنی عامر بن لُوئی سے تھیں۔ پہلا نکاح حضرت سکران بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا۔ دونوں میاں بیوی دعوتِ اسلام کی ابتدا ہی میں مسلمان ہو گئے اور ۵ سنہ یا ۶ سنہ بعدِ بعثت میں حضورؐ کے ایما پر ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ دو تین سال کے بعد وہاں سے مکّہ واپس آئے تو حضرت سکرانؓ نے قضائے الٰہی سے وفات پائی۔ اسی زمانے میں حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات پائی تھی۔ رمضان یا شوال ۱۰ سنہ بعدِ بعثت میں حضورؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ نہایت رحم دل اور سخی خاتون تھیں۔ نکاحِ ثانی کے وقت ان کی عمر ۵۰ سال کی تھی۔ ۲۲ سنہ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضورؐ کے یارِ غار اور بنو تیم کے رئیس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی بیٹی تھیں۔ حضورؐ کی ہجرتِ مدینہ سے کچھ عرصہ پہلے نکاح ہوا اور ہجرتِ مدینہ کے بعد ۱ سنہ یا ۲ سنہ میں رخصتی ہوئی۔ ذہانت و فطانت اور علم و فضل کے اعتبار سے یکتائے زمانہ تھیں۔ عبادتِ الٰہی سے بے حد شغف تھا اور محاسنِ اخلاق کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضورؐ بارگاہِ الٰہی میں دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ یہ چیز (حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ میلانِ طبع) میرے بس میں نہیں اس پر گرفت نہ کیجیو۔ (ابوداؤد)

ایک دفعہ بتقاضائے بشریت بعض ازواج کو حضرت عائشہؓ کی اس

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ تھیں۔ اپنے علمی ذوق، تفقہ فی الدین اور دوسرے اوصافِ حمیدہ کی بدولت حضورؐ کو سب سے زیادہ عزیز تھیں۔ ۵۸ھ ہجری میں وفات پائی۔ ان سے ۲۲۱۰ احادیث مروی ہیں۔ ان احادیث میں احکامِ شرعیہ کا ایک چوتھائی حصہ موجود ہے۔ ان کی دینی خدمات اور علمی کمالات کی بناء پر علماءِ اسلام نے ان کو محسنۂ اُمّت کا لقب دیا ہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بنو عدی کے رئیس حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ اپنے پہلے شوہر حضرت خُنَیسؓ بن حُذافہ سہمی کی وفات (۳ھ ہجری) کے بعد حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ نہایت خداترس اور عبادت گزار تھیں۔ ان سے ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ ۴۵ھ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

خاندان بنی عامر بن صعصعہ سے تھیں۔ پہلے شوہر حضرت عبداللہؓ بن جحش تھے۔ غزوۂ اُحد میں ان کی شہادت کے بعد حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ نہایت دریا دل اور کشادہ دست تھیں۔ اکثر غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتی تھیں اس لیے "اُمّ المساکین" کے لقب سے مشہور ہوگئی تھیں۔ نکاحِ ثانی کے دو تین ماہ بعد ہی حضورؐ کے سامنے فوت ہوگئیں۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

قریش کی شاخ "بنو مخزوم" سے تھیں اور اس خاندان کے نامور سخی ابوامیہ کی بیٹی تھیں۔ ان کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد تھے۔ ان کی وفات کے بعد

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خصوصیت پر رشک آیا۔ انہوں نے حضرت زینبؓ بنت جحش کو اپنا نمائندہ بنا کر حضورؐ کی خدمت میں یہ ثابت کرنے کے لیے بھیجا کہ حضرت عائشہؓ حضورؐ کے خصوصی التفات کی مستحق نہیں ہیں۔ انہوں نے بارگاہِ نبوی میں اس موضوع پر بڑی زوردار تقریر کی۔ حضرت عائشہؓ خاموشی سے سنتی رہیں اور حضورؐ کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) نکاحِ ثانی ۴ھ ہجری میں حضورؐ سے ہوا۔ بے حد سخی تھیں۔ فضل و کمال میں حضرت عائشہؓ کے بعد انہی کا درجہ مانا جاتا ہے۔ ۶۳ھ ہجری میں ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان سے ۳۷۸ حدیثیں مروی ہیں۔

حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا

قریش کے خاندان "بنو اسد بن خزیمہ" سے تھیں اور حضورؐ کی پھوپھی امیمہ بنتِ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ پہلا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا۔ مزاج میں ناموافقت کی وجہ سے حضرت زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی تو حضورؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ بڑی عبادت گزار، حق گو اور مخیر تھیں۔ ۲۰ھ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت جُویریہ بنتِ حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا

عرب کے مشہور قبیلہ بنو خزاعہ کے خاندان "بنو مصطلق" کے سردار حارث کی بیٹی تھیں۔ غزوۂ بنی مصطلق (۵ھ ہجری) میں مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئیں۔ حضورؐ نے آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ اس نکاح کی بدولت ان کا تمام قبیلہ جو جنگی قیدی بن گیا تھا، آزاد ہو گیا۔ بہت عبادت گزار تھیں اور نہایت عمدہ کھانا پکاتی تھیں۔ ۵۰ھ ہجری میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

قریش کے خاندان "بنو اُمیہ" کے سردار ابوسفیانؓ کی بیٹی تھیں۔ اوائلِ دعوت ہی میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئیں۔ پہلا نکاح عبیداللہ بن جحش سے ہوا اور ۶ھ بعد بعثت میں شوہر کے ساتھ مکہ سے ہجرت کر کے حبش چلی گئیں۔ وہاں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

روئے اقدس کی طرف دیکھتی رہیں۔ حضرت زینبؓ کی تقریر ختم ہوئی تو حضرت عائشہؓ حضورؐ سے اجازت لے کر کھڑی ہوئیں اور ایسی پُر زور اور پُر اثر تقریر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عبید اللہ نے عیسائیت اختیار کر لی اور شراب خواری میں مبتلا ہو گیا مگر حضرت اُمِّ حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں۔ عبید اللہ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے حبش ہی میں مر گیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت اُمِّ حبیبہؓ کا نکاح نجاشی شاہِ حبشہ نے (حضورؐ کی خواہش پر اور حضرت اُمِّ حبیبہؓ کی رضامندی سے) حضورؐ سے (غائبانہ) پڑھا دیا۔ وہ ۷ھ ہجری کے شروع میں حبش سے مدینہ آئیں۔ بڑی دیندار اور غیور خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی پاکیزہ سیرت دی تھی اور ظاہری حسن و جمال سے بھی نوازا تھا۔ ۴۴ھ ہجری میں ۷۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت صَفِیّہ بنت حُیَیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ان کا باپ حُیَی بن اخطب یہودیوں کے قبیلے بنو نضیر کا سردار تھا۔ ان کا پہلا نکاح کنانہ نامی ایک یہودی سے ہوا تھا۔ غزوہ خیبر میں باپ اور شوہر دونوں مارے گئے اور یہ مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئیں۔ آنحضورؐ نے آزاد کر کے حرم میں داخل کر لیا۔ بہت نیک سیرت اور دانا تھیں ۵۰ھ ہجری میں ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا

قبیلہ قیس بن عیلان سے تھیں۔ پہلا نکاح مسعود بن عمرو ثقفی سے ہوا لیکن مسعود نے کسی وجہ سے طلاق دے دی۔ دوسرا نکاح اَبُو رُہم بن عبد العزّیٰ سے ہوا۔ انہوں نے ۷ھ ہجری میں وفات پائی، اس کے کچھ عرصہ بعد حضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے ان سے نکاح کر لیا۔ بہت خدا ترس اور مُتّقی تھیں، علم و فضل کے اعتبار سے بھی بلند مقام رکھتی تھیں۔ ۵۱ھ ہجری میں وفات پائی ان سے ۴۶ احادیث مروی ہیں۔

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

۶ھ ہجری میں آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو گئیں۔ حضورؐ نے فرمایا، کیوں نہ ہو، ابوبکر کی بیٹی ہے۔
(صحیح مسلم کتاب الفضائل نسائی کتاب النکاح)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کا آغاز ہوا تو کچھ دن آپؐ معمول کے مطابق تمام ازواجِ مطہرات کے حجروں میں باری باری جاتے رہے لیکن جب مرض نے شدت اختیار کر لی تو آپؐ نے خواہش ظاہر فرمائی کہ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں مسلسل قیام فرمائیں۔ اس پر تمام ازواجؓ نے اپنی اپنی باری حضرت عائشہؓ کے حق میں چھوڑ دی۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

دعوتِ اسلام کا خط دے کر اسکندریہ کے رومی حاکم کے پاس بھیجا۔ عرب اسے مُقوقس کہتے تھے مُقوقس نے اسلام قبول نہ کیا البتہ حضرت حاطبؓ کی بہت عزت و تکریم کی۔ جب وہ واپس آنے لگے تو مُقوقس نے ماریہ (MARY) اور سیرین نام کی دو نوجوان لڑکیاں حضورؐ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجیں۔ حضورؐ نے ماریہؓ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا اور سیرینؓ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا کر دی۔ یہ دونوں راستے ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ حضرت ماریہؓ کے بطن سے حضورؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے جو کمسنی ہی میں وفات پا گئے۔ بڑی دانا اور سلیقہ مند خاتون تھیں ۱۶ھ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت ریحانہؓ بنت شمعون

ان کا تعلق یہود بنی قریظہ سے تھا۔ غزوۂ بنی قریظہ کے بعد یہ مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئیں مگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا، اس پر حضورؐ نے انہیں آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ بڑی زیرک اور معاملہ فہم خاتون تھیں ۱۰ھ ہجری میں انتقال ہوا

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضِ وفات میں اپنی ازواجؓ سے پوچھا:

"کل میں کہاں قیام کروں گا؟ کل میں کہاں قیام کروں گا؟"

آپ کی مراد یہ تھی کہ عائشہ کی باری کا دن کب ہوگا؟ اس پر تمام ازواج نے اِذن دے دیا کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں۔ آپ نے میرے پاس قیام فرمایا اور میرے پاس ہی آپ نے وفات پائی۔ جب اللہ نے روح قبض فرمائی تو آپ کا سر (مبارک) میرے سینے اور گلے کے درمیان تھا۔ (صحیح بخاری)

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سردرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے تعلق رکھتا ہے لیکن گھر کے افراد میں اولاد بھی شامل ہوتی ہے بلکہ اولاد کی اولاد بھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام اولاد (بیٹوں، بیٹیوں، نواسوں، نواسیوں) سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کی تفصیل "اولاد سے محبت" کے زیرِ عنوان اگلے باب میں بیان کی گئی ہے۔ یہ "آپ کی گھریلو زندگی" ہی کے باب کا دوسرا حصہ ہے۔

اولاد سے محبّت

اولاد سے محبّت کرنا نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کی بھی فطرت کا خاصہ ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ بعض بے درد انسان اولاد پر بے جا سختی کرتے ہیں اور اسے اکثر اپنی ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ اولاد کو اپنی محبّت اور شفقت سے محروم کرنا بہت بڑا ظلم اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا موجب ہے۔ رحمت عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اُسوۂ حسنہ سے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اولاد والدین اور دوسرے بزرگوں (دادا دادی، نانا نانی) کی محبّت اور شفقت کی سب سے زیادہ مستحق ہوتی ہے۔ اس محبّت اور شفقت میں اولاد کا اچھا نام رکھنا اور اچھے طریقے سے اس کی پرورش اور عمدہ تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا بھی شامل ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سب سے پہلے تو "قتلِ اولاد" کو نہایت گھناؤنا فعل قرار دیا اور بچیوں کو زندہ گاڑ کر یا کسی اور طریقے سے ہلاک کرنے کی قبیح رسم کا یکسر خاتمہ کر دیا بلکہ لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح پالنے والوں کو جنّت کا مستحق قرار دیا (اس کی تفصیل ایک الگ مضمون میں بیان کی گئی ہے) اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور نواسے نواسیوں سے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بے پایاں محبّت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ ۸ سنہ ہجری میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے تو آپؐ کو بہت خوشی ہوئی اور جو صاحب یہ مژدہ لائے ان کو ایک غلام عطا فرمایا۔ بچے کا عقیقہ کیا اور اس کے سر کے بالوں کے برابر چاندی بطور صدقہ دی۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ

صَلَّی اللہ عَلَیۡہِ وَسَلَّم سے زیادہ کسی کو اپنے خاندان سے محبت کرتے نہیں دیکھا۔ (آپؐ کے صاحبزادے) حضرت ابراہیمؓ عوالی میں پرورش پاتے تھے جو مدینہ سے تین چار میل دور ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیۡہِ وَسَلَّم ان کو دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ پا تشریف لے جاتے تھے۔ ہم بھی آپؐ کے ساتھ جاتے تھے۔ گھر میں دھواں بھرا ہوتا تھا مگر آپؐ اندر چلے جاتے کیونکہ ابراہیمؓ کی مرضعہ (دودھ پلانے والی انّا) کے شوہر لوہار تھے۔ آپؐ بچے کو مرضعہ کے ہاتھ سے لے لیتے، ان کا منہ چومتے پھر مدینہ کو واپس آتے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابراہیمؓ سترہ اٹھارہ ماہ کے بعد شدید بیمار ہو گئے۔ حضور صَلَّی اللہ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کو خبر ملی تو آپؐ اپنے چند اصحاب کے ساتھ ان کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کے ساتھ ابو سیفؓ لوہار کے گھر پہنچے (جو ابراہیمؓ کی مرضعہ کے شوہر تھے) رسول اللہؐ نے ابراہیمؓ کو اپنی گود میں لیا اور ان کے منہ پر منہ رکھ کر پیار کیا اُس وقت ابراہیمؓ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپؐ رو رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، اے ابنِ عوف! یہ تو رحمت ہے۔ بے شک آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمگین ہے لیکن ہم وہی بات منہ سے کہیں گے جس کو اللہ پسند کرتا ہے۔

○ حضور صَلَّی اللہ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کے ایک صاحبزادے آپؐ کی بعثت سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے، ان کا نام قاسم رکھا گیا۔ حضورؐ نے انہی کے نام پر اپنی کنیت ابوالقاسم رکھی۔ قاسمؓ نے بہت تھوڑی عمر پائی (باختلافِ روایت سات دن یا دو سال) لیکن آپؐ نے ان کے نام کی نسبت سے جو کنیت اختیار کی اسے ہمیشہ قائم رکھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا کہ میرے نام پر نام رکھو لیکن میری

کنیت اختیار نہ کرد۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ آپؐ کو ان چاروں سے بے حد محبت تھی۔ بعثت کے بعد حضورؐ کو کفار نے ستانا شروع کیا تو چاروں صاحبزادیاں ہر مصیبت میں آپؐ کی شریک رہیں۔

○ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ غزوۂ بدر میں حضورؐ کے بڑے داماد ابوالعاص بھی اسیرانِ جنگ میں شامل تھے۔ حضرت زینبؓ نے ان کے فدیہ میں اپنے گلے کا ہار بھیج دیا۔ یہ ہار ان کو اپنی والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی طرف سے ملا تھا۔ حضورؐ نے یہ ہار دیکھا تو آپؐ پر رقت طاری ہو گئی کہ میری بچی اپنی مرحومہ ماں کی نشانی جدا کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ صحابہؓ سے فرمایا، اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو یہ ہار زینبؓ کو واپس بھیج دوں۔ سب نے نہایت خوشی سے اسے منظور کیا۔ (سیرۃ النبیؐ، شبلی نعمانیؒ)

حضرت زینبؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ۸ھ ہجری میں وفات پائی تو آپؐ نے (بادیدۂ گریاں) فرمایا:

"زینب میری سب سے اچھی لڑکی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی"

صحیح بخاری میں حضرت اُمّ عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں بھی زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل میں شریک تھی۔ حضورؐ (باہر کھڑے ہو کر) غسل کا طریقہ خود بتاتے جاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، پہلے ہر عضو کو تین بار یا پانچ بار غسل دو اور اس کے بعد کافور لگا دو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت اُمّ عطیہ سے فرمایا:

"اے اُمّ عطیہ! میری بیٹی کو اچھی طرح کفن میں لپیٹنا۔ اس کے بالوں کی تین چوٹیاں بنانا اور اسے بہترین خوشبوؤں سے معطر کرنا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے اپنا تہمد غسل دینے والی خواتین کو دے کر فرمایا کہ اسے کفن کے اندر پہنا دو۔

حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے پیچھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑے۔ لڑکے کا نام علیؓ تھا اور لڑکی کا اُمامہؓ۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ حضرت علی زینبیؓ نے رضاعت کے دو سال قبیلہ بنی غاضرہ میں گزارے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے شفیق نانا کی آغوشِ محبت میں پرورش اور تربیت پائی۔ ان کے بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچنے سے پہلے وفات پا گئے اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے جنگِ یرموک (۱۵ھ) میں شہادت پائی اور فتح مکہ کے موقع پر وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپؐ کی سواری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ننھی اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی آپؐ کو اس قدر محبت تھی کہ بعض دفعہ نماز کے وقت بھی انہیں ساتھ رکھتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس مسجدِ نبوی میں تشریف لائے اور اُمامہؓ بنت ابی العاصؓ آپؐ کے کندھے پر سوار تھیں۔ آپؐ نے نماز پڑھی جب آپؐ رکوع میں جاتے تو انہیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو انہیں پھر اٹھا لیتے۔ اسی طرح پوری نماز ادا کی۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفے میں ایک خوبصورت (عقیق کا) ہار آیا۔ آپؐ نے فرمایا، یہ میں اپنے عزیزوں میں سب سے محبوب فرد کو پہناؤں گا۔ آپؐ کے ارشاد سے قیاس کیا گیا کہ یہ ہار عائشہ کو عطا ہو لیکن آپؐ نے (اپنی نواسی) اُمامہ بنتِ زینبؓ کو بلایا اور وہ ہار ان کے

گلے میں ڈال دیا۔ (الاصابہ ۔ الاستیعاب)

○ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (بقول شارحین حدیث حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے آپؐ کو کہلا بھیجا کہ میرا بچہ آخری دموں پر ہے اس لیے آپؐ تشریف لائیں۔ آپؐ نے اس کے جواب میں سلام کہلا بھیجا اور پیغام دیا کہ بیٹی اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اُسی کا ہے اور جو کچھ کسی کو دے وہ بھی اُسی کا ہے۔ الغرض ہر چیز ہر حال میں اسی کی ہے، اور ہر چیز کے لیے اس کی طرف سے ایک وقت اور مدت مقرر ہے۔ پس چاہیے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس صدمہ کے اجر و ثواب کی امیدوار ہو۔ (یہ پیغام ملنے پر) صاحبزادی نے پھر آپؐ کے پاس پیام بھیجا اور قسم دی کہ اس وقت آپؐ ضرور ہی تشریف لے آئیں۔ پس آپؐ کھڑے ہوئے اور صاحبزادی کے گھر کی طرف چل دیئے اور آپؐ کے ساتھ سعدؓ بن عبادہ، معاذؓ بن جبل، اُبیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت اور کچھ دوسرے اصحاب بھی ہو لیے۔ پس وہ بچہ اٹھا کر آپؐ کی گود میں دے دیا گیا۔

اس وقت اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس کا یہ حال دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر سعدؓ بن عبادہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا، یہ رحمت کے اس جذبہ کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا اور اللہ کی رحمت ان ہی بندوں پر ہوگی جن کے دلوں میں یہ جذبہ ہو (اور جن کے دل سخت اور رحمت کے جذبہ سے بالکل خالی ہوں وہ اللہ کی رحمت کے مستحق نہ ہوں گے)۔

(معارف الحدیث جلد دوم بحوالہ بخاری و مسلم)

○ اپنی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے بھی حضورؐ کو

بہت محبت تھی۔ انہوں نے اپنے شوہر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کی تو آپؐ نے فرمایا :

"ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ ہجرت کی۔" (الاصابہ)

ہجرت حبشہ کے بعد جب عرصہ تک ان کی کوئی خبر نہ ملی تو حضورؐ کو بہت فکر ہوئی۔ ایک دن جب کسی عورت کے ذریعے خبر ملی کہ دونوں میاں بیوی حبش میں بخیریت ہیں تو آپؐ کو اطمینان ہوا۔

۲ھ ہجری میں حضورؐ بدر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ حضرت رقیہؓ کو چیچک نکل آئی۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو ان کی تیمارداری کے لیے مدینہ ہی میں چھوڑ دیا اور خود بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ (صحیح بخاری)
آپؐ کی غیر حاضری میں حضرت رقیہؓ نے وفات پائی۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ کو بہت صدمہ ہوا اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مدینہ واپس تشریف لا کر آپؐ حضرت رقیہؓ کی قبر پر تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی بہن کی قبر پر آئیں اور بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضورؐ اپنی چادر مبارک کے کنارے سے ان کے آنسو پونچھتے تھے اور صبر کی تلقین فرماتے تھے۔

(الاستیعاب)

حضرت رقیہؓ نے اپنے پیچھے عبداللہؓ نامی ایک صاحبزادے چھوڑے تھے۔ ان کی عمر ابھی چھ سال کی تھی کہ ایک مرغ نے آنکھ میں چونچ ماری اسی کے صدمہ سے وہ فوت ہو گئے۔ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عثمانؓ رسولؐ اللہ کی گود میں تھے اور اس پر آپؐ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کی وفات سے حضورؐ کو بہت دکھ ہوا اور آپؐ نے خود ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی
یہ ۴ھ ہجری کا واقعہ ہے۔

○ حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ نے اپنی تیسری پیاری بیٹی حضرت

اُمِّ کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کر دیا۔ کوئی چھ سال بعد حضرت اُمِّ کلثوم بھی فوت ہو گئیں (۹ھ) حضورؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّ کلثومؓ کی قبر پر بیٹھے ہوئے تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

(طبقات ابنِ سعد و صحیح بخاری)

○ اپنی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ کو اس قدر محبت تھی کہ جب وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ پر بٹھاتے

(صحیح مسلم)

○ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فاطمہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جس نے فاطمہ کو غضب ناک کیا اس نے مجھ کو غضب ناک کیا۔ (صحیح بخاری)

○ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر یا غزوہ پر جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے اور جب واپس آتے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے پھر حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے پھر ازواج مطہراتؓ کے پاس۔ (الاستیعاب)

○ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بچوں سے بھی آنحضورؐ بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ آپؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لاؤ۔ وہ لاتیں تو آپؐ ان کو سونگھتے اور سینہ سے لپٹاتے۔

(سیرۃ النبیؐ ۔۔۔ شبلی نعمانیؒ)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنؓ بن علیؓ کا منہ چوما۔ آپؐ کے پاس (ایک بدو سردار)

اقرع بن حابس بیٹھے تھے۔ اقرع نے کہا میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی کسی کا منہ نہیں چوما۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا، اگر اللہ تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟ پھر فرمایا، جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔
(صحیحین و ترمذی)

○ ایک دفعہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کہیں دعوت میں تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت حسین رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہ راستے میں کھیل رہے تھے آپؐ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیئے، وہ ہنستے ہوئے آپؐ کے پاس آکر نکل جاتے تھے۔ بالآخر آپؐ نے ان کو پکڑ لیا ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا۔ پھر فرمایا کہ حسین میرا ہے اور میں حسین کا ہوں۔ (ادب المفرد بخاری)

○ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو فرماتے سنا کہ حسن اور حسین میری دنیا کے دو پھول ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الادب)

○ ایک دن رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک ننھے حسنؓ اور حسینؓ آ گئے جو اس وقت سرخ کرتے پہنے ہوئے تھے۔ کمسنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے چلتے تھے (چلتے تھے اور گر پڑتے تھے) آپ منبر سے اترے، دونوں کو گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ (بیشک تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں یعنی آزمائش کی چیزیں ہیں) میں نے دونوں بچوں کو دیکھا کہ یہ چلتے ہیں اور گر پڑتے ہیں تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا یہاں تک کہ میں نے اپنی بات کو قطع کر دیا۔ (ترمذی باب المناقب الحسن والحسین)

○ ایک دفعہ حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ (راوی کو بہ تعین یاد نہیں رہا)

آپؐ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، اوپر چڑھ آؤ۔ انہوں نے آپؐ کے سینے پر قدم رکھ دیئے۔ آپؐ نے منہ چوم کر فرمایا، اے اللہ! میں اس سے محبّت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبّت رکھ۔

(سیرۃ النبیؐ بحوالہ ادب المفرد بخاری)

○ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلّم ہمارے پاس تشریف لائے اور آپؐ کے ساتھ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھے۔ ایک ایک کاندھے پر تھے اور دوسرے دوسرے کاندھے پر۔ آپؐ کبھی ایک کا بوسہ لیتے اور کبھی دوسرے کا۔ ایک شخص نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپؐ ان دونوں بچّوں سے بہت محبّت رکھتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا، جس نے ان دونوں سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبّت کی اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔

(حیاۃ الصحابہ بحوالہ مُسندِاحمد، بزار، ہیثمی وابن ماجہ)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلّم سجدہ میں ہوتے تو حضرت حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما آتے اور آپؐ کی پشت پر سوار ہو جاتے۔ آپؐ سجدہ کو طویل کر دیتے۔ عرض کیا گیا، اے اللہ کے نبی آپؐ نے سجدے کو بہت طویل کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھ پر میرے دونوں بچّے سوار ہو گئے تھے۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ سجدہ میں جلدی کروں۔

(حیاۃ الصحابہ بحوالہ ابویعلیٰ وہیثمی)

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بچوں پر شفقت

شفقت کے معنی مہربانی، رحم، غمخواری، الفت، محبّت اور پیار کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف سارے جہانوں اور انسانوں کے تمام طبقوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا بلکہ آپؐ کو اہلِ ایمان کے لیے رؤفٌ رَّحیمٌ (شفیق اور نہایت مہربان) بھی بنایا۔ (سورۃ الانبیاء و التوبہ)
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ہر معاملے میں نمونہ قائم فرما دیا ہے۔ یوں تو آپؐ ہر عمر کے انسانوں کے لیے خیر مجسّم تھے لیکن بچّوں سے تو آپؐ کی محبّت کی کوئی تھاہ ہی نہیں تھی۔ آپؐ گلشنِ ہستی کے ان نوشگفتہ پھولوں پر اس قدر شفقت فرماتے تھے کہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے بچّوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا احترام نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔
(ترمذی شریف)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم معصوم بچّوں میں ہوتے تو انہیں چومتے پیار کرتے، اُن سے مذاق کرتے اور کبھی کبھی اُن کا دل بہلانے کے لیے اُن کے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ سفر سے واپس تشریف لاتے تو راستے میں جو بچے ملتے، انہیں نہایت شفقت سے آگے یا پیچھے سواری پر بٹھا لیتے تھے۔ اگر کوئی شخص حضورؐ کی خدمت میں فصل کا نیا میوہ پیش کرتا تو حضورؐ سب سے پہلے اُسے کم سِن بچّوں میں تقسیم فرماتے۔
حضورؐ کو راستے میں بچے کھیلتے ہوئے مل جاتے تو آپؐ متبسم ہو کر

نہایت محبت سے انہیں سلام کرتے۔ ان کو سلام میں پہل کرنے کا موقع ہی نہ دیتے۔ بچے بھی آپؐ سے بڑی محبت کرتے۔ جہاں آپؐ کو دیکھتے لپک کر آپؐ کے پاس پہنچ جاتے۔ آپؐ ایک ایک کو گود میں اٹھاتے، پیار کرتے اور کوئی کھانے کی چیز عنایت فرماتے۔ کبھی کھجوریں، کبھی تازہ پھل اور کبھی کوئی اور چیز۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہرِ نبوت پشت مبارک پر ابھری ہوئی تھی۔ بعض دفعہ معصوم بچے اس سے کھیلنے لگتے۔ بچوں کے ماں باپ انہیں روکتے، تو حضورؐ فرماتے، "کھیلنے دو۔ روکو نہیں۔"

○ ہجرت کے موقع پر جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہو رہے تھے تو ہر طرف جشن کا سماں تھا۔ بڑوں کے ساتھ بچے بھی حضورؐ کی آمد پر بے پناہ مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اچھل کود رہے تھے اور اللہ اکبر، اللہ اکبر — جاءَ رسولُ اللّٰہ، جاءَ رسولُ اللّٰہ (رسول اللہ تشریف لائے، رسول اللہ تشریف لائے) کے نعرے لگا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں آپؐ کے آنے کی خوشی میں دف بجا بجا کر یہ گیت گا رہی تھیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِي النَّجَّارِ
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِّنْ جَارٍ

(ہم بنو نجار کی بیٹیاں ہیں، محمدؐ کیا ہی اچھے ہمسایہ ہیں۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے تو ان لڑکیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے لڑکیو! تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟"

سب نے کہا: "ہاں، یا رسول اللہ"

آپؐ نے فرمایا، "میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں۔" (سیرۃ ابنِ ہشام)

○ حضرت غُضَیف بن حارث ثمالی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں بچپن میں انصار کے باغوں میں چلا جاتا اور کھجور کے درختوں پر ڈھیلے مار کر کھجوریں گراتا۔ لوگ مجھ کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپؐ نے مجھ سے پوچھا، درختوں پر ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟

میں نے کہا، کھجوریں کھانے کے لیے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"جو کھجوریں زمین پر ٹپکتی ہیں ان کو اٹھا کر کھالیا کرو ڈھیلے نہ مارا کرو۔"

یہ فرما کر آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی کہ الٰہی اس کو شکم سیر کر دے۔ (ابوداؤد، کتاب الجہاد)

○ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔ ادھر سے چند بچے آرہے تھے۔ آپؐ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔ (صحیح مسلم)

○ ایک مرتبہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بچے کو دیکھا، جو دوسرے بچوں سے الگ تھلگ مغموم و افسردہ بیٹھا تھا۔ حضورؐ نے اس بچے سے پوچھا:

"بیٹے کیا بات ہے تم مغموم کیوں بیٹھے ہو حالانکہ تمہارے ساتھی کھیل کود رہے ہیں؟"

بچے نے جواب دیا: "میرا باپ فوت ہو گیا ہے اور ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اب میرا سرپرست کوئی نہیں ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا: "کیا تم کو پسند نہیں کہ محمدؐ تمہارا باپ ہو، عائشہؓ تمہاری ماں ہو اور فاطمہؓ تمہاری بہن ہو۔"

بچہ خوش ہو گیا اور رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

○ زمانہ جاہلیت میں عرب اپنی بچیوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے رحمتِ دو عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس ظالمانہ اور قبیح رواج کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ پھر بھی بعض لوگ بیٹیوں کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا:

"یا رسول اللہؐ! اگر کسی شخص کی تین بیٹیاں ہوں اور بیٹا کوئی نہ ہو تو پھر؟"

حضورؐ نے فرمایا:

"دو یا تین تو کیا اگر کوئی شخص اپنی ایک ہی بیٹی کے ساتھ بھلا برتاؤ کرے اور اسے اچھی تربیت دے تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کی آگ سے بچا لے گا (یعنی دو یا تین یا زیادہ بیٹیوں سے حسن سلوک تو اور بھی زیادہ اجر و ثواب کا مستحق بنا دیتا ہے۔) (مشکوٰۃ)

○ ایک دفعہ ایک صحابیہ حضرت اُمِّ قیس بنت محصن رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے دودھ پیتے بچے کے ساتھ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئیں۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بچے کو ان سے لے کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اس نے آپؐ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا۔ آپؐ نے اس پر پانی بہا دیا اور کچھ نہ کہا۔

(صحیح بخاری)

○ ایک دفعہ عید کے دن رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم چہرۂ اقدس پر چادر ڈالے لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ بچیاں گھر میں آئیں اور خوشی کے گیت گانے لگیں اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور ان بچیوں کو ڈانٹنے لگے کہ تم رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے گاتی ہو؟ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سنا تو چادر ہٹائی اور فرمایا:

"ابوبکر! انہیں کچھ نہ کہو گانے دو آج عید کا دن ہے۔" (صحیح بخاری)

○ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا۔ یکایک (عورتوں کی) صف سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو نماز مختصر کر دیتا ہوں (یعنی تھوڑی سی آیات پڑھ کر نماز جلد ختم کر دیتا ہوں) کہ بچے کی ماں کو تکلیف ہوتی ہو گی۔ (صحیح بخاری)

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک بچہ بھی تھا۔ اس شخص نے (از راہِ محبت) بچے کو اپنے ساتھ چمٹانا شروع کر دیا۔ (یہ دیکھ کر) آپؐ نے اس شخص سے فرمایا، کیا تو اس بچے پر رحم کرتا ہے؟ اس نے عرض کیا، جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تجھ پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنی کہ تو اپنے بچے پر مہربانی کرتا ہے (یعنی اس سے محبت کرتا ہے) اور اللہ تعالیٰ سب رحم کرنے والوں میں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

(ادب المفرد، بخاری)

○ ایک دفعہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ اے اللہ کے رسول ہم زمانۂ جاہلیت میں بتوں کی پرستش کرتے تھے اور اپنی لڑکیوں کو تنگ دستی اور بے جا غیرت کے سبب مار ڈالتے تھے۔ میری ایک بچی تھی میں نے اسے بلایا وہ خوشی خوشی میرے پیچھے ہولی۔ کچھ دور ایک کنواں تھا۔ میں اس پر پہنچا تو میں نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنوئیں میں گرا دیا اس وقت وہ ابا ابا کہہ رہی تھی۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہو گئے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا کہ یہ قصہ پھر بیان کرو۔ اس شخص نے دہرایا تو آپؐ اس قدر روئے کہ آنسوؤں سے ریش مبارک تر ہو گئی۔

(مسند دارمی)

○ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا ہے کہ جس نے کسی یتیم بچّے کی پرورش کی ہیں اور وہ جنّت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپؐ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو اس طرح دکھایا کہ ان کے درمیان تھوڑی سی کشادگی تھی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

○ حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لیے کسی یتیم (بچے) کے سر پر ہاتھ پھیرے تو یتیم کے ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ پڑے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جو شخص اس یتیم بچی یا بچے کے ساتھ جو اس کی پرورش اور تربیت میں ہو احسان کرے۔ میں اور وہ جنّت میں اس طرح ہوں گے جیسے دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں (پھر آپؐ نے دو انگلیوں کو ملا کر دکھایا)۔

(مشکوٰۃ بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

○ ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئی۔ دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اس نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا۔ ان کے پاس اس وقت ایک کھجور کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی وہی اس عورت کو دے دی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا دونوں بیٹیوں کو دے دیا اور خود کچھ نہ کھایا۔ پھر وہ چلی گئی۔ رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص بیٹیوں کے ساتھ تنگدستی اور عسرت کی آزمائش میں ڈالا جائے اور پھر بھی ان کے ساتھ احسان و سلوک کرے تو یہ بیٹیاں اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن جائیں گی (یعنی اس کو دوزخ سے بچائیں گی)

(مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

○ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جس زمانے میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی غلامی میں آنے کا شرف حاصل ہوا، وہ نابالغ لڑکے

تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے یہاں تک کہ ان کو آزاد کر کے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ حضرت زیدؓ کو ان کے بچپن میں ڈاکو اٹھا لائے تھے اور قریش مکہ کے پاس فروخت کر دیا تھا۔ ان کے والد کئی سال تک ان کی تلاش میں سرگرداں رہے آخر جب انہیں پتہ چلا کہ زیدؓ مکہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تو وہ اپنے بھائی اور دوسرے بیٹے کو ساتھ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ زیدؓ کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔

آپؐ نے فرمایا کہ زید جو پسند کرے وہی مجھے منظور ہوگا۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو میں کوئی فدیہ لیے بغیر اسے تمہارے حوالے کر دوں گا اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو میں ایسا نہیں کہ اسے زبردستی اپنے سے جدا کر دوں۔

جب حضرت زیدؓ سے ان کی مرضی پوچھی گئی تو انہوں نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے آقا مجھ پر اس قدر مہربان ہیں کہ حقیقی والدین بھی اپنی اولاد کے حق میں اتنے شفیق اور رحیم نہیں ہوتے حضرت زیدؓ کے والد چچا اور بھائی نے یہ سن کر اپنی بات پر اصرار نہ کیا اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

حضرت زیدؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر مہربان دیکھ کر لوگ ان کو حِبُّ الرسولؐ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب) کہا کرتے تھے۔ انہی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے انتہا پیار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بھی "حِبُّ النّبیؐ" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ حضورؐ اپنے ایک زانوئے مبارک پر اپنے نواسے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور دوسرے پر حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بٹھاتے

اور دعا کرتے کہ اے اللہ میں ان دونوں سے محبّت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبّت رکھ۔ (صحیح بخاری)

○ ایک دن ننھے اُسامہؓ کی ناک بہہ رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ناک صاف کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قریب ہی تھیں انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ تکلیف نہ فرمایئے اسامہ کی ناک میں صاف کیے دیتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، عائشہ! اس سے محبت رکھو اس لیے کہ میں اس سے محبّت رکھتا ہوں۔ (جامع ترمذی)

○ ایک دفعہ ننھے اُسامہؓ دروازے کی چوکھٹ سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے اور ان کے چہرے پر زخم آ گیا جس سے خون رِسنے لگا۔ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا اس کا خون صاف کر دو۔ انہیں کچھ دیر لگی تو آپؐ نے خود اٹھ کر ان کا خون صاف کر دیا۔ (جمع الفوائد)

○ ایک دن حضورؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا، عائشہ اگر اُسامہ لڑکی ہوتا تو میں اس کو خوب زیور پہناتا اور اچھے اچھے کپڑے پہناتا پھر جگہ جگہ سے اس کے لیے پیغام آتے۔ (یہ بات آپؐ نے فرطِ محبّت سے لاڈ یا مذاق کے طور پر فرمائی)۔

بعض دفعہ کہیں سے کوئی عمدہ تحفہ آتا تو آپؐ حضرت اُسامہؓ کو دے دیتے۔ (طبقات ابن سعد)۔

○ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمنوں کے بچّوں کے ساتھ بھی مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔ چنانچہ مشرکوں کے بچّے بھی دوڑ دوڑ کر آپؐ کے پاس آیا کرتے تھے۔ کافروں سے جنگ ہوتی تو آپؐ صحابہ کو حکم دیتے کہ دیکھنا کسی بچّے کو نہ مارنا وہ بے گناہ ہیں انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

ایک دفعہ ایک غزوے میں چند بچّے جھپٹ میں آ کر مارے گئے۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو بہت آزردہ ہوئے۔ ایک صحابی نے عرض کیا، یا رسول اللہ!

وہ مشرکین کے بچے تھے۔

آپؐ نے فرمایا، مشرکوں کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر بچہ اللہ ہی کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ (مُسنَد احمد)

○ حضور صَلّی اللہ عَلَیہِ وَسَلّم کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں بچپن میں لڑکوں کے ساتھ گلیوں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ صَلّی اللہ عَلَیہِ وَسَلّم کو پیچھے آتے دیکھا تو جلدی سے ایک گھر کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا لیکن آپؐ نے مجھے پکڑ لیا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا، جاؤ معاویہ کو بلا لاؤ۔ وہ حضورؐ کے کاتب تھے میں دوڑ کر ان کے پاس گیا اور کہا آپ کو رسول اللہ صَلّی اللہ عَلَیہِ وَسَلّم بلا رہے ہیں کوئی خاص کام ہے۔ (مُسنَدِ احمد، الاِصابہ)

○ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خالہ تھیں اور ان سے بہت پیار کرتی تھیں اس لیے وہ اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی رات کو بھی ان ہی کے گھر سو رہتے تھے۔ اس طرح ان کو رسولِ اکرم صَلّی اللہ عَلَیہِ وَسَلّم کی صحبت سے بھی مستفیض ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔ آنحضورؐ بھی ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک رات حضرت عبداللہؓ اپنی خالہ کے یہاں تھے اور جاگ رہے تھے کہ حضورؐ نماز کے لیے بیدار ہوئے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ حضرت عبداللہؓ سمجھ گئے چپکے سے اٹھے اور وضو کے لیے پانی لا کر رکھ دیا۔ آپؐ نے وضو فرما کر پوچھا، پانی کون لایا تھا؟ حضرت میمونہؓ نے حضرت عبداللہ کا نام لیا۔ آپؐ بہت خوش ہوئے اور حضرت عبداللہؓ کو دعا دی کہ اے اللہ اس بچے کو دین کی سمجھ بوجھ دے اور ایسا علم عطا کر کہ ہر بات کا منشا سمجھ لے۔ (مُسنَدِ احمد)

○ خادمِ رسول اللہؐ حضرت انس بن مالک رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ دس برس کی

عمر میں رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں آئے اور دس برس تک آپؐ کی خدمت کرتے رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"میں نے دس برس رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت کی۔ اس مدت میں نہ کبھی آپ خفا ہوئے اور نہ کبھی یہ پوچھا کہ یہ کام کیوں ہوا یا کیوں نہیں ہوا۔"

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ پیار سے کبھی ان کو "بیٹا" اور کبھی "اُنَیس" کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ ایک دن لاڈ سے فرمایا: "یَا ذَا الْاُذُنَیْن" اے دو کانوں والے (صحیح مسلم)

○ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنے چچا حضرت عباس رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہ کے کم سن بیٹوں سے بہت محبت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ آپؐ نے عبد اللہؓ، عبید اللہؓ، قثمؓ اور کثیرؓ ابنائے حضرت عباسؓ کو بلایا اور ان سے فرمایا:

"بچو! تم میں سے جو دوڑ کر مجھ کو سب سے پہلے ہاتھ لگائے گا میں اس کو فلاں چیز دوں گا۔"

تینوں بھائی دوڑ کر آپؐ کی طرف جاتے کوئی آپ کے سینہ سے چمٹ جاتا، کوئی پُشت مبارک پر چڑھ جاتا۔ آپ سب کو سینہ سے لگاتے اور خوب پیار کرتے۔

○ حضورؐ اپنے چچا زاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب شہید مُوتہ کے فرزند حضرت عبد اللہؓ سے بھی بہت پیار کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں قثم بن عباسؓ اور عبید اللہ بن عباسؓ کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ رسول اللہؐ سواری پر وہاں پہنچے اور بڑی عمر کے کچھ لوگوں سے فرمایا ذرا اسے اوپر مجھ تک اٹھاؤ۔ جب مجھے اوپر اٹھایا گیا تو آپؐ نے مجھے سواری پر آگے بٹھا لیا، پھر فرمایا، ذرا قثم کو بھی اٹھاؤ۔ وہ اٹھائے گئے تو انہیں پیچھے بٹھا لیا۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ (صحیح بخاری)

قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

(صلۂ رحمی)

قرآن پاک میں جہاں والدین کی خدمت اور اُن کے ساتھ حُسنِ سُلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے وہیں "وَبِذِی الْقُرْبٰی" فرما کر دوسرے اہلِ قرابت کے ساتھ حسنِ سُلوک اور اُن کے حقوقِ قرابت کی ادائیگی کا بھی حکم دیا گیا ہے[له]۔ اسی کا نام صِلۂ رحمی ہے جو اسلامی تعلیمات کا ایک خاص عنوان ہے اور جس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ انسانوں کی باہمی قرابت اور رشتہ داری کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کے اسمِ پاک رحمٰن اور اس کی صفتِ رحمت سے خاص نسبت ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے، اسی لیے اس کا عنوان رحم مقرر کیا گیا ہے۔ سُنَنِ ابی داؤد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اللہ ہوں، میں الرحمٰن ہوں میں نے رشتۂ قرابت کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمٰن کے مادہ سے نکال کر اس کو رحم کا نام دیا ہے۔ پس جو اسے جوڑے گا میں اُس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑوں گا۔ اس حدیث مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

له وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی (النساء: ۳۶) اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں سے نیکی کرتے رہو۔

اپنی حکمت اور مشیت سے انسان کی پیدائش کا ایسا نظام بنایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسان رشتوں کے بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے۔ ان رشتوں کے کچھ فطری تقاضے اور حقوق ہیں جن کا عنوان اللہ تعالیٰ نے رَحم مقرر کیا ہے۔ رَحم اور رحمٰن کا مادّہ ایک ہی ہے پس جو بندہ انسان کی فطرت میں رکھے ہوئے اور اللہ کے مقرّر کیے ہوئے حقوق کو ادا کرے گا یعنی صلۂ رحمی کرے گا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ اُس کو جوڑے گا یعنی اس کو اپنا بنالے گا اور اس پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل کرے گا اس کے برعکس جو اس کو توڑے گا یعنی قطع رحمی کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کو اپنی رحمت اور فضل سے محروم کر دے گا۔ صلۂ رحمی کے عوض جن رحمتوں اور برکتوں کا وعدہ کیا گیا ہے ان میں رزق میں فراخی اور عمر میں اضافہ بھی شامل ہے جیساکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ اس حدیث میں حضرت انسؓ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی روزی میں فراخی اور کشادگی ہو اور اس کی عمر میں زیادتی ہو تو اُس کو چاہیئے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرے۔ اگر ہم صلۂ رحمی کی نوعیت پر غور کریں تو اس کی دو ہی صورتیں نظر آئیں گی ایک یہ کہ ہم اپنی کمائی سے غریب اور حاجت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کریں اور دوسری یہ کہ اپنے وقت اور زندگی کا کچھ حصہ اُن کے کاموں میں لگائیں۔

اسبابی نقطۂ نظر سے یہ عام مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ خاندانی جھگڑے اور تنازعے بالعموم حقوقِ قرابت کا پاس نہ رکھنے کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ آدمی کے لیے ذہنی پریشانی اور اندرونی کُڑھن اور گھٹن کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے تفکرات لامحالہ صحت اور کاروبار ہر چیز کو متاثر کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اہلِ قرابت سے نیکی اور صلۂ رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں اُن کی زندگی

رُوحانی آسودگی، طمانیت اور خوش دلی کے ساتھ گزرتی ہے اور ہر لحاظ سے اُن کے حالات بہتر رہتے ہیں۔ پھر اہلِ قرابت کی مدد کرنے میں دوہرا ثواب ہے جیسا کہ جامع ترمذی کی ایک حدیث میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسکینوں کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور اہلِ قرابت کو دینے میں دوہرا ثواب ہے، ایک صدقہ کا اور دوسرا صلۂ رحمی کا۔

بعض دفعہ کوئی شخص رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کو اس بات سے مشروط کر دیتا ہے کہ انہوں نے بھی اس کے ساتھ کوئی نیکی کی ہو یا بھلائی سے پیش آئے ہوں۔ یہ طرزِ عمل درست نہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو شخص رشتہ داروں کے احسان کا بدلہ چکاتا ہے وہ صلۂ رحمی کرنے والا نہیں بلکہ کامل صلۂ رحم کرنے والا وہ ہے کہ جب اس سے صلۂ رحمی نہ کی جائے تو وہ برابر صلۂ رحمی کرتا رہے۔

خانگی زندگی میں بعض اوقات ایسا پیش آتا ہے کہ ایک شخص رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرتا ہے مگر وہ اس کے جواب میں اُس کے ساتھ بدسُلوکی کرتے ہیں اور اُس سے حَسَد کرتے ہیں ایسی حالت میں دل برداشتہ ہو کر اپنا طرزِ عمل ترک نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دوسرے فریق کا رویہ خود اس کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار ہیں میں ان سے ملاپ یعنی حُسنِ سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں میں اُن سے نیکی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ میں ان سے بُردباری اور درگزر کا معاملہ کرتا ہوں اور وہ مجھ سے جہالت سے پیش آتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، اگر ایسا ہی ہے

جیسا تو کہتا ہے تو گویا تو ان کے منہ پر جلتی راکھ (یعنی گرم بھوبھل) ڈالتا ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مدد تیرے شامل حال رہے گی جو تجھ کو اُن پر غالب رکھے گی جب تک کہ تو اُس عادت پر قائم رہے گا۔

حضرت ابو اسید الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس بیٹھے تھے کہ بنو سلمہ کا ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کو میرے لیے کچھ باقی ہے کہ میں ان کے مرنے کے بعد کر سکوں ـــــ آپؐ نے فرمایا، ہاں ان کے لیے دعا کرنا، استغفار کرنا، ان کے رشتہ داروں سے نیک سلوک کرنا (صلۂ رحمی کرنا) کہ یہ رشتہ داری انہی کی وجہ سے ہے اور ان کے دوستوں کی عزت کرنا۔ (ابوداؤد۔ کتاب الادب)

صلۂ رحمی کی ضد قطع رحمی ہے یعنی رشتہ داروں سے بُرا سلوک کرنا یا اُن سے تعلقات منقطع کر لینا۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ انسان کی آخرت برباد کر دیتا ہے۔ صحیحین میں حضرت جُبَیر بن مُطعِم رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والا جنّت میں نہ جا سکے گا۔

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اُس قوم پر رحمت نہیں اترتی جس میں قطع رحمی کا چلن ہو۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشادات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صلۂ رحمی کی کتنی اہمیت ہے اور قطع رحمی کس درجہ کا گناہ ہے۔

فی الحقیقت "صلۂ رحمی" اخلاقِ حَسَنہ ہی کی ایک شاخ ہے اور رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شان یہ تھی کہ آپؐ تمام مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ اس لیے منجملہ دوسرے تمام مکارمِ اخلاق

کے صلۂ رحمی کا وصف بھی آپؐ میں بدرجۂ کمال موجود تھا۔ اس سلسلے میں حضورؐ نے جو نمونہ اُمت کے سامنے رکھا اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

○ بعثت کے وقت جب آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر پہلی وحی نازل ہوئی تو جلالِ الٰہی سے آپؐ کا قلبِ اطہر زور زور سے دھڑکنے لگا اور جسدِ اقدس پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ (مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ) چنانچہ آپؐ کو کمبل یا چادر سے اڑھا دیا گیا۔ جب طبیعت میں ذرا سکون ہوا تو اہلیہ سے فرمایا، اے خدیجہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ پھر ان کو نزولِ وحی کا سارا قصہ سنا کر فرمایا، مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ (بقول شارحینِ حدیث آپؐ کا اشارہ مشکلاتِ نبوت کی طرف تھا یعنی فرائضِ نبوت ادا کرتے ہوئے میری جان نہ چلی جائے۔)

حضرت خدیجہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا:

"نہیں، اللہ کی قسم اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا (بروایتِ دیگر اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی رنج میں مبتلا نہ کرے گا۔) آپؐ رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں، نیک کاموں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔"

(صحیح بخاری۔ صحیح مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بعثت سے پہلے بھی اخلاقِ حسنہ کے نہایت اعلیٰ درجے پر فائز تھے اور "صلۂ رحمی" کا وصف آپؐ کی فطرتِ پاک میں ودیعت کیا گیا تھا۔

○ ہجرتِ نبویؐ سے پہلے کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ مکہ اور اس کے نواح میں قحط پڑ گیا۔ آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو خیال آیا کہ آپ کے چچا ابوطالب

کثیر العیال آدمی ہیں اور ان کی مالی حالت کمزور ہے۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ آپؐ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس تشریف لے گئے جو مالدار آدمی تھے۔ آپؐ نے ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جناب ابو طالب کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے ایک بیٹے کو وہ اپنی کفالت میں لے لیں اور ایک کے آپؐ کفیل بن جائیں گے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو اور حضورؐ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو اپنی کفالت میں لے لیا۔

بعض اہلِ سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر اس وقت چار پانچ سال کی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی!

○ ایک دفعہ مکہ میں سخت قحط پڑا۔ لوگوں نے ہڈیاں اور مردار بھی کھانے شروع کر دیئے۔ ابوسفیانؓ جو اس زمانے میں مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے، آپؐ کی خدمت میں آئے اور کہا:

"محمدؐ! تم لوگوں کو صلۂ رحمی کی تعلیم دیتے ہو، تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے اپنے خدا سے دعا کیوں نہیں کرتے؟"

گو مشرکینِ قریش کی ایذا رسانی اور شرارتیں انسانیت کی حدود کو بھی پھلانگ گئی تھیں لیکن ابوسفیانؓ کی بات سن کر آپؐ کے دستِ مبارک فوراً دعا کے لیے اٹھ گئے۔ اپنے محبوبؐ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس قدر مینہ برسایا کہ جل تھل ایک ہو گئے اور قحط دور ہو گیا۔

(صحیح بخاری، تفسیر سورۂ دخان)

حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں قحط کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت عمروؓ بن اُمیہ ضمری کے ذریعے حضرت ابوسفیانؓ کو کئی اشیاء ہدیۃً بھیجیں۔ (الاستیعاب)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قحط اور تنگی کا حال سنا تو کئی سو دینار حضرت ابوسفیانؓ کو بھجوائے کہ انہیں مکہ کے اہلِ حاجت میں تقسیم کر دیا جائے۔

ابوسفیانؓ نے یہ رقم لے لی لیکن ہنس کر کہا:

"اچھا اب محمدؐ کیا ہمارے جوانوں کو خریدنا چاہتے ہیں۔"

یہ تینوں روایتیں فتح مکہ سے قبل کے زمانے سے متعلق ہیں اس وقت نہ حضرت ابوسفیانؓ نے اسلام قبول کیا تھا اور نہ دوسرے اہلِ مکہ نے۔ آپؐ نے جو کچھ کیا اس کے پیچھے صلۂ رحمی کا جذبہ کارفرما تھا۔ یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ تمام قریشِ مکہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نزدیک یا دور کی قرابت داری تھی۔

○ یمامہ کے رئیس ثمامہؓ بن اُثال نے اسلام قبول کیا تو قریش کو اسلام دشمنی کی سزا دینے کے لیے مکہ کو غلہ کی ترسیل بند کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ میں قحط پڑ گیا اور مشرکینِ قریش کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں ایک وفد مدینے بھیجا کہ مکہ کے لوگ اناج کے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔ آپؐ یہ بندش اٹھوا دیں۔ اہلِ مکہ نے آپؐ کو ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن اس موقع پر آپؐ کا دریائے رحمت جوش میں آ گیا اور آپؐ نے ثمامہؓ کو پیغام بھیجا کہ اب ان لوگوں پر رحم کرو اور انہیں غلہ بھیجا کرو۔ ثمامہؓ نے حضورؐ کے حکم کی تعمیل کی اور حسبِ سابق مکہ کو غلہ بھیجنے لگے۔ (سیرۃ ابن ہشام)

○ حضرت اسماءؓ بنتِ ابی بکر صدیقؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہرِ نسبتی (سالی) تھیں۔ ان کی والدہ قُتیلہ بنتِ عبدالعزّٰی شرفِ اسلام سے بہرہ ور نہ ہوئیں اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں ہجرت سے پہلے طلاق دے دی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک

دفعہ قتیلہ مدینہ منوّرہ آئیں اور حضرت اسماءؓ سے کچھ روپے مانگے۔ ان کے شرک کی وجہ سے حضرت اسماءؓ ان کا سوال پورا کرنے میں متامل ہوئیں اور حضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنی مشرک والدہ کی مالی مدد کرسکتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں کرسکتی ہو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اصلۂ رحمی سے نہیں روکتا۔ مسندِ احمد اور طبقات ابنِ سعد میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قتیلہ کچھ تحفے لے کر حضرت اسماءؓ سے ملنے آئیں حضرت اسماءؓ کی دینی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اپنی مشرک ماں کے تحائف قبول کریں یا ان کو اپنے پاس ٹھہرائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بہن اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ذریعے آنحضورؐ سے پوچھ بھیجا کہ اس معاملے میں میرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ آپؐ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ان کے تحائف قبول کرلو اور ان کو اپنے گھر میں مہمان رکھو۔

○ حضرت نوفلؓ بن حارث بن عبدالمطّلب آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کی معاشی حالت کمزور تھی اس لیے آپؐ وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کو نکاح کی خواہش ہوئی تو آپؐ نے ایک خاتون سے ان کی شادی کرا دی۔ ایک دفعہ ان پر تنگدستی اتنی غالب ہوئی کہ گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہ رہی۔ حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت ابو رافع اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ذریعے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھوائی اور اس کے عوض تیس صاع جَو لے کر حضرت نوفلؓ کو عطا کیے۔

(مستدرک حاکم)

○ حضرت عبیدہ بن حارث مُطّلِبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضورؐ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ غزوۂ بدر میں وہ شدید زخمی ہو گئے۔ اُن کو اٹھا کر

حضورؐ کی خدمت میں لے گئے۔ آپؐ کو ان کی حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ انہیں تسلّی دی اور اپنا سرِ اقدس اظہارِ شفقت کے طور پر ان کے زانو پر رکھ دیا۔ انہوں نے عرض کیا :

"یا رسول اللہ! کیا مجھے مرگِ شہادت نصیب ہوگی۔"

آپؐ نے فرمایا :

"بے شک تم شہید ہو اور نیکوکاروں کے پیشوا ہو۔"

آپؐ کا ارشاد سُن کر حضرت عبیدہؓ خوش ہو گئے۔

لشکرِ اسلام بدر سے واپس مدینہ منوّرہ کی طرف روانہ ہوا تو وادیٔ صفراء میں پہنچ کر حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے پیکِ اجل کو لبّیک کہا۔ حضورؐ نے ان کو اپنے پیراہن مبارک میں کفنا کر سپردِ خاک کیا اور فرمایا کہ ان کو سعادت مل گئی۔ اس کے بعد مدتوں تک وادیٔ صفرا میں مُشک کی خوشبو بسی رہی۔ جو کوئی اِدھر سے گزرتا مسحور کُن خوشبو کی لپٹوں سے اس کے دل و دماغ معطر ہو جاتے۔

(طبقات ابنِ سعد، الاصابہ)

○ آنحضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی چھ پھوپھیاں تھیں۔ حضرت صفیہؓ، عاتکہ، اروی، اُمِّ حکیم، برّہ، امیمہ۔ ان میں سے حضرت صفیہؓ کے اسلام اور شرفِ صحابیت پر سب کا اتفاق ہے۔ دوسری پھوپھیوں کے اسلام کے بارے میں اختلاف ہے۔ ان میں سے جو آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں موجود تھیں، آپؐ ان کے ساتھ ہمیشہ حُسنِ سلوک سے پیش آتے رہے اور ان کی مالی معاونت بھی کرتے رہے۔ (طبقات ابنِ سعد)

○ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ مشرکینِ قریش کے مظالم سے بچنے کے لیے مکہ سے ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے۔ حبش میں وہ کوئی تیرہ برس غریب الوطنی کی زندگی

گزارنے کے بعد ۷ سنہ ہجری کے آغاز میں مدینہ منورہ واپس آئے۔ اس وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت جعفرؓ اور ان کے ساتھ حبش سے واپس آنے والے دوسرے صحابہ مدینہ منورہ سے سیدھے خیبر پہنچے۔ اس وقت خیبر فتح ہو چکا تھا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ حضرت جعفرؓ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ انہیں گلے لگا کر ان کی پیشانی چومی اور فرمایا:

"میں نہیں جانتا کہ مجھ کو خیبر کی فتح سے زیادہ خوشی ہوئی یا جعفر کے آنے سے۔"

اس کے بعد آپؐ نے دوسرے تمام اصحاب سے بھی معانقہ فرمایا اور سب کو اہلاً وسہلاً و مرحبا کہا۔ اگلے سال (۸ سنہ ہجری میں) حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگِ موتہ میں شہادت پائی تو حضورؐ کو سخت صدمہ پہنچا اور آپؐ نے فرمایا:

اِخْوَانِیْ وَ مُوْنِسَانِیْ وَ مُحَدِّثَانِیْ

(یہ میرے بھائی، میرے مونس اور میرے جلیس تھے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت حضرت جعفرؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت کی خبر اہلِ مدینہ کو سنائی تو آپؐ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ (اُسدُ الغابہ)

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ حضرت اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں آٹا گوندھ چکی تھی اور بچوں کو نہلا دھلا کر کپڑے پہنا رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور فرمایا، جعفر کے بچوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ آپؐ نے آبدیدہ ہو کر ان کو پیار کیا، میں نے عرض کیا، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں کیا جعفر کے بارے میں کوئی خبر آئی

ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں وہ شہید ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر میں زار زار رونے لگی۔ رونے دھونے کی آواز سُن کر میرے ارد گرد بہت سی خواتین جمع ہو گئیں۔ آنحضورؐ واپس تشریف لے گئے اور ازواجِ مطہرات سے فرمایا کہ آلِ جعفر کا خیال رکھنا آج وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ (مستدرک حاکم)

سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کی خبر سُنی تو وہ واہ عماہ عماہ کہہ کر روتی ہوئی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے ان سے فرمایا، بیٹی جعفر کے بچوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ آج اسماء رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ (طبقات ابنِ سعد)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ تین دن تک حضرت جعفرؓ کے بچوں کو کھانا کھلاتے رہے۔ حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضورؐ ان کے بچوں پر غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ ایک دن ان کے فرزند عبد اللہؓ کا ہاتھ پکڑ کر دعا کی، الٰہی اس کو جعفر کا صحیح جانشین بنا، اس کی بیعت میں برکت دے اور میں دنیا اور آخرت میں آلِ جعفر کا ولی ہوں۔ (الاصابہ۔ مستدرک حاکم)

○ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن حضرت جمانہؓ بنتِ ابی طالب کی مالی حالت کمزور تھی۔ حضورؐ نے خیبر کی پیداوار سے ان کے لیے تیس وسق خرما مقرر فرما دیئے۔ (ایک وسق تقریباً ساڑھے تین من کے برابر ہوتا تھا)۔ (طبقات ابن سعد)

○ فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّ ہانیؓ بنتِ ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں نماز پڑھی۔ اُمِّ ہانیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ابنِ ہبیرہ کو پناہ دی ہے لیکن علی اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

"جس کو تم نے پناہ دی میں نے بھی اس کو پناہ دی" یہ بخاری کی روایت ہے۔ مُسندِ احمد میں ہے کہ اُمِّ ہانیؓ نے حارث بن ہشام مخزومی اور زہیر بن ابی امیہ مخزومی کو پناہ دی تھی۔ اُمِّ ہانیؓ کی سفارش پر حضورؐ نے بھی ان کو پناہ دے دی اور حضرت علیؓ کو ان کے قتل سے منع کر دیا۔ اس پر وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔

ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سُلوک

دین اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مکمل اور جامع نظامِ حیات ہے جس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے نظام میں نہیں ملتی۔ اسلام میں انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو اور ہر ہر رُخ کے لیے اَبدی ہدایات و احکام موجود ہیں، اور یہ اپنے انقلاب آفریں معاشرتی نظام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر بہت زور دیتا ہے۔ حقوق العباد کا ایک خاص الخاص پہلو ہمسایوں سے حُسنِ معاملہ ہے۔ انسان کا اپنے والدین، اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے علاوہ ایک مستقل واسطہ اور تعلق ہمسایوں اور پڑوسیوں سے بھی ہوتا ہے اور اس کی خوشگواری اور ناخوشگواری کا زندگی کے سُکھ چین اور اخلاق کے بناؤ بگاڑ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ رحمتِ عالم ہادیٔ برحق صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی تعلیم و ہدایت میں ہمسائیگی اور پڑوس کے اس تعلق کو بڑی عظمت بخشی ہے اور اس کے احترام و رعایت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اس کو جزوِ ایمان اور داخلۂ جنّت کی شرط اور اللہ و رسول کی محبت کا معیار قرار دیا ہے۔ حضرت مُعاویہ بن حَیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں خیر الخلائق صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ہمسایوں کے حقوق اس طرح متعیّن فرمائے ہیں —— پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کرو، اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ، اور اگر وہ قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اس کو قرض دو۔ اگر وہ کوئی بُرا کام کر بیٹھے تو اس کی پردہ پوشی کرو اور اگر اُسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو، اس کو کوئی مصیبت

پہنچے تو تعزیت کرو اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اُس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے اور تمہاری ہانڈی کی مہک پڑوسی کے لیے باعثِ ایذا نہ ہو اِلّا یہ کہ اُس میں سے تھوڑا سا کچھ اس کے گھر بھیج دو۔ (طبرانی)

قریب قریب اسی مضمون کی حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے اور اُس میں یہ اضافہ ہے کہ ــــ اگر تم کوئی پھل خرید کر لاؤ تو اس میں سے پڑوسی کے ہاں بھی ہدیہ بھیجو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اس کو چھپا کر لاؤ اور تمہارا کوئی بچہ وہ پھل لے کر گھر سے باہر نہ نکلے تاکہ پڑوسی کے بچے کے دل میں اسے دیکھ کر جلن پیدا نہ ہو۔

دانائے کونین صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ان ہدایات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان پر عمل کرنے سے جہاں ہمسایوں سے خوشگوار تعلّقات قائم ہوں گے وہاں اللہ اور رسول کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی۔ ہمسایوں کو ایذا پہنچانے یا ان کے ساتھ کوئی شرارت کرنے کو آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جس قدر گھناؤنا فعل قرار دیا ہے، اس کا اندازہ صحیحین کی اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک دن ارشاد فرمایا، خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں ــــ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! کون شخص؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور مفسدہ پردازیوں سے مامون اور بے خوف نہ ہوں۔"

اس حدیث کی رُو سے ہر صاحبِ ایمان پر لازم ہے کہ ہمسایوں سے اس کا برتاؤ اور رویّہ ایسا شریفانہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے خوف رہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ وہ آدمی جنّت

میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اس کے ہمسایے مامون نہ ہوں۔ ان دو حدیثوں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت میں ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ سُلوک کا کیا درجہ اور مقام ہے، لِسانِ رسالت میں کسی عمل کی سخت تاکید اور دین میں اُس کی اہمیت جتانے کے لیے آخری تعبیر یہی ہوتی ہے کہ اس میں کوتاہی کرنے والا مومن نہیں یا یہ کہ وہ جنّت میں داخل نہ ہو سکے گا۔ گویا ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ معاملہ کی فکر نہ کرنا شقاوت اور بدبختی کی نشانی ہے۔ ہمسایوں کے ساتھ حُسنِ معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا ذکر مُسندِ بزّار میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جائے کہ اس کے برابر رہنے والا پڑوسی بھُوکا ہو اور اس آدمی کو اُس کے بھوکے رہنے کی خبر ہو۔ گویا ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی پر یہ حق بھی ہے کہ وہ اس کے بھوک پیاس کے مسئلوں اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں سے بھی بے فکر اور بے نیاز نہ ہو۔

ایک اور حدیث میں پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ معاملہ کو اللہ اور رسولؐ کی محبّت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ تعالیٰ عنہ، روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہؓ آپؐ کے وُضو کا پانی لے لے کر اپنے جسم پر ملنے لگے۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ تمہارے لیے اس کا کیا باعث اور مُحرّک ہے۔ انہوں نے عرض کیا، بس اللہ اور رسول کی محبّت۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، جس کی یہ خوشی اور خواہش ہو کہ اس کو اللہ اور رسول سے محبّت کرنا نصیب ہو یا یہ کہ اس سے اللہ اور رسول محبّت کریں تو اسے چاہیے کہ وہ ان تین باتوں کا اہتمام کرے، بات کرے تو سچ بولے، جب کوئی امانت اس کے

سپرد کی جائے تو امانت داری کے ساتھ اس کو ادا کرے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا رویّہ رکھے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو شُریح عَدَوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اکرام کا مُعاملہ کرے۔

صحیحین ہی کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جبرئیل پڑوسی کے حق میں مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے۔

ہمسایوں کے حُسنِ معاملہ میں یہ بات ہی شامل نہیں ہے کہ ان کی مادّی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے اور ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے جائیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا خیال بھی رکھا جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "کتاب الوحدان" میں حضرت اَبزیٰ خزاعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین سکھانے اور اُن میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے نہ اُن کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں نہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں اور کیا ہو گیا ہے اُن بے علم اور پسماندہ لوگوں کو کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھنے اور دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے کی فکر نہیں کرتے اور نہ ان سے نصیحت لیتے ہیں۔

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پڑوسی کی رائے کو کسی کے اچھا یا بُرا ہونے کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر تیرے پڑوسی تجھے بُرا کہتے ہیں

تو واقعی تو بُرا آدمی ہے۔ (سُنَنِ ابنِ ماجہ)

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مسلمانوں کو یہ تلقین بھی فرمائی ہے کہ اگر ہمسایہ زیادتی کرے یعنی بُرا سلوک کرے تو جہاں تک ہو سکے صبر کیا جائے۔ اس پر بھی وہ اپنا رویّہ نہ بدلے تو مقامی طور پر ایسے طریقے سے احتجاج کیا جائے کہ دوسرے اہلِ محلہ اس کو اپنا رویّہ تبدیل کرنے پر مجبور کریں اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو مکان بدل کر اچھی ہمسائیگی کے مقام پر سکونت اختیار کر لی جائے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر شکایت کی، یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا، جاؤ صبر کرو۔

وہ چلے گئے اور صبر سے کام لیتے رہے لیکن ہمسایہ انہیں ستانے سے باز نہ آیا۔ انہوں نے پھر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہو کر پڑوسی کی شکایت کی۔ آپؐ نے ان کو پھر صبر کرنے کی تلقین فرمائی۔ جب وہ تیسری مرتبہ بھی شکایت لے کر آئے تو آپؐ نے فرمایا:

"جاؤ اور اپنے گھر کا سامان اٹھا کر راستے میں ڈال دو۔"

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آنے جانے والوں نے پوچھا، کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ہمسایے کی بدسلوکی کا سارا قصہ بیان کیا۔ اس پر سب نے ان کے پڑوسی کو بُرا بھلا کہا۔ وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ انہیں منا کر واپس گھر لے آیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ان کو کبھی تنگ نہیں کرے گا۔

(ادب المفرد، بخاری۔ ابوداؤد)

رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صرف مسلم پڑوسی ہی کے ساتھ حسنِ معاملہ کی تاکید نہیں فرمائی بلکہ غیر مسلم ہمسائے کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔

مُسندِ بزّار میں حضرت جابر رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

"پڑوسی تین قسم کے اور تین درجے کے ہوتے ہیں، ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک ہی حق ہو کم درجہ کا پڑوسی ہے۔ دوسرا وہ جس کے دو حق ہوں اور تیسرا وہ جس کے تین حق ہوں۔ تو ایک حق والا وہ مشرک پڑوسی ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہ ہو، دو حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلم بھی ہو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے اور دوسرا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اور تین حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلم بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو، اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا ہوگا اور دوسرا حق پڑوسی ہونے کا اور تیسرا حق رشتہ داری کا ہوگا۔"

آج کل دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑوسیوں کے باہمی تعلقات اکثر خراب رہتے ہیں اور ان کی باہمی رنجش بات بات پر جھگڑوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اس طرح فریقین کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً

(۱) بچوں کے جھگڑوں میں ایک پڑوسی ہمیشہ دوسرے پڑوسی کے بچوں کو قصور وار ٹھہرائے۔
(۲) نادار پڑوسی مالدار پڑوسی سے حسد کرے۔
(۳) مالدار پڑوسی نادار پڑوسی کو حقارت سے دیکھے اور اس سے نفرت کرے۔
(۴) ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے دکھ درد میں شریک نہ ہو اور اس کے معاملات سے بالکل لاتعلق رہے۔
(۵) ایک پڑوسی دوسرے کے بارے میں خواہ مخواہ بدگمانی کرے۔
(۶) ایک پڑوسی مذہب اور عقیدے کے اختلاف کی وجہ سے دوسرے پڑوسی سے نفرت کرے۔
(۷) ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی سے بار بار قرض مانگے یا دوسری ضرورت کی

چیزیں ہر وقت مانگتا رہے ۔

(۸) قرض یا دوسری چیزیں لے کر واپس نہ کرے یا عاریتاً لی ہوئی چیزوں کو خراب کر کے واپس کرے ۔

(۹) ریڈیو، ٹیلی ویژن یا ٹیپ ریکارڈر کو استعمال کرتے وقت ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے آرام اور سکون کا خیال نہ رکھے ۔

(۱۰) مشترکہ گلی کوچوں میں گندگی پھیلائی جائے اور ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے گھر کے قریب یا سامنے کوڑا کرکٹ پھینکے ۔

(۱۱) چھت پر چڑھتے وقت ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کی بے پردگی کا خیال نہ رکھے ، وغیرہ ۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو محسوس ہو گا کہ پڑوسی سے رنجش کی بنیاد جہاں رواداری، برداشت اور حوصلے کی کمی ہوتی ہے وہاں اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنا بھی ہے جو پڑوسیوں سے برتاؤ کے سلسلے میں اسلام ہم پر ڈالتا ہے ۔ اگر دوسروں کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھا جائے اور جس طرح اپنے بچوں سے پیار کیا جاتا ہے ان سے بھی کیا جائے ، پڑوسی کی خوش حالی سے حسد کرنے کی بجائے خود اپنے حالات سدھارنے کی کوشش کی جائے ، نادار پڑوسی سے نفرت کرنے کی بجائے اس سے شفقت اور محبّت کا برتاؤ کیا جائے ، اگر پھل اسے تحفہ میں نہیں دے سکتے تو ان کے چھلکے باہر پھینک کر ان کی دل شکنی نہ کی جائے ۔ پڑوسی کے دکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھا جائے ، کسی معاملے میں پڑوسی سے بدگمان ہونے کی بجائے اس سے مل کر نرمی کے ساتھ گفتگو کر لی جائے ۔ مذہب اور عقیدے کو اپنی جگہ رکھا جائے اور اس کو میل جول میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے ، پڑوسی سے شدید ضرورت کے سوا قرض نہ مانگا جائے اور نہ وقت بے وقت چیزیں مانگ مانگ کر اسے تنگ کیا جائے ۔ قرض لے کر اسے جلد از جلد یا وعدہ کے مطابق واپس کرنے کی کوشش کی

جائے اور مانگی ہوئی چیزیں بھی ضرورت پوری کرنے کے بعد صحیح سالم فوراً واپس کی جائیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ دوسروں کے آرام اور سکون میں خلل نہ پڑے۔ چھت پر چڑھنے سے پہلے پڑوسیوں کو آگاہ کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار نہ رہیں۔

قرآن حکیم میں تو مستقل ہمسایوں (خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی) کے علاوہ اُن لوگوں سے بھی نیک برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن سے کبھی عارضی ہمسائیگی کا اتفاق ہوگیا ہو مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو یا کسی دکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا یا کھڑا ہو یا دورانِ سفر میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو تو یہ آپ کا عارضی ہمسایہ ہے جسے "سورۃ النسآء" میں "صاحب بالجنب" یعنی پہلو کا ساتھی فرمایا گیا ہے اور اس کو احسان اور حسنِ سلوک کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے۔ (آیت ۳۶) خلاصۂ کلام یہ کہ اچھا پڑوسی اللہ کی رحمت ہوتا ہے اور بُرا پڑوسی اللہ کا عذاب۔

اگر پڑوسیوں کے آپس کے تعلقات خوشگوار ہوں تو وہ لڑائی جھگڑوں سے محفوظ رہتے ہیں اور زندگی نہایت آرام اور سہولت سے گزرتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے اللہ بھی راضی ہوتا ہے اور ہم دنیا اور دین دونوں میں سُرخرو ہو سکتے ہیں۔

شجاعت نبوی

صلی اللہ علیہ وسلم

شجاعت کے لغوی معنی بہادری اور دلیری کے ہیں۔ ایسی بہادری اور دلیری کے جو عقل اور صحیح رائے کے تابع ہو۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کا نام شجاعت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (اپنے کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو) فرما کر ایسی بے جا جسارت یا تہور کی ممانعت کی ہے۔

علامہ قاضی عیاض رحؒ نے "کتاب الشفاء" میں شجاعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"اَلشَّجَاعَةُ فَضِيلَةُ قُوَّةِ الْغَضَبِ وَانْقِيَادُهَا لِلْعَقْلِ"

(یعنی قوتِ غضبی کی زیادتی اور اس کے تابع عقل ہونے کو شجاعت کہتے ہیں)

دوسرے الفاظ میں قوتِ غضبی کی شدت میں دل و دماغ کو قابو میں رکھنا اور کسی اعلیٰ مقصد کے لیے مصائب و آلام یا خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جان کی بازی تک لگا دینا شجاعت ہے اور یہ ایک ایسا وصف ہے جو کسی انسان کے کردار کی تشکیل میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی رحؒ نے سیرۃ النبیؐ میں صحیح لکھا ہے کہ

"یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر ہے اور اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے۔ عزم و استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، پُردلی یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔"

گویا ایک اعلیٰ کردار کے انسان میں شجاعت کا ہونا لابدی ہے حضرات

انبیاء علیہم السلام کے مکارمِ اخلاق اور محاسنِ افعال جس طرح دوسرے انسانوں سے ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں، اسی طرح وہ جسمانی عیوب سے بھی پاک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی اندھے، کانے، گونگے، لنجے، بہرے، مراقی، دیوانے اور کریہ المنظر کو نبی بنا کر مبعوث نہیں فرمایا اور نہ کسی مصلحت کیش بزدل اور نامرد کو نبی بنایا۔ تمام انبیاء علیہم السلام اپنے دور کے شجاع ترین انسان تھے۔ سرورِ کونین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین تھے۔ نبوت اور رسالت آپؐ پر ختم کر دی گئی۔ اس لیے حق سبحانہٗ نے حضورؐ کو حسنِ صورت و سیرت، مکارمِ اخلاق اور محاسنِ اوصاف و افعال کا نمونۂ اتم بنایا۔ آپؐ میں ہر وہ کمال اور وصف موجود تھا جو ایک انسانِ کامل میں ہونا چاہیے۔ اسی لیے فرمایا گیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)

یعنی (اے اہلِ ایمان) بلاشبہ تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین زندگی (طریقہ) موجود ہے۔

فی الحقیقت حضورؐ کی ذاتِ گرامی ہر لحاظ سے عدیم النظیر تھی۔ علامہ شیخ بوصیریؒ (المتوفیٰ ۶۹۶ ہجری) نے کیا خوب فرمایا ہے:

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيكٍ فِي مَحَاسِنِهِ ... فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ

جوہرِ فرد آپ کی خوبی ہے جب ... قابلِ تقسیم ہو سکتی ہے کب

ہیں منزہ غیر کی شرکت سے آپ ... خاص ہیں اللہ کی رحمت سے آپ

(عبدالوہاب عندلیب)

شجاعت چونکہ انسانیت کا اعلیٰ جوہر ہے اس لیے لازم تھا کہ منجملہ دیگر اوصاف و کمالات کے اسے بھی آپؐ کی ذاتِ اقدس میں بدرجۂ کمال ودیعت کیا جاتا۔ چنانچہ اپنوں اور بیگانوں سبھی نے برملا اعتراف کیا ہے کہ شجاعت میں کوئی شخص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل نہ تھا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شجاعت کے بارے میں کتب حدیث و سیر میں بیسیوں روایات اور راویوں کے عینی مشاہدات موجود ہیں، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں:

○ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چوتھے سال جب یہ آیت نازل ہوئی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو علانیہ بیان کریں اور مشرکوں کی طرف سے منہ پھیر لیں)

تو حضورؐ نے نہایت سرگرمی سے دعوتِ حق کا آغاز کر دیا اور شرک و جہل اور معبودانِ باطل کی علانیہ مذمت فرمانے لگے۔ اس پر مشرکین قریش غیظ و غضب سے دیوانے ہو گئے۔ کوئی ایسی ایذاء اور تکلیف نہیں تھی جو انہوں نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہنچائی۔ ان مصائب میں حضورؐ کے صحابہؓ کا بھی حصہ تھا۔ مشرکین نے حضورؐ اور آپؐ کے جان نثار ساتھیوں پر ایسے ایسے روح فرسا اور شرمناک مظالم ڈھائے کہ ان کا تصور کر کے بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، لیکن اللہ رے شجاعت و ہمت کہ شدائد و آلام کے اس بحرِ متلاطم میں آمنہ کے لالؐ عزم و استقامت کا پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی جنبش آئے۔

صحیح بخاری میں حضرت خبابؓ بن الارتؓ سے روایت ہے کہ (مصائب و شدائد کے اس دور میں) ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنی ردائے مبارک سرِ اقدس کے نیچے رکھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ ہماری مدد کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپؐ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا فرمایا تم سے پہلے لوگوں کا گوشت لوہے کے نکیلے ہتھیاروں سے نوچ نوچ کر ہڈیوں سے الگ کیا گیا

اس پر بھی وہ دین سے نہیں ہٹے۔ ان کے سروں پر آرے چلائے گئے، چیر کر بیچ میں سے دو کر دیئے گئے پھر بھی وہ دین پر قائم رہے۔ اللہ اس دین کو ضرور کامیاب فرمائے گا اور وہ وقت آئے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک جائے گا اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا"۔؎

یہ تھی شانِ شجاعت حضورؐ کی ایسے وقت میں جب مشرکینِ مکّہ کا بچّہ بچّہ آپؐ کے خون کا پیاسا تھا۔ صَلَّی اللہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَسلّم۔

○ رکانہ عرب کا مشہور پہلوان تھا اور سارے عرب میں اس کی شہ زوری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ امام ابنِ اسحاقؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مکّہ کی ایک گھاٹی میں اس کی حضورؐ سے ملاقات ہو گئی۔ آپؐ نے اس سے فرمایا:

"اے رکانہ! کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتا اور جس بات کی میں دعوت دیتا ہوں اس کو قبول نہیں کرتا؟"

اس نے جواب دیا:

"ذرا مجھ سے زور آزمائی کر کے دیکھو، اگر تم غالب آگئے تو پھر میں جانوں گا کہ تمہارے دعوے میں کتنی صداقت ہے۔"

حضورؐ اس کی شہ زوری سے مطلق خائف نہیں ہوئے اور اللہ کے بھروسے پر فرمایا:

"میں تم سے کشتی لڑنے کو تیار ہوں۔"

چنانچہ کشتی ہوئی اور حضورؐ نے رکانہ کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اس نے کہا، "محمدؐ ایک دفعہ پھر" حضورؐ نے دوسری بار بھی اس کو پچھاڑ دیا لیکن رکانہ کو اس موقعہ پر قبولِ اسلام کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ علامہ حجازیؒ کا بیان ہے کہ رکانہ نے فتح مکّہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔

○ عرب کا ایک مشہور پہلوان ابو الاشد کلدہ بن جمحی تھا۔ اس کی طاقتِ جسمانی کی یہ کیفیت تھی کہ وہ گائے کے چمڑے پر کھڑا ہو جاتا اور دس دس

آدمی مل کر اس کے نیچے سے چمڑا کھینچنے کے لیے زور لگاتے تھے لیکن چمڑا پھٹ جاتا اور ابوالاشد اپنی جگہ سے مطلق جنبش نہ کرتا تھا۔ علامہ سُہیلیؒ نے "روض الانف" میں لکھا ہے کہ اسی ابوالاشد نے ایک دفعہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کہا کہ اگر آپؐ مجھے پچھاڑ دیں تو میں آپؐ پر ایمان لے آؤں گا۔ حضورؐ بلا تامل اس سے کشتی لڑنے پر تیار ہو گئے اور پھر آپؐ نے اس کو کئی بار پچھاڑا لیکن وہ اپنے قول سے پھر گیا اور اسلام قبول کرنے کی سعادت سے محروم رہا۔

○ ایک دفعہ مشرکینِ قریش کا ایک وفد جناب ابوطالب کی خدمت میں گیا اور ان سے کہا:

"اے ابوطالب آپ ہمارے بزرگ ہیں اور ہمارے دلوں میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے لیکن آپ کے بھتیجے سے ہم سخت تنگ آ گئے ہیں۔ اس سے اپنے اسلاف اور معبودوں کی برائیاں سُن سُن کر ہمارے کان پک گئے ہیں۔ اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے اسے آپ روکیں ورنہ ہمارے اور آپ کے درمیان تصادم یقینی ہے جس کے نتیجے میں ایک نہ ایک دن ایک فریق ضرور ہلاک ہو جائے گا۔"

ابن ہشام کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد جناب ابوطالب نے حضورؐ کو بلا بھیجا۔ جب آپؐ تشریف لائے تو جناب ابوطالب نے آپؐ کو مشرکین کے عزائم سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی کہا: "بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میں نہ اٹھا سکوں، کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم ایسی باتیں چھوڑ دو جو قوم کو ناگوار ہیں۔"

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ قوم جان کی دشمن تھی اور شفیق چچا کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی حمایت سے دست کش ہو رہے ہیں، لیکن حضورؐ

کا ردِّ عمل کیا تھا؟ شدّتِ جذبات سے آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا:

"چچا جان! اگر سورج میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر رکھ دیا جائے تو بھی میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے کامیاب فرما دے یا میں اس راہ میں مارا جاؤں۔"

یہ جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقامت اور شجاعت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

تبلیغ حق مسلسل جاری رکھنے پر مشرکین قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن بن گئے تھے لیکن آپؐ نہ کبھی قریش سے ہراساں ہوئے اور نہ کبھی آپؐ کو اپنی جان کے بارے میں تشویش ہوئی۔ آپؐ بے دھڑک حرم شریف میں چلے جاتے اور اطمینان سے بیت اللہ کا طواف کر کے واپس تشریف لاتے۔ ایک دن سرداران قریش حجر اسود کے پاس بیٹھے تھے اور حضورؐ کے خلاف دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے کہ اس شخص نے ہمارے دین کی مذمت کی اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ بتلایا ہے مگر ہم نے آج تک ضبط و تحمل سے کام لیا ہے۔ اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور بیت اللہ کا طواف کرنے لگے۔ جب آپؐ طواف کرتے ہوئے ان کے پاس سے گزرتے تو یہ ناہنجار آپؐ پر آوازے کستے اور فقرے چست کرتے۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ہر مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور پر ملال اور ناگواری کا اثر نمایاں ہوا۔ دو مرتبہ تو آپؐ خاموش رہے مگر تیسری مرتبہ ان کی بدگوئی پر آپؐ رک گئے اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے گروہِ قریش! کان کھول کر سن لو میں تمہارے پاس ذبح کے ساتھ آیا ہوں۔" یعنی اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے

تو ایک دن میرے ہاتھ سے ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس انتباہ سے دریدہ دہنوں پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ گردنیں جھکا کر ایسے چپ ہوئے کہ گویا ہر شخص کے سر پر کوئی پرندہ بیٹھا ہے۔ آپؐ کی خداداد شجاعت، ہیبت اور آپؐ کے اخلاقی رعب نے ان کو بھیگی بلی بنا دیا اور وہ گھگیا کر بولے، ابوالقاسم آپ اطمینان سے جائیں اور اس خیال کو جانے دیں۔ (بروایتِ دیگر واللہ آپ نادان نہیں)

(ابنِ ہشام، طبری، ابن حبان ورواہ البخاری مختصراً)

ابوجہل مشرکینِ قریش میں بہت اونچا مرتبہ اور اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ وہ رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا بدترین دشمن تھا۔ یوں سمجھیے کہ معاندین کا سرخیل تھا لیکن حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ اس کی شرارتوں کی پروا کرتے تھے۔ اربابِ سیر نے کچھ ایسے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں جن میں آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تن تنہا ابوجہل کو اس کی بدکرداری پر ایسا سبق سکھایا کہ وہ تمام اکابرِ قریش کے سامنے نکو بن گیا۔ ان واقعات سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مظلوموں کے حامی اور سرپرست تھے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کس قدر شجاع اور نڈر تھے۔ ایسے تین واقعات یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں:

○ ایک دفعہ اراش کا ایک شخص کچھ اونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابوجہل نے اس کے سارے اونٹ خرید لیے لیکن قیمت نہ دی۔ جب بھی اراشی قیمت مانگتا وہ اس کو ٹال دیتا۔ اراشی نے تنگ آ کر حرم کعبہ میں جا کر قریش کے سرداروں کے پاس فریاد کی کہ ابوالحکم میرے اونٹوں کی قیمت نہیں دیتا۔ اس وقت حرم کے ایک گوشے میں رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش نے ازراہِ شرارت یا کسی اور خیال سے فریادی سے کہا کہ وا

شخص جو کونے میں بیٹھا ہے اس سے جا کر کہو، وہ تمہارے اونٹوں کی قیمت دلوا دے گا۔ اِراشی آپؐ کی طرف چلا تو قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا، آج لطف آئے گا۔ اِراشی نے حضورؐ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے اپنی فریاد دہرائی تو آپؐ اسی وقت اس کو ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف چل پڑے۔ سرداروں نے اپنا ایک آدمی یہ دیکھنے کے لیے پیچھے بھیجا کہ یہ معاملہ کیا صورت اختیار کرتا ہے۔ حضورؐ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ابوجہل کے مکان پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے اندر سے پوچھا، کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا، "محمدؐ"۔ وہ حیران ہو کر باہر نکلا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا،" اس شخص کا حق دے دو۔" وہ فوراً اندر گیا اور اونٹوں کی قیمت لا کر اس شخص کے ہاتھ پر رکھ دی۔ سرداروں کا جاسوس یہ دیکھ کر دوڑتا ہوا حرم شریف میں پہنچا اور کہنے لگا کہ واللہ آج حیرت انگیز معاملہ دیکھا، ابوالحکم (ابوجہل) جب گھر سے باہر نکلا تو محمدؐ (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو دیکھتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا اور جب محمدؐ (صلی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے اس سے کہا کہ اس شخص کا حق دے دو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں جان نہیں ہے۔

(سیرۃ ابنِ ہشام۔ انساب الاشراف)

○ ایک دن ایک نہایت خستہ حال یتیم لڑکا سرورِ دو عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"اے ابنِ عبدالمطّلب میرے باپ کے مرنے کے بعد ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) نے اس کے مال پر قبضہ کر لیا ہے اور اب وہ اس میں سے مجھے کچھ نہیں دیتا یہاں تک کہ بدن ڈھانپنے کے لیے میں کپڑوں کا بھی محتاج ہوں۔"

حضورؐ اس یتیم بچّے کا حال سن کر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور بچّے کا ہاتھ پکڑ کر سیدھے ابوجہل کے گھر تشریف لے گئے ——— اس نے تشریف آوری کا سبب پوچھا تو آپؐ نے بڑے دبدبے کے ساتھ فرمایا:

"اس بچے کا حق اس کو دے دو۔"

ابوجہل کو حضورؐ کی بات رد کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے اسی وقت یتیم بچے کا مال لاکر اسے دے دیا۔ بعد میں قریش کے سرداروں نے ابوجہل سے پوچھا، کیا تم نے اپنا دین چھوڑ دیا جو محمدؐ کے حکم کی اس طرح تعمیل کی؟۔ اس نے کہا، خدا کی قسم میں اپنے دین پر قائم ہوں مگر جب محمدؐ مجھ سے یتیم کے حق کا مطالبہ کررہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا اس کے دائیں اور بائیں جانب ایک ایک حربہ ہے جو میرے جسم میں پیوست ہوجائے گا اگر میں نے اس کی بات نہ مانی۔ (اعلام النبوۃ)

○ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ مسجدِ حرام میں تشریف فرما تھے کہ بنی زبید کے ایک شخص نے آکر فریاد کی کہ اے اہلِ قریش تم باہر سے آنے والے مسافروں کو لوٹ لیتے ہو۔

حضورؐ نے اس سے پوچھا، "تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟"

اس نے کہا:

"میں تین نہایت عمدہ قسم کے اونٹ بیچنے کے لیے لایا تھا۔ ابوالحکم (ابوجہل) ان کو بہت کم قیمت پر خریدنا چاہتا ہے اور کسی دوسرے کو اس سے زیادہ قیمت نہیں لگانے دیتا۔"

حضورؐ نے پوچھا:

"تم ان اونٹوں کو کتنی قیمت پر فروخت کرنا چاہتے ہو؟"

اس نے قیمت بتائی تو حضورؐ نے اتنی رقم دے کر اس سے خود اونٹ خرید لیے۔ ابوجہل وہیں موجود تھا۔ آپؐ نے اس سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"تم نے اس غریب بدو کے ساتھ جو حرکت کی ہے اگر آئندہ

اس کا اعادہ ہوا تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

اس نے کہا، "نہیں نہیں آئندہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔" دوسرے مشرکین نے ابوجہل کو بزدلی کا طعنہ دیا تو اس نے کہا، میں کیا کرتا مجھے محمدؐ کے دائیں بائیں کچھ نیزہ بردار کھڑے نظر آرہے تھے اگر میں چوں وچرا کرتا تو وہ مجھ پر ٹوٹ پڑتے۔ (انساب الاشراف)

○ ایک دفعہ مشرکین نے حرم کعبہ میں بیٹھ کر باہم مشورہ کیا کہ محمدؐ آب جیسے ہی یہاں آئیں، سب مل کر ان کو قتل کر ڈالیں۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا کہیں پاس ہی تھیں انہوں نے کفّار کی گفتگو سن لی۔ روتی ہوئی حضورؐ کے پاس گئیں اور کفّار کے ناپاک ارادے سے آپؐ کو مطلع کر دیا۔

حضورؐ نے فرمایا، "جانِ پدر گھبراؤ نہیں اللہ میرے ساتھ ہے۔"

پھر آپؐ نے وضو کیا اور بے دھڑک حرم کے اندر تشریف لے گئے۔ مشرکین پر آپؐ کی شجاعت اور بے خوفی کا یہ اثر ہوا کہ ان کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں اور کسی کو حضورؐ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

○ سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو سراقہ بن مالک نے آپؐ کا تعاقب کیا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ آپؐ کو پا سکتا تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آپؐ کی حفاظت کی بہت فکر تھی اور وہ گھبرا کر بار بار سراقہ کی طرف مڑ کر دیکھتے تھے لیکن حضورؐ کی شجاعت اور حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے ایک دفعہ بھی مُڑ کر نہ دیکھا کہ دشمن کس ارادہ سے آرہا ہے۔ آپؐ کے دل پر سکینت باری طاری تھی اور لب ہائے مبارک پر قرآنِ حکیم کی آیات جاری تھیں۔

○ ہجرت کے بعد منافقین مدینہ، یہود اور قریش مکّہ نے باہم ساز باز کر کے رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ صحابہ کرامؓ حضورؐ کی حفاظت کے خیال سے آپؐ کے کاشانۂ اقدس کے گرد رات کو

پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک رات کو آپؐ نے اپنے کاشانۂ اقدس سے سر باہر نکال کر ارشاد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ انْصَرِفُوْا فَقَدْ عَصَمَنِیَ اللّٰہُ۔ (لوگو! واپس جاؤ، میری حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے)

○ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں میں سب سے بڑھ کر خوبصورت، سب سے بڑھ کر سخی اور سب سے بڑھ کر شجاع تھے۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ اہلِ مدینہ (ایک غیر مانوس آواز کی وجہ سے) گھبرا گئے اور سمجھے کہ شاید کسی دشمن نے مدینہ پر چڑھائی کر دی ہے۔ خطرے کے اس ہنگام میں حضورؐ سب سے پہلے آگے بڑھے، حضرت ابو طلحہ انصاریؓ سے ان کا گھوڑا (مندوب) مانگ بھیجا اور پھر اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر کسی کو ساتھ لیے بغیر جائے خطرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ صحابۂ کرامؓ بھی مسلح ہو کر اس طرف دوڑے۔ کچھ دُور گئے ہوں گے کہ رسولِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم واپس تشریف لاتے ملے۔ آپؐ فرما رہے تھے ڈرو نہیں (خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے) ہاں ابو طلحہؓ کے گھوڑے کو میں نے (تیز رفتاری میں) دریا پایا ہے۔

○ غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ نفوسِ قدسی کے مقابلہ پر مشرکینِ مکّہ کے ایک ہزار مسلّح جنگجو تھے۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو حضورؐ دشمن کی صفوں سے سب سے زیادہ قریب ہو کر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ یہ اتنی خطرناک جگہ تھی کہ حضورؐ کے قریب کھڑے ہونا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ حضرت سیّدنا علی مرتضیٰ کَرَّمَ اللّٰہُ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں ہم نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی آڑ میں پناہ لی اور آپؐ اس دن ہم سب میں دشمنوں کے قریب تر تھے اور اس دن آپؐ کی ہیبت (دشمنوں کے دلوں پر) سب سے زیادہ تھی۔

○ غزوۂ اُحد میں سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر تیروں، تلواروں، برچھیوں، اور پتھروں کا مینہ برس رہا تھا اور آپؐ شدید زخمی بھی تھے لیکن پائے ثبات میں اخیر تک ذرہ برابر جنبش نہ آئی۔

○ اُبَیّ بن خَلَف آپؐ کا جانی دشمن تھا۔ بَدر میں گرفتار ہو کر حضورؐ کے سامنے لایا گیا تھا تو آپؐ نے فدیہ لے کر اس کو رہا کر دیا تھا، لیکن یہ احسان فراموش جلتے وقت کہہ گیا تھا:

"میرے پاس ایک گھوڑی ہے جس کو روزانہ تین صاع جوار کھلاتا ہوں۔ ایک دن اسی پر سوار ہو کر تم کو قتل کر دوں گا۔"

حضورؐ نے جواب میں فرمایا تھا: "اللہ نے چاہا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

اُحُد کے دن اُبَیّ بن خَلَف اسی گھوڑی پر سوار ہو کر حضورؐ پر حملہ کے ارادے سے صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ چند صحابہ کرامؓ نے اس کا راستہ روکا تو حضورؐ نے فرمایا، "تم لوگ پرے ہٹ جاؤ اور اسے آگے آنے دو۔" پھر آپؐ نے حضرت حارثؓ بن صِمّہ کے ہاتھ سے برچھی لے کر اس کو ایک جھٹکا دیا جس سے آس پاس کے سب لوگ دفعتہً وہاں سے ہٹ گئے اور میدان خالی ہو گیا۔ اب آپؐ اُبَیّ بن خَلَف کی طرف متوجہ ہوئے جو بالکل قریب آ پہنچا تھا۔ آپؐ نے اس کی گردن میں برچھی کی اَنی چبھو دی۔ وہ چیخ مار کر بھاگا۔ جب مشرکین قریش کے پاس پہنچا تو بار بار یہ الفاظ دہراتا تھا، "محمدؐ نے مجھے قتل کر دیا۔" انہوں نے دلاسا دیا کہ یہ معمولی زخم ہے ــ تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو؟

وہ کہنے لگا "یہ سچ ہے، لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے۔ تم کیا جانو کہ مجھے اس زخم سے کتنی تکلیف ہے۔ اگر یہ تم سب پر بانٹ دی جائے تو تم سب مر جاؤ۔"

چنانچہ یہ مردود اسی زخم کی وجہ سے مکّہ سے چھ میل دُور "سرف"

کے مقام پر چیختا چلاتا مر گیا۔

○ ۳ سنہ ہجری میں حضورؐ ایک غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ درختوں کے بہت سے جھنڈ تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، صحابۂ کرامؓ مختلف درختوں کے سایہ میں بکھر گئے اور آرام کرنے لگے۔ حضورؐ بھی ایک درخت کے نیچے استراحت فرمانے لگے۔ آپؐ کی قمیص پسینہ سے بھیگ گئی تھی اُسے اتار کر آپؐ نے خشک ہونے کے لیے ڈال دیا اور تلوار بھی کھول کر درخت کی ٹہنی سے لٹکا دی۔ ناگاہ ایک کافر (جس کا نام بعض روایتوں میں "دعثور" آیا ہے اور جو شاید موقع کی تاک میں تھا) چھپکے سے آیا اور آپؐ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کر لی۔ اس وقت حضورؐ کی آنکھ کھل گئی۔ آپؐ نے دشمن کو تلوار سونتے سر پر کھڑا پایا لیکن کیا مجال کہ جبینِ ہمت پر شکن تک آجائے۔ کافر نے کڑک کر پوچھا:

"اے محمدؐ! اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟"

حضورؐ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، "اللہ"

اتنا سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور حضورؐ نے اسے اٹھا لیا۔ اب وہ آپؐ کے رحم و کرم پر تھا، بدن پر رعشہ پڑ گیا اور گھگھیانے لگا۔ رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسے معاف کر دیا۔

○ غزوہ حُنین میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی اور (فریقِ مخالف) بنو ہوازن صرف چار ہزار تھے۔ اس موقعہ پر بعض مسلمانوں کے منہ سے نکل گیا "لَنْ نُغْلَبَ الْیَوْمَ عَنْ قِلَّۃٍ" (یعنی ہم قلتِ لشکر کی وجہ سے تو آج مغلوب نہ ہوں گے) اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ نازش پسند نہ آئی۔ جنگ شروع ہوئی تو گھات میں بیٹھے ہوئے ہوازن کے ماہر قدر اندازوں نے ایسی شدت سے تیر برسائے کہ اکثر مسلمان میدانِ جنگ سے اِدھر اُدھر ہو گئے، لیکن حضورؐ چند جاں نثاروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے تھے۔ حضرت عباسؓ

فرماتے ہیں کہ :

"حُنین کے دن رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنے خچر کو ایڑ لگا کر کفار کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں اس کی لگام تھامے ہوئے اس کو روک رہا تھا کہ وہ تیزی سے کام نہ لے اور ابوسفیان مغیرہؓ (بن حارث بن عبدالمطّلب) آپؐ کی رکاب تھامے ہوئے تھے۔"

حضرت براءؓ بن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس موقع پر یہ رجز پڑھ رہے تھے :

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

(میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں)

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ اس وقت خچر سے اتر پڑے تھے جو آپؐ کے کمالِ شجاعت کی دلیل تھی۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق حضرت عباسؓ نے بآوازِ بلند مہاجرین اور انصار کو پکارا : یا معشر الانصار یا اصحاب الشجرۃ۔ اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ بروایت حضرت عباسؓ سب مسلمان دفعتہً پلٹ پڑے اور اس طرح بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو گئے جس طرح گائے (یا اونٹنی) اپنے بچہ کے پاس آتی ہے اور سب کی زبان پر تھا "یالبیک یالبیک" (ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں) پھر انہوں نے کفار کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ اس جنگ کے بعد کسی نے حضرت براءؓ بن عازب سے پوچھا کہ کیا حنین میں آپ کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ انہوں نے کہا، ہاں سچ ہے لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ثابت قدم رہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔ خدا کی قسم جب گھمسان کا رن پڑا ہوتا تو ہم لوگ آپؐ کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے اور ہم میں سے اس شخص کو بڑا بہادر سمجھا جاتا تھا جو حضورؐ کے ساتھ کھڑا ہونے کی جرأت کرتا تھا۔

اسی قسم کی روایت مسند احمد بن حنبلؒ، نسائی شریف، سنن بیہقیؒ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بھی مروی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ جب جنگ کا بازار گرم ہو جاتا اور آنکھیں سرخ ہو جاتیں تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن عاطفت میں پناہ لیا کرتے تھے اور اس وقت آپؐ سے زیادہ کوئی شخص دشمن کے قریب نہیں ہوتا تھا۔ گویا حضورؐ کے کمال شجاعت کا مظاہرہ کسی ایک غزوے یا موقع سے مختص نہیں بلکہ ہر غزوے اور خطرناک موقع پر حضورؐ سب سے بڑھ کر شجاع ثابت ہوتے تھے اور بڑے سے بہادر صحابہؓ حضورؐ کی آڑ میں پناہ لیا کرتے تھے۔ اللہ اکبر۔ اس سے بڑھ کر حضورؐ کے اشجع الناس ہونے کی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔

اسی لیے فاروق اعظمؓ کے جلیل القدر فرزند حضرت عبداللہؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر شجاع، مستقیم المزاج اور راضی برضا کسی کو نہیں دیکھا۔

فقید المثال سپہ سالار صلی اللہ علیہ وسلم

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حیاتِ طیبہ قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر تھی اور آپؐ کی ذاتِ گرامی تمام کمالات و صفاتِ حسنہ کی جامع تھی۔ ان میں سے ایک کمال یا صفت آپؐ کی تحیر خیز عسکری قابلیت تھی۔ یہ قابلیت خداداد تھی کیونکہ آپؐ نے نہ کسی حربی درسگاہ میں تعلیم پائی تھی اور نہ انفرادی طور پر کسی سے حرب و ضرب کا فن سیکھا تھا۔ اس عسکری قابلیت کا مظاہرہ اس وقت ہوتا تھا جب میدانِ جہاد میں آپؐ اسے سپہ سالارِ اسلام کی حیثیت سے دشمنانِ حق کے مقابلے میں بروئے کار لاتے تھے۔ عہدِ رسالت کی عسکری مہمات (غزوات و سرایا وغیرہ) کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم صحیح معنوں میں ایک عظیم جرنیل اور فقید المثال سپہ سالار تھے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بنیادی طور پر مکارمِ اخلاق کی تکمیل اور مخلوقِ خدا کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ آپؐ معلمِ انسانیت بھی تھے اور امن و اخوت کے داعی بھی۔ جنگ و جدل اور خونریزی کو آپؐ نے کبھی پسند نہیں کیا۔ آپؐ نے باطل کے خلاف اسی وقت تلوار اٹھائی جب دشمنانِ حق کی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کا اٹھانا ناگزیر ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اذن مل چکا تھا۔ فی الحقیقت ایک نبی اور رسول کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو اس کی پیغمبرانہ شان اور مرتبے سے یکسر الگ نہیں کیا جا سکتا اور رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بارگاہ میں تو ہم پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اے ہمارے آقا ؏ تیری حیاتِ پاک کا ہر لمحہ پیغمبر لگے

خلوت ہو یا جلوت، دکھ ہو یا سکھ، امن ہو یا جنگ، کوئی بھی حالت آپؐ کی تدبیر و حکمت اور شانِ رحمۃٌ للعالمینی سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ اسلام سراپا جہاد اور مجاہدہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگی کے دونوں دور جَاھِدُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ کی عملی تفسیر تھے۔ بس ان میں اتنا فرق تھا کہ مکی دور میں آپؐ اور آپؐ پر ایمان لانے والے علمبردارانِ حق کفار کے مظالم کا نشانہ بنے رہے۔ کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو انہوں نے راہِ حق میں نہ جھیلی ہو یہاں تک کہ ایک دن اپنے دین کی خاطر اپنا گھر بار اور وطن بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا بلاشبہ یہ بہت بڑے مجاہدے کا دور تھا۔ اہلِ حق تمام مصائب عدیم المثال حوصلے اور صبر کے ساتھ جھیلتے رہے لیکن کافروں کے خلاف تلوار نہ اٹھائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مکی اصحابؓ کی ہجرت الی المدینہ کے بعد بھی کفار کا سینہ ٹھنڈا نہ ہوا اور کفار نے شمعِ رسالت کو بجھانے اور دینِ حق کو مٹانے کی کوششیں برابر جاری رکھیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سازشوں کے ساتھ فوجی قوت سے بھی کام لیا۔ گویا عہدِ رسالت کے مدنی دور کا آغاز ہونے کے بعد بھی کفار نے اہلِ حق کے خلاف کسی نہ کسی صورت میں جنگ جاری رکھی یہی وہ زمانہ تھا جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق کو تلوار اٹھانے (یعنی جہاد) کی اجازت دی۔ سورہ الحج میں ارشاد ہوتا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ نِ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ (آیۃ ۳۹ - ۴۰)

(اجازت دے دی گئی لڑنے کی ان لوگوں کو جن پر جنگ ٹھونسی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس بنا پر کہ وہ کہتے تھے، ہمارا رب اللہ ہے)

مظلوم مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت سنہ ۱ ہجری کے اواخر میں دی گئی، اس کے چند ماہ بعد غزوۂ بدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان سنہ ۲ ہجری میں انہیں قتال (جہاد) فی سبیل اللہ کا حکم بدیں الفاظ دیا گیا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ (البقرہ آیۃ ۱۹۰)

(اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

(البقرہ۔آیۃ ۲۴۴)

(مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے)

اسی طرح اور کئی آیتوں میں بھی مسلمانوں کو راہِ حق میں لڑنے کا حکم دیا گیا اور اس کے مقاصد یہ متعین کیے گئے۔

(۱) ملک و ملت کے دفاع اور حفاظت کے لیے جب ظالم (دشمن) حملہ آور ہو یا حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔

(۲) عبادت گاہوں کی حفاظت کے لیے۔

(۳) اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی مدد کے لیے جو ہر وقت دعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے باشندے ظالم ہیں۔

(۴) فتنہ و فساد اور سرکشی کو ختم کرنے کے لیے۔

قتال (جہاد) فی سبیل اللہ کا بارگاہِ الٰہی سے اِذن اور پھر حکم نازل ہونے کے بعد (مدنی دورِ رسالت میں) مسلمانوں کو تقریباً اسّی اہم اور غیر اہم غزوات

سرایا پیش آئے۔ بڑے معرکوں بدر، اُحد، خندق، مُریسیع (بنو مصطلق) خیبر، الرقاع، فتح مکہ، حنین، طائف اور جیش عسرۃ (یعنی تبوک) اور کچھ چھوٹی مہموں میں آپؐ نے فوج کی قیادت خود فرمائی۔ باقی مہموں اور سرایا کی قیادت کے لیے آپؐ نے خاص خاص صحابہ کو نامزد فرمایا اور جب وہ روانہ ہونے لگے تو ان کو ایسی ہدایات دیں جن سے مہم یا سریّہ کو سر کرنے میں مدد ملی۔

مختلف غزوات اور مہمات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا اور جن جنگی تدابیر اور حکمت سے کام لیا ان سب کی تفصیل (اس کتاب کی دوسری جلد میں) غزوات و سرایا کے حالات میں آئے گی۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحیر خیز عسکری قابلیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکے گا۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی "رحمتِ عالمؐ کی شانِ جہانبانی" کے عنوان کے تحت اس موضوع سے متعلق کچھ مواد موجود ہے (دیکھئے ذیلی سرخی "فوج اور عسکری مہمات")

یہاں ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص جنگی اصول (WAR STRATEGY) اور کچھ تاریخی حقائق بیان کریں گے جن سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ آپؐ کتنے عظیم سپہ سالار (اسلامی فوج کے قائد یا امیر) تھے۔

(۱) ایک سپہ سالار کو شخصی اخلاق و کردار کے جن اوصاف و محاسن کا حامل ہونا چاہیے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں وہ تمام بدرجۂ کمال موجود تھے، مثلاً فراست و تدبر، شجاعت، بے خوفی، عزم و استقامت، مردم شناسی اور سلامت روی۔ ماتحتوں سے حسنِ سلوک، ان کے شانہ بشانہ مختلف کاموں میں حصہ لینا اور ان کے دکھ سکھ میں شریک رہنا۔ میدانِ جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال شجاعت اور ثابت قدمی کا حال اسی کتاب میں "شجاعتِ نبوی" کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں ——— "اسیرانِ جنگ سے حسنِ سلوک" کا باب بھی بڑی حد تک سیرتِ طیبہ کے عسکری پہلو سے متعلق ہے۔

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اللہ کے سپاہی بنا دیا جو کسی دنیوی یا

ذاتی فائدے یا غرض کے لیے نہیں لڑتے تھے بلکہ صرف دینِ حق کے لیے اللہ کے متعین کیے ہوئے مقاصد کے لیے لڑتے تھے۔ حضورؐ نے ان کے اندر ایسا جذبۂ ایمان پیدا کر دیا تھا کہ وہ میدانِ جہاد میں موت کو ہلاکت نہیں بلکہ شہادت سمجھتے تھے اور شہادت کو جنّت کی ابدی زندگی کے مترادف۔ پھر آپؐ نے مسلمانوں کو اپنی تعداد یا اپنے ہتھیاروں پر بھروسا کرنے کے بجائے صرف اللہ پر بھروسا کرنا سکھایا لیکن ساتھ ہی ان کو ہر قسم کے اسلحہ کے استعمال میں ماہر بنایا، ان کو تلقین فرمائی کہ اپنے آپ کو صحت مند اور قوی رکھیں، گھڑ دوڑ، نیزہ بازی، تیر اندازی میں مہارت حاصل کریں اور دوسری مردانہ ورزشوں میں بھی حصہ لیا کریں۔

(۳) فوجی مہمات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم اپنا ارادہ مخفی رکھتے تھے اور نامانوس راستوں سے گزرتے ہوئے اچانک دشمن کو جا لیتے تھے۔

(۴) دشمن پر رعب طاری کرنے کے لیے اسلامی کیمپ میں جگہ جگہ آگ روشن کی جاتی تھی۔

(۵) حضورؐ نے جاسوسی کا شعبہ بھی قائم فرمایا تھا کیونکہ اس شعبے کو فوجی معاملات میں بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جنگ سے پہلے آپؐ اپنے جاسوسوں کے ذریعے دشمن کے بارے میں نہایت کارآمد معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ مثلاً دشمن اپنی فوج کہاں جمع کر رہا ہے، اس کی فوج کتنی ہے، ہتھیاروں اور سازوسامان کی کیا کیفیت ہے، اس کا ارادہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض دفعہ دشمن ابھی مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہوتا کہ آپؐ اپنے جاسوسوں سے اطلاع پا کر اچانک اس پر حملہ کر دیتے یا کسی آزمودہ کار بہادر صحابی کو کچھ فوج دے کر دشمن کا قلع قمع کرنے کے لیے بھیج دیتے۔

(۶) لڑائی کے آغاز سے پہلے آپؐ اپنی فوج کی صف بندی کرتے۔ آپؐ کے نزدیک صف بندی کی بہت اہمیت تھی اور اس معاملے میں آپؐ ذرا سی

بھی بے قاعدگی گوارا نہ فرماتے تھے۔

(۷) صف بندی کے علاوہ آپؐ فوجی دستوں کو مناسب مورچوں پر متعین فرماتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں اس کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ﴿آلِ عمران، آیۃ ۱۲۱﴾

(اے نبی! مسلمانوں کے سامنے اس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور (اُحُد کے میدان میں) مسلمانوں کو لڑائی کے لیے جگہ جگہ مامور کر رہے تھے۔)

غزوۂ اُحُد میں آپؐ نے پچاس تیراندازوں کو ایک مناسب مقام پر متعین فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ تم اپنی جگہ کسی حالت میں نہ چھوڑنا خواہ لڑائی کوئی بھی صورت اختیار کر جائے۔ لڑائی کے پہلے دور میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو ان میں سے اکثر نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

غزوۂ خندق میں آپؐ نے سخت پتھریلی زمین میں خندق کھود کر دفاعی جنگ لڑی۔ تقریباً تین ہفتے تک آپؐ بڑی حکمت اور حسنِ تدبیر کے ساتھ دشمن کے جمِ غفیر کا مقابلہ کرتے رہے۔ دشمن کی تعداد دس ہزار اور مسلمانوں کی صرف تین ہزار تھی لیکن آپؐ نے اپنے فوجی دستوں کو مناسب مقامات پر اس طرح مامور فرمایا تھا کہ دشمن جب بھی خندق پھاند کر شہر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا اس کو منہ کی کھانی پڑتی یہاں تک کہ آخر وہ تھک ہار کر بصد ذلت و رسوائی ایک دن بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

(۸) فتح کے بعد آپؐ میدانِ جنگ میں تین دن قیام فرماتے اور ضروری سمجھتے تو مجاہدین کی ایک مناسب تعداد کو دشمن کے تعاقب میں روانہ فرماتے۔ غزوۂ اُحُد کے دوسرے دن آپؐ نے بہت سے مجاہدین کو دشمن کا پیچھا کرنے کے لیے

بھیجا۔ ان مجاہدین نے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع حمراء الاسد کے مقام تک دشمن کا تعاقب کیا لیکن وہ بھاگ گیا۔ اسی طرح غزوۂ حنین کے بعد کفار کا تعاقب کیا گیا۔

(۹) غزوۂ اُحُد کے بعد ابوسفیان سپہ سالار قریش نے بآوازِ بلند مسلمانوں کو دھمکی دی تھی کہ اگلے سال ہمارا تمہارا مقابلہ میدانِ بدر میں ہو گا۔ اگلے سال حضورؐ ڈیڑھ ہزار مجاہدین کے ساتھ خود پیش قدمی کر کے بدر پہنچ گئے اور آٹھ دن تک وہاں مقیم رہے۔ ابوسفیان کے ساتھ دو ہزار آدمیوں کا لشکر لڑائی کے لیے آیا لیکن اس کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور فضول سا بہانہ بنا کر واپس چلا گیا۔ اس واقعہ کو غزوۂ بدرُ الاُخریٰ یا بدرُ الموعد کہا جاتا ہے۔

(۱۰) غزوۂ خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف چودہ سو مجاہدین تھے۔ ان کے مقابلے میں یہودیوں کی فوجی قوت دس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی جو بڑے مضبوط قلعوں میں مقیم تھے لیکن آپؐ نے ان کے خلاف جو حکمتِ عملی اختیار فرمائی اور جن جنگی تدابیر سے کام لیا ان کے نتیجے میں یہود کو شکستِ فاش ہوئی۔

(۱۱) ۹ ہجری میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ ہرقل (قیصرِ روم) شام میں عرب پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے تو آپؐ تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ کئی سو میل کا دشوار گزار راستہ طے کر کے شام کی سرحد کے قریب تبوک کے مقام پر پہنچ گئے۔ مقصد یہ تھا کہ دشمن کو سرزمینِ عرب پر قدم رکھنے سے پہلے ہی دبوچ لیا جائے۔ آپؐ دو تین ہفتے تبوک میں خیمہ زن رہے لیکن رومیوں کو سرزمینِ عرب کا رُخ کرنے کی ہمت نہ پڑی تاہم آپؐ کے اس اقدام کے بڑے دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔ سرحد کے قریب کئی قبائل نے آپؐ کی اطاعت قبول کر لی۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی عسکری قوت کی سارے عرب پر دھاک بیٹھ گئی۔ اگرچہ غزوۂ تبوک سے پہلے ہی عرب کا بیشتر علاقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ نگین ہو چکا تھا لیکن غزوۂ تبوک

کے بعد تو عرب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جو اسلامی اقتدار سے سرتابی کی جرات کر سکے۔

(۱۲) عہدِ رسالت کی لڑائیوں کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بیشتر لڑائیاں مسلمانوں پر ٹھونسی گئیں یا ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ اہلِ حق کو دین کی خاطر تلوار اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا ورنہ عام حالات میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صلح و آشتی کو جنگ و جدل اور خونریزی پر ترجیح دیتے تھے۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ نے اپنی گرانقدر تالیف "رحمۃ للعالمین" میں لکھا ہے کہ عہدِ رسالت کی تمام لڑائیوں میں مجموعی طور پر ۲۵۹ مسلمان شہید ہوئے اور دشمنوں کے ۷۵۹ آدمی مارے گئے۔ ان اعداد و شمار کے مقابلے میں جو انقلاب برپا ہوا ذرا اس پر غور کیجیے کہ ایک ایسے زمانے میں جب دورِ حاضر جیسے ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکھوں مربع میل پر محیط سرزمین پر صرف دس برس کے قلیل عرصے میں پرچم اسلام بلند کر دیا اور عرب کے وسیع و عریض ملک میں جہاں امن نام کی کسی شے کا نام و نشان تک نہ تھا، ایسا امن قائم کر دیا کہ ایک بڑھیا تن تنہا ملک کی ایک سرحد سے سونا اچھالتی ہوئی دوسری سرحد تک چلی جاتی تھی اور کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس مہتم بالشان انقلاب کے برپا ہونے میں جو عوامل کارفرما تھے بلاشبہ ان میں ایک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محیر العقول عسکری قابلیت بھی تھی جس نے بڑے بڑے سرکشوں کے کس بل نکال دیئے اور ان کو امن و امان میں خلل ڈالنے کے قابل نہ چھوڑا۔

اسیرانِ جنگ سے حُسنِ سُلوک

سرورِ کائنات فخرِ موجودات ختمی مرتبت سیدالانام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ اقدس مجسّمِ خیر و برکت اور رحمت و شفقت تھی۔ اس پر نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ کسی ثبوت کی، کیونکہ خود خالق کون و مکاں نے آپ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیا ۲۱: ۱۰۷)

ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

چنانچہ حضور پُرنور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حیاتِ طیبہ کے کسی بھی پہلو پر نگاہ ڈالیں اس میں خیر ہی خیر اور رحمت ہی رحمت نظر آئے گی۔ آپؐ کا دامنِ رحمت و شفقت اس قدر وسیع تھا کہ مخلوقِ خدا کا ہر طبقہ اس سے حصہ پاتا تھا اور بقدرِ ظرف فیض یاب ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اسیرانِ جنگ کے مقہور اور مجبور طبقے کو بھی آپؐ کے دامنِ رحمت نے ڈھانپ لیا تھا۔

اسیرانِ جنگ میں عام طور پر دو قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو معرکۂ کارزار میں قیدی بنا لیا جاتا ہے، دوسرے وہ جو کسی مفتوحہ شہر کے باشندے ہوتے ہیں اور فاتح فوج انھیں اپنا قیدی بنا لیتی ہے۔ مختلف اقوامِ عالم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ قدیم زمانے میں سبھی قومیں اسیرانِ جنگ پر ہر طرح کا ستم توڑنا جائز ہی نہیں بلکہ اپنا حق سمجھتی تھیں اور ان پر ایسے ایسے مظالم ڈھاتی تھیں کہ ان کا حال پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کلدانی جنگی قیدیوں سے کولہو چلواتے اور چکیاں پسواتے

تھے۔ ایران کے آتش پرست اسیرانِ جنگ کو زندہ جلا دیتے تھے یا ان کو قتل کر کے ان کے سروں پر مینار بناتے تھے۔ رومی اور یونانی تہذیب کے بانی اور علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن اسیرانِ جنگ سے وہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے تھے۔ ان کے پاؤں میں موٹی موٹی بوجھل بیڑیاں ڈال کر ان سے شدید مشقت لیتے تھے۔ اگر کوئی تھک کر ستانے بیٹھ جاتا تو اس کو کوڑوں سے اس بُری طرح پیٹتے تھے کہ اس کی کھال ادھڑ جاتی تھی، بعض دفعہ ان کو گرم لوہے کی سلاخوں سے داغتے تھے، زندہ آگ میں جلا دیتے تھے یا پانی میں غرق کر دیتے تھے۔ ایسی قومیں بھی تھیں جو اسیرانِ جنگ کو درندوں اور کتوں سے پھڑوا ڈالتی تھیں۔ عربوں میں اسیرانِ جنگ سے وحشیانہ سلوک کی یہ کیفیت تھی کہ وہ نہ صرف مغلوب دشمن کے قیدیوں کو تیروں، برچھیوں اور خنجروں سے چھلنی کر ڈالتے تھے بلکہ ان کے شیرخوار بچوں تک کو تیروں کا ہدف بنا لیتے تھے۔ لیکن ان سب قوموں کے طرزِ عمل کے برعکس رسولِ رحمت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسیرانِ جنگ سے ایسا رحیمانہ اور کریمانہ سلوک کیا کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے، ہم یہاں صرف دو تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جن سے اسیرانِ جنگ سے حضورؐ کے حسنِ سلوک کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکے گا۔

○ حق و باطل کے معرکۂ اول، غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے باطل کو سرنگوں کیا اور ستر مشرکین مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوگئے۔ یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں تھے اور حضرت عمر فاروقؓ نے مشورہ بھی دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے لیکن حضورؐ کی شانِ رحیمی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ آپؐ نے ایک ایک دو دو قیدی صحابۂ کرام میں تقسیم کر دیئے اور ان کو تاکیدی حکم دیا کہ دیکھنا انھیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل میں صحابۂ کرامؓ خود بھوکے پڑے رہتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ خود کھجوروں سے پیٹ بھر لیتے تھے

اور قیدیوں کو گوشت روٹی کھلاتے تھے ، حضرت مصعبؓ بن عمیر کے اخیافی بھائی ابوعزیز جو قیدیوں میں شامل تھے ، کہتے ہیں کہ جب صحابہ خود کھجوروں پر گزارہ کرتے اور میرے سامنے روٹی سالن رکھتے تو مجھے شرم آتی اور میں روٹی واپس کر دیتا لیکن وہ اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے اور اصرار کر کے مجھے کھلاتے ۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی قیدیوں میں شامل تھے ۔ رسی کی سخت بندش کی وجہ سے انھیں تکلیف ہوئی اور وہ کراہے تو حضورؐ نے حکم دیا کہ عباسؓ اور دوسرے تمام قیدیوں کے بند ڈھیلے کر دیئے جائیں ۔ جن قیدیوں کے کپڑے پھٹ گئے تھے حضورؐ نے انھیں نئے کپڑے عطا کیے ۔ جو ذی استطاعت تھے ، ان کو چار چار ہزار درہم فدیہ کے عوض رہا کر دیا گیا ۔ جو نادار تھے ان کو ویسے ہی آزاد کر دیا گیا ۔ جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان کا فدیہ یہ مقرر ہوا کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں ۔

○ غزوۂ بنی مصطلق (۵ ہجری) میں دشمن کے چھ سو آدمی مسلمانوں کے ہاتھ قید ہو گئے ۔ ان میں بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی جویریہؓ بھی تھیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر دیا اور ان کی رضامندی سے ان کے ساتھ نکاح کر لیا ۔ ساتھ ہی قبیلے کے تمام قیدی بھی کسی شرط کے بغیر رہا کر دیئے گئے ۔

○ غزوۂ خندق میں یہودِ بنی قریظہ نے حملہ آور مشرکین سے سازباز کی اور مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا منصوبہ بنایا ۔ ان کا یہ منصوبہ تو کامیاب نہ ہو سکا لیکن ان کی غداری ثابت ہو گئی ۔ جب مشرکین مدینہ کا محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے تو حضورؐ نے بنو قریظہ کے محلے کا محاصرہ کر لیا اور ان کو مغلوب کر کے جنگی قیدی بنا لیا ۔ حضورؐ نے ان کی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کے بجائے ان کو اختیار دیا کہ وہ اپنی مرضی کا کوئی ثالث یا حَکَم بنا لیں جو یہ فیصلہ کرے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ۔ ان لوگوں نے سیّد الاوس

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم بنایا۔ حضرت سعدؓ بن معاذ کا قبیلہ مدت تک بنو قریظہ کا حلیف رہا تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ حضرت سعدؓ ان کے حق میں فیصلہ کریں گے لیکن حضرت سعدؓ نے فیصلہ سنایا کہ جو "بدترین غداری بنو قریظہ نے کی ہے اس کی سزا یہ ہے کہ ان کے تمام لڑنے والے مرد قتل کیے جائیں۔ چنانچہ اسی فیصلے کے مطابق عمل ہوا۔ اگر یہ لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر چھوڑتے تو قیاس غالب یہی ہے کہ ان کی جانیں بچ جاتیں۔

○ ۷ھ ہجری کے آغاز میں آنحضورؐ نے خیبر پر فوج کشی کی۔ اس کا مقصد یہودیوں کی آئے دن کی شرارتوں کا سدِ باب کرنا تھا۔ یہودیوں نے سخت مقابلہ کیا لیکن بالآخر شکست کھائی۔ اب وہ حضورؐ کے رحم وکرم پر تھے اور سخت سے سخت سزا کے مستحق تھے۔ مگر جب انہوں نے التجا کی کہ ہمیں خیبر ہی میں رہنے دیا جائے ہم یہاں کی تمام زمینوں اور باغوں کی پیداوار کا نصف دے دیا کریں گے تو حضورؐ نے ان کی التجا منظور فرمائی اور سب کو سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا۔

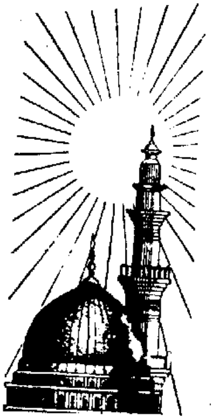
○ ذیقعدہ ۶ھ ہجری میں قیام حدیبیہ کے دوران میں ایک دن حضورؐ صحابہؓ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے اسّی جنگجو مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کا ارادہ سے آئے۔ مسلمان پہرے دار چوکس تھے انہوں نے سب کو گرفتار کر لیا اور حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔ گو وہ سب واجب القتل تھے لیکن آپؐ کا دریائے عفو وکرم جوش میں آگیا اور آپؐ نے سب کو محض تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔

○ فتح مکہ کے بعد تمام جبابرۂ قریش مسلمانوں کے رحم وکرم پر تھے حضورؐ کا ایک اشارہ ان سب کو خاک وخون میں لوٹا سکتا تھا لیکن آپؐ نے یہ فرما کر سب کو بخش دیا کہ تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اللہ اکبر۔ قابو میں آئے ہوئے بدترین دشمن سے ایسے حُسنِ سلوک کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔

○ غزوۂ حنین میں بنو ہوازن اور بنو سعد کے چھ ہزار آدمیوں کو مسلمانوں نے اسیر کر لیا لیکن جب ان کی رہائی کے لیے ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے نہ صرف ان سب کو آزاد کر دیا بلکہ ہر ایک کو عمدہ مصری کپڑے کا ایک ایک جوڑا بھی عطا فرمایا۔ ان میں حضورؐ کی دایہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی بیٹی شیماؓ بھی تھیں۔ حضورؐ نے ان کی بڑی عزت و تکریم کی اور جب وہ چلنے لگیں تو ان کو چند اونٹ اور بکریاں وغیرہ عنایت فرمائیں۔

مختصر یہ کہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ جنگ سے حُسنِ سلوک کی جو مثال قائم فرمائی وہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے تا ابد سرمایۂ افتخار بنی رہے گی۔



عبادتِ نبوی ﷺ

عبادت کا اصل مادہ "عبد" (ع ب د) ہے اور عربی میں اس کے معنی انقیاد و اطاعت کے ہیں۔ فی الحقیقت عبد کا لفظ "آزاد" کے مقابلے میں غلام اور مملوک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان کی نہایت مستند لُغت "لسان العرب" کی تشریحات کے مطابق عبادت کے ایک معنی تو پرستش کے ہیں اور دوسرے معنی عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری۔ عبادت غیر اللہ کی ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی صریحاً نافرمانی ہے۔ اسے بلا تامل شرک اور کفر کہا جا سکتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے معبودِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق ہے۔ اس نے جِن و اِنس کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں جیسا کہ سورۃ "الذّٰریٰت" میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝

(اور میں نے جِن و انس کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں)۔

لُغوی تشریحات کے مطابق عبادت کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی صرف پرستش ہی نہیں بلکہ اس کے تمام احکام کی بے چون و چرا اطاعت، اس کے قانونِ شریعت کی برضا و رغبت پیروی اور اس کے امر و نہی کی دل و جان سے پیروی بھی شامل ہے۔ گویا ایک سچے مسلمان یا مردِ مومن کی ساری زندگی ہی عبادت میں گزرتی ہے یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے علاوہ اس کا

اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، رزقِ حلال کے لیے بھاگنا دوڑنا، حقوق العباد پورے کرنا، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت و تبلیغ غرض اس کا ہر قول و فعل (جو احکام الٰہی کے مطابق ہوگا) عبادت ہی میں داخل ہے لیکن جو "عبادت" دین کی خاص اصطلاح ہے اس سے مراد وہ مخصوص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہیں جو کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے جذبۂ عبدیت اور عجز و تذلل کے اظہار کے لیے کرتا ہے اور جن کی شریعت میں تفصیل کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکرِ الٰہی ——— یہاں ہم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی عبادت کا ذکر کریں گے۔

نماز

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ کو جتنا شغف عبادتِ الٰہی سے تھا اور کسی چیز سے نہیں تھا۔ اس عبادت میں سرِ فہرست نماز تھی۔ صحیحین میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ دینی اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل وقت پر نماز پڑھنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح بارگاہِ صمدیت میں درجۂ محبوبیت حاصل تھا اسی طرح آپؐ کی حق تعالیٰ سے محبّت کی کوئی حد و نہایت نہیں تھی چنانچہ آپؐ سب لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اور اس کا ذکر و شکر کرنے والے تھے۔ نماز چونکہ تمام عبادات میں اظہارِ عبدیّت کے اعتبار سے خاص امتیاز رکھتی ہے، اس لیے آپؐ کو اس سے قلبی لگاؤ تھا اور آپؐ اس میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین پاتے تھے (حدیثِ نبوی) وقتاً فوقتاً نماز کا وقت آنے پر آپ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کرتے تھے:

"اے بلال! اٹھو اور نماز شروع کرکے میرے دل کو راحت پہنچاؤ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کی سختیوں اور جفا کاریوں کے مقابلے میں ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیا اور ان کو کبھی بد دعا نہ دی لیکن غزوۂ خندق میں ایک دن جب دشمنوں نے آپؐ کو نمازِ عصر پڑھنے کی مہلت نہ دی اور یوں یہ نماز قضا ہو گئی۔ — تو آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ آ گئے۔

"ان لوگوں نے ہمیں عصر کی نماز نہیں پڑھنے دی اللہ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم معمولاً (اہتمام اور پابندی کے ساتھ) دن رات میں چالیس رکعت نماز پڑھتے تھے۔ ان میں سترہ رکعت فرائض پنجگانہ کے علاوہ دس یا بارہ رواتب (یعنی مؤکدہ سنتیں) اور تہجد مع وتر کی گیارہ یا تیرہ رکعت شامل ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

فجر سے پہلے دو رکعت۔ ظہر سے پہلے دو رکعت یا چار رکعت (دونوں ثابت ہیں) اور فرضوں کے بعد دو رکعت۔ مغرب کے بعد دو رکعت۔ عشاء کے بعد دو رکعت اور تہجد مع وتر گیارہ یا تیرہ رکعت (دونوں ثابت ہیں)۔ ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوّابین (مغرب کے فرض اور سنتوں کے بعد کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعتیں)۔ اشراق (سورج نکلنے کے فوراً بعد دو رکعت) چاشت (سورج کے خوب بلند ہو جانے کے بعد چار، آٹھ یا بارہ رکعتیں) تحیۃ المسجد (مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا بھی متعدد احادیث سے ثابت ہے)۔

دن کے اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نفل نمازیں زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ اس کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ منصبِ رسالت اور سربراہِ مملکت کے فرائض کی ادائیگی میں آپؐ کا کافی وقت صرف ہو جاتا تھا۔ ذرا ان فرائض کا اندازہ کیجئے کہ آپؐ دعوت و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت میں مشغول ہیں، مُلک

کے داخلی اور خارجی معاملات سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں، مقدمات سُن رہے ہیں، مجرموں اور خطا کاروں پر حد جاری فرما رہے ہیں، بادشاہوں اور حکمرانوں کو دعوتِ حق کے خطوط بھیج رہے ہیں، باہر سے آنے والے وفود سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور ان کی مہمانداری کر رہے ہیں، میدانِ جہاد میں فوجوں کی قیادت فرما رہے ہیں یا مجاہدین کی کسی جماعت کو اپنے کسی جاں نثار کی قیادت میں مناسب ہدایات دے کر کسی مہم (سَرِیّہ) پر روانہ فرما رہے ہیں مریضوں کی عیادت کر رہے ہیں، اپنے وفات پا جانے والے صحابہؓ (اور صحابیاتؓ) کے جنازوں میں شریک ہو رہے ہیں اور ان کے پسماندگان کے ساتھ تعزیت کر رہے ہیں، بازار میں یہ دیکھنے کے لیے گشت کر رہے ہیں کہ کوئی دکاندار ناپ تول میں کمی تو نہیں کر رہا یا کوئی ناقص چیز اس کا عیب ظاہر کیے بغیر تو نہیں بیچ رہا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اتنی مصروفیات سے فرض نمازوں کے علاوہ دوسری نمازوں (نوافل) کے لیے بہت کم وقت بچتا ہوگا۔

دوسرا سبب بظاہر یہ تھا کہ اگر آپؐ دن کے اوقات کا بڑا حصہ نوافل پڑھنے میں صرف کرتے تو آپؐ کی محبّت اور تقلید میں صحابۂ کرام بھی ایسا ہی کرتے لیکن آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ اُمّت پر زیادہ بوجھ پڑ جائے یا ان نوافل کا پڑھنا اُمّت پر فرض کر دیا جائے۔

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رات کی نماز اکثر بہت طویل ہوتی تھی عام طور پر نمازِ عشاء سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ سو جاتے تھے۔ کبھی آپؐ کافی آرام فرما کر تہجّد کے لیے اٹھتے، کبھی آدھی رات کے بعد اٹھتے، کبھی صرف آخری تہائی رات ہی میں تہجّد پڑھتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ رات بھر نماز میں کھڑے رہتے اور کبھی کبھی ایسا بھی کرتے کہ اٹھے، دو رکعتیں پڑھیں پھر کچھ دیر کے لیے سو گئے پھر اٹھ کر دو رکعتیں پڑھیں، اسی طرح بار بار سوئے اور بار بار اٹھ کر نماز پڑھی یہاں تک کہ صبح ہو گئی ـــــ یہ حضورؐ کی نمازِ شب

کے بارے میں مختلف روایتوں کا خلاصہ ہے۔ محدثین نے ان روایتوں میں یوں تطبیق دی ہے کہ حضورؐ نے مختلف اوقات میں ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقہ سے نماز پڑھی ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح۔ زاد المعاد۔ شرح مواہب زرقانی، سیرۃ النبیؐ)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ تہجد بالعموم بہت طویل ہوا کرتی تھی۔ بعض اوقات حضورِ حق میں مسلسل اور طویل قیام سے آپؐ کے دونوں پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ یہ دیکھ کر بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! آپؐ کی مغفرت تو اللہ کر چکا ہے، آپ یہ مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا

یعنی کیا میں عبدِ شکور نہ بنوں (بالفاظِ دیگر کیا میں اپنے پروردگار کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟) (مشکوٰۃ المصابیح، جمع الفوائد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ آپؐ نے اتنا طویل قیام کیا کہ میرے لیے آپؐ کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا اور میرے دل میں ایک قبیح خیال آنے لگا ـــــــ راوی سے کسی نے پوچھا، وہ قبیح خیال کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا، خیال یہ تھا کہ میں بیٹھ جاؤں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا چھوڑ دوں۔ (صحیحین)

حضرت زید بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج رات کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھوں گا۔ (علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے) نماز کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ پہلے دو رکعتیں ہلکی ادا کیں، پھر دو رکعتیں بہت ہی طویل اور بہت دیر تک پڑھیں پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں

اور سب کے آخر میں نمازِ وتر پڑھی۔ (سیرۃ النبیؐ بحوالہ صحیح مسلم، مؤطا، ابوداؤد)

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی پوری پوری رات نماز پڑھتے رہتے۔ نماز کی رکعتیں اتنی طویل ہوتیں کہ آپؐ ان میں سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران اور سورۃ النساء پوری پوری پڑھتے۔ دورانِ قرأت خوف اور خشیت کی آیت آتی تو اللہ سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے۔ قرأت کرتے ہوئے آپؐ کی آواز اتنی بلند ہوتی کہ دُور دُور تک لوگ اپنے بستروں میں پڑے ہوئے اسے سُن لیتے۔ (سیرۃ النبیؐ بحوالہ مسندِ احمد و ابنِ ماجہ)

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شب مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آپؐ نے چار رکعتوں میں سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران، سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ (یا سورۃ الانعام) پڑھیں گویا تقریباً چھ سپارے پڑھے۔

(ابو داؤد)

کبھی جب گھر کے لوگ سو جاتے، آپؐ خاموشی کے ساتھ بستر سے اٹھتے اور عبادت میں مصروف ہو جاتے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پہ نہ پایا، میں نے خیال کیا شاید آپؐ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولا تو اچانک میرے ہاتھ آپؐ کے قدموں پر پڑے۔ آپؐ سجدے میں تھے اور دونوں پاؤں کھڑے تھے۔ اس وقت آپؐ یہ دعا مانگ رہے تھے کہ "اے اللہ! میں تیری رضامندی کے واسطہ سے، تیری ناراضی سے اور تیرے عفو و درگزر کے واسطہ سے تیرے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری رحمت کے واسطہ سے

تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں، میں تیری تعریف کرنے سے عاجز ہوں تو ایسی عظیم ذات ہے جیسا کہ تو نے خود ہی اپنی ثنا بیان کی ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ دیکھ کر مجھ کو اپنے گمان پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا، سبحان اللہ! ہم کس گمان میں ہیں اور آپ کس حال میں ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

خود اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی عبادت کا ذکر قرآن حکیم میں یوں فرمایا ہے:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ۔ (سورۃ المزمل۔ رکوع ۲)

(اے نبی) تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز اپنے اوپر فرض کرلی تھی اور اس کا کبھی ناغہ نہ کرتے تھے لیکن اُمت کے لیے آپ کا اتباع کرنا بہت مشکل تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور اس نماز کو نفل قرار دیا، ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ سہولت دی کہ جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہیں پڑھ لیا کریں۔ جیسا کہ آگے چل کر ارشاد ہوا ہے:

وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ (المزمل، رکوع ۲)

(اے نبی) تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔

اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے لہٰذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے، کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔

اس حکم کے نزول کے بعد تہجد کی نماز میں تلاوت اور قیام میں تخفیف ہو گئی تاہم حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول قدرے تخفیف کے ساتھ پہلے جیسا ہی رہا کیونکہ اپنے رب سے آپؐ کی محبت اور آپؐ کا تعلق غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے کوئی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے۔ (صحیحین) ظاہر ہے کہ جب حضورؐ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے پیارے رب سے اپنے دل کی باتیں کرنے میں آپؐ کو جو لذت اور حلاوت ملتی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اسی لیے آپؐ کے معمول میں بہت کم فرق پڑا۔

نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خشوع وخضوع اور خشیت کی یہ کیفیت ہوتی کہ آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور آپؐ کے سینۂ مبارک سے ہانڈی کے ابلنے یا چکی کے چلنے کی سی آواز نکلتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا ... اس وقت آپؐ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے یا ہانڈی کے ابلنے کی سی آواز نکل رہی تھی اور یہ آپؐ کے گریہ (رونے) کی آواز تھی۔

(جامع ترمذی وسنن ابی داؤد)

نماز میں اکثر آپؐ پر رقت طاری ہو جاتی اور آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو جاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رات کی نماز میں کسی آیت پر پہنچ کر

آپؐ پر ایسا اثر ہوتا کہ ساری رات (نمازِ فجر تک) وہی آیت بار بار پڑھتے گزار دی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات کی نماز میں یہ آیت پڑھی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (المائدہ آیۃ ۱۱۸)

(اگر تو انہیں سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف فرما دے تو تو غالب اور دانا ہے)۔

یہ آیت پڑھتے ہی آپؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی اور آپؐ صبح تک نماز میں یہی آیت پڑھتے رہے۔ (مُسندِ احمد، مُسندِ بزّاز، ابنِ ماجہ)

رمضان المبارک کے مہینے میں حضورؐ کی عبادت کی کوئی حد و نہایت نہ رہتی۔ آپؐ معمول سے زیادہ وقت نماز اور ذکرِ الٰہی میں گزارتے۔ رمضان کے آخری عشرے میں عموماً اعتکاف میں بیٹھ جاتے اور رات بھر عبادت کرتے رہتے۔

روزہ

انبیاء علیہم السلام اور دوسرے صالحینِ اُمّت نے تقلیلِ غذا اور ترکِ غذا (روزہ) کو روحانیت کی تکمیل کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غذا کے معاملے میں ہمیشہ اعتدال سے کام لیتے تھے اور لوگوں کو بھی قدرے بھوک رکھ کر کھانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ روزے آپؐ کثرت سے رکھا کرتے تھے۔ اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ مکی زندگی میں آپؐ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے لیکن مدینہ آکر روزوں کے معاملے میں آپؐ کا طریقہ بدل گیا۔ ماہِ رمضان کے روزے سنہ ۲ ہجری

میں مسلمانوں پر فرض ہوئے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم رمضان المبارک کے فرض روزوں کے بعد دوسرے مہینوں میں بکثرت نفلی روزے رکھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا معمول تھا کہ کسی مہینے میں اتنے لگاتار روزے رکھتے کہ ہمارا خیال ہوتا کہ اب آپ روزہ نہیں چھوڑیں گے اور کسی مہینے میں آپؐ روزے چھوڑ دیتے۔ رمضان المبارک کے سوا آپؐ کسی مہینے میں پورے مہینے (مسلسل) روزے نہیں رکھتے تھے۔ میں نے آپؐ کو رمضان کے سوا ماہِ شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ شعبان کے زیادہ دنوں میں آپؐ روزہ سے ہوتے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

ہر مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو آپ اکثر روزہ رکھتے تھے۔ ان دنوں کو ایامِ بیض کہا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایامِ بیض کے روزے سفر و حضر میں کبھی نہیں چھوڑے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پیر اور جمعرات کے دن اکثر روزہ رکھتے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

ایک روایت کے مطابق حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہر مہینے میں تین دن دو پیر اور ایک جمعرات کو معمولاً روزہ رکھتے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ)

بعض روایتوں میں ہے کہ آپؐ ہر جمعہ کو بھی روزہ رکھتے تھے لیکن آپ فرماتے تھے کہ جو شخص جمعہ کے دن روزہ رکھے اسے چاہیے کہ وہ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا بھی روزہ رکھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم معمولاً عاشورہ یعنی محرّم کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھا کرتے تھے اور صحابہؓ کو بھی اس کا حکم دیتے تھے۔ حضرت جابر بن سمرہ رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

لوگوں کو عاشورہ کا روزہ رکھنے کا حکم دیتے اور اس روزہ کے رکھنے کا لوگوں سے عہد لیتے مگر جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپؐ نے ہم کو نہ اس کا حکم دیا اور نہ اس روزہ کے رکھنے سے ہمیں روکا اور نہ اس کے بارے میں ہم سے کوئی عہد لیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسلم)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے بعد شوال کی دوسری تاریخ تک چھ روزے بالالتزام رکھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے اس نے گویا تمام عمر کے روزے رکھے۔ (صحیح مسلم)

اتفاقی روزے ان روزوں کے علاوہ تھے یعنی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ گھر تشریف لاتے تو کھانے کی کوئی چیز موجود نہ ہوتی تھی۔ اس پر آپؐ روزہ کی نیت فرما لیتے۔ (سُنن ابی داؤد)

حج

قیامِ مکہ کے زمانے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حج کیے ان کی صحیح تعداد محقق نہیں ہے۔ بعض کا قیاس ہے کہ قریش معمولاً ہر سال حج کرتے تھے اس لیے آپؐ بھی ہر سال حج کرتے ہوں گے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ قیامِ مکہ کے زمانے میں آپؐ نے دو حج کیے تھے۔ ابن ماجہؒ اور امام حاکمؒ نے کہا ہے کہ آپؐ نے قیامِ مکہ کے دوران میں تین حج کیے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں آپؐ نے ۱۰ھ ہجری میں صرف ایک حج کیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

حج کے علاوہ آپؐ نے ہجرت کے بعد چار عمرے بھی ادا کیے۔

(سیرۃ النبیؐ)

زکوٰۃ

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جود و سخا اور ایثار و کرم کے بحرِ بے کنار تھے جس سے ہر حاجت مند بقدرِ ظرف سیراب ہوتا تھا۔ بعثت سے پہلے بھی آپؐ کی ذاتِ گرامی یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور حاجت مندوں کے لیے ایسا چشمۂ فیض تھی جس سے وہ خوب خوب سیراب ہوتے رہتے تھے اور بعثت کے بعد تو آپؐ کے ایثار و کرم اور فیاضی کی کوئی حد ہی نہ رہی۔ آپؐ زر و مال یا کوئی دوسری شے اتنی مقدار میں اپنے پاس رہنے ہی نہ دیتے تھے جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی۔ جو کچھ آتا آپؐ مستحقین میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ اس کی تفصیل اسی کتاب میں مختلف عنوانات (حضورؐ کی شانِ جود و سخا، حضورؐ کی شانِ ایثار، حضورؐ کی کفالتِ عامہ وغیرہ) کے تحت دیکھی جا سکتی ہے۔

ذکرِ الٰہی

قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی میں مومن کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ دُکھ اور سُکھ، تنگدستی اور فارغ البالی، بیماری اور تندرستی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر شاکر رہتا ہے اور اس کی حمد و ثناء اور تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا ہے ہوشمند لوگ (اللہ کے بندے) اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ سورۂ نور میں ارشاد ہوا ہے کہ ان نیک بندوں کو اشغالِ دُنیوی اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔ سورۂ عنکبوت میں فرمایا گیا ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ یعنی یقین کرو کہ اللہ کا ذکر ہر چیز سے بزرگ تر ہے۔ اسی طرح متعدد احادیثِ نبوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز سے لے کر جہاد تک تمام اعمالِ صالحہ کی روح اور جان اللہ کا ذکر ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذاتِ گرامی کو اللہ تعالیٰ نے تمام اُمّت کے لیے قیامت تک نمونہ بنایا اس لیے آپؐ ہر لحظہ اور ہر لمحہ اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

سُنَن ابی داؤد میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہمہ وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بے شمار احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ـــــــ اٹھتے بیٹھتے یا کھاتے پیتے وقت، گھر یا مسجد میں داخل ہوتے وقت، سفر شروع کرتے وقت یا سفر سے واپس آتے وقت، نیا چاند دیکھ کر یا نئے کپڑے پہنتے وقت ـــــ اسی طرح سورج گرہن ہو یا چاند گرہن ہو، کوئی خوشی ہو یا غمی، کوئی آزمائش ہو یا دشمنوں پر فتح حاصل ہو غرض ہر موقع پر آپؐ کی زبانِ مبارک پر اللہ کا ذکر ہوتا تھا۔ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ رات کو کاشانۂ اقدس پر پہرہ دیا کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تسبیح و تہلیل کی آواز سُنتے سُنتے تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی (مُسندِ احمد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّم اکثر یہ دعا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے ـــ:
رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ تُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْر۔ ہم نے گِنا تو ایک نشست میں سَو سَو دفعہ یہ الفاظ آپؐ کی زبان سے ادا ہوئے۔

(سیرۃ النّبیؐ بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ و دارمی)

کتبِ حدیث میں کثرت سے ادعیۂ ماثورہ منقول ہیں جو حضورؐ مختلف مواقع پر پڑھا کرتے تھے۔ میدانِ جہاد میں بھی آپؐ کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے تھے اور مجاہدین کو بھی ایسا کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ مختصر یہ کہ ذکرِ الٰہی آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کا جُزوِ لاینفک تھا۔

طبِّ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

بیماری، طِبّ اور علاج معالجہ انسانی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جس سے کسی صورت میں صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے بنی نوعِ انسان کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اس لیے اس نے بیماری اور علاج معالجہ کے لیے راہِ عمل متعیّن کردی ہے۔ چونکہ قرآن حکیم کی رُو سے دانائے کونین رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ ہی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے اس لیے لامحالہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ حضورؐ پُرنور کا طرزِ عمل بیماری اور علاج معالجہ کے بارے میں کیا تھا۔ آپؐ کی حیاتِ طیّبہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ

(ا) بیماری کو منجانب اللہ سمجھتے تھے۔

(ب) اس کو مسلمان کے گناہوں کا کفّارہ تصوّر فرماتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ مومن کو اگر ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ اس کے کسی گناہ کا کفّارہ بن جاتا ہے۔

(ج) اس کے علاج کے لیے دعا اور دونوں کو ضروری سمجھتے تھے۔

(د) خود بھی لوگوں کو اپنے حکیمانہ مشوروں سے مستفیض فرماتے تھے اور ان کو طِبّ میں مہارت اور پیشہ ورانہ صلاحیتیں رکھنے والے طبیبوں کی طرف بھی رجُوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ طبی علاج کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس قدر اہمیت تھی کہ مدینہ منوّرہ میں

مسجدِ نبوی کی تعمیر کے بعد آپؐ کے حکم سے اس کے صحن میں ایک خیمہ نصب کیا گیا جس میں مریضوں، زخمیوں کو لٹانے کا انتظام کیا گیا اور اس کو شفاخانہ قرار دے کر ایک انصاری صحابیہ حضرت رُفَیدہ رضی اللہ عنہا کو اس کا انچارج بنایا گیا۔ یہ خاتون جرّاحی میں بہت مہارت رکھتی تھیں۔ کئی موقعوں پر حضورؐ نے علیل صحابہؓ کا علاج اس زمانے کے نامور طبیب حارث بن کلدہ سے کرایا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اگر کسی صحابی کے زخم یا پھوڑے (غیر طبعی ورم) کو داغنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اسے داغا۔

(۷) علاج کے لیے حرام چیزوں کے استعمال سے منع فرماتے تھے۔

یہاں ہم حضورِ پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات عالیہ اور عہدِ رسالت کے کچھ واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق بیماریوں اور ان کے علاج معالجہ سے ہے:

(۱) کوئی مرض لا علاج نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر مرض کے لیے دوا ہے۔ جب دوا کا اثر بیماری کی ماہیت کے مطابق ہو تو اللہ تعالیٰ کے اِذن سے شفا ہو جاتی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے جس مرض کو اتارا اس کی شفا بھی اتاری ہے۔

(۲) بیماری کا علاج کرنا ضروری ہے۔

مُسندِ احمدؒ بن حنبل میں حضرت اسامہؓ بن شریک سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ کچھ اعرابی آئے اور کہا،

یا رسول اللہ، کیا ہم دوا استعمال کریں؟ آپؐ نے فرمایا، اے اللہ کے بندو! دوا استعمال کرو کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جس کی دوا اللہ عزّوجلّ نے نہ رکھی ہو سوائے ایک بیماری کے۔ ان لوگوں نے پوچھا، اے اللہ کے رسولؐ، وہ کون سی بیماری ہے، فرمایا، کھوسٹ بڑھاپا۔

(۳) نیم حکیم خطرۂ جان

ابو داؤدؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت عمروؓ بن العاص سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو شخص علم طِبّ سے ناواقف ہو اور کسی کا علاج کرے تو وہ اس کا (نقصان پہنچ جانے کی صورت میں) ذمہ دار ہے۔

(۴) طبیب حاذق سے علاج کراؤ اور پرہیز کرو۔

رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بیمار کو طبیبِ حاذق سے علاج کرانے کی ہدایت فرماتے اور اس کو پرہیز کرنے کا حکم دیتے۔ (زاد المعاد۔ابنِ قیمؒ)

(۵) معدہ کی خرابی تمام امراض کی جڑ ہے۔

شعب الایمان (بیہقیؒ) میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا، معدہ بدن کا حوض ہے۔ سب رگیں اس میں ملتی ہیں۔ اگر معدہ درست ہے تو سب رگیں درست ہیں معدہ خراب ہے تو سب رگیں خراب۔

(۶) حرام اور نجس چیزوں سے علاج نہ کرو

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیماری بھی پیدا کی ہے اور بیماری کی دوا بھی اور ہر بیماری کی ایک دوا مقرر فرمائی ہے۔ تم دوا سے علاج کرو لیکن حرام چیز سے علاج نہ کرو۔ (ابو داؤد)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خبیث (نجس) دوا سے علاج کرنے کو منع فرمایا ہے۔ (ترمذی - ابن ماجہ)

حضرت عبدالرحمٰن بن عثمانؓ سے روایت ہے کہ ایک طبیب نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ علیہ وسَلَّم سے دریافت کیا کہ اگر مینڈک کو دوا میں شامل کرلیا جائے تو کیا حکم ہے۔ حضورؐ نے مینڈک کو مارنے اور دوا میں شامل کرنے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد)

(۷) بسیار خوری سے بچو اور ہمیشہ کچھ بھوک رکھ کر کھاؤ

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ مومن ایک انتڑی سے کھاتا ہے اور کافر سات انتڑیوں سے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ فرماتے سنا کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کافی ہے اور دو آدمیوں کا چار کے لیے اور چار آدمیوں کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

"زادالمعاد" میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کو کم غذا کھانے کی رغبت دلایا کرتے۔ فرمایا کرتے کہ معدے کا ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پانی کے لیے اور ایک حصہ خود معدے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔

(۸) آشِ جو کا حریرہ مریضوں کے لیے عمدہ غذا ہے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ حریرہ (تلبینہ) بیمار کے دل کو سکون و راحت بخشتا ہے اور بعض غموں کو دور کرتا ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے گھر والوں میں سے کسی کو بخار آجاتا

تو آپؐ حریرہ (تلبینہ) تیار کرنے کا حکم دیتے۔ چنانچہ حریرہ تیار کیا جاتا پھر آپ اسے پینے کا حکم دیتے اور آپؐ یہ فرماتے کہ حریرہ غمگین دل کو قوت دیتا ہے اور بیمار کے دل سے رنج اور بیماری کو دُور کرتا ہے جس طرح تم میں سے (اے عورتو) کوئی میل کو پانی کے ساتھ چہرے سے دور کرتا ہے۔

(تلبینہ) یا حریرہ آش جو سے بنایا جاتا ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ جَو کا بے چھنا آٹا لے کر اس کو دودھ میں پکایا جائے جب پکنے پر آئے تو اس میں تھوڑا سا شہد ملا دیا جائے پھر اس کو ٹھنڈا کر کے مریض کو پلایا جائے۔ آش جو کی طبی افادیت تمام اطباء اور ڈاکٹروں کے نزدیک مسلّم ہے۔

(۹) شہد میں شفا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا، دو شفا دینے والی چیزوں کو اپنے اوپر لازم کرو۔ ایک تو شہد اور دوسرے قرآن۔ (ابنِ ماجہ۔ مسندِ بیہقی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہر مہینہ میں تین دن صبح کے وقت شہد چاٹ لیا کرے وہ پھر کسی بڑی مصیبت و بلا میں مبتلا نہیں ہوتا۔

(ابنِ ماجہ۔ بیہقی)

صحیحین میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یارسول اللہ! میرا بھائی استطلاقِ بطن (اسہال) میں مبتلا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا اسے شہد پلاؤ۔ چنانچہ وہ شہد پلا کر پھر حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں نے شہد پلایا مگر اس سے میرے بھائی کو اور زیادہ اسہال آنے لگے ہیں مگر حضورؐ

نے پھر شہد پلانے ہی کا حکم دیا۔ حتیٰ کہ تین دفعہ ایسا ہی ہوا۔ پھر جب اس نے چوتھی بار آکر یہی کہا کہ میں نے شہد پلایا ہے مگر اس سے اسہال بڑھتے ہی جاتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ چنانچہ اس نے پھر شہد پلایا اور مریض کو شفا ہو گئی۔

(۱۰) مہندی کئی بیماریوں کا علاج ہے۔

حضرت اُمِّ رافعؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو کوئی پھنسی یا پھوڑا ہوتا تھا یا کوئی کانٹا لگ جاتا تھا تو آپؐ اس پر مہندی کا لیپ کیا کرتے تھے۔ (ترمذی)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے سامنے کسی نے پیٹ کے درد کی شکایت بیان کی تو آپؐ نے اس سے فرمایا، پیٹ پر مہندی کا لیپ کر۔

(ابوداؤد)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے سر میں جب کبھی درد ہوتا تھا تو آپؐ سر پر مہندی کا لیپ کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے، بے شک یہ فائدہ کرے گی اللہ کے حکم سے۔ (ابنِ ماجہ)

مہندی یا حنا خون صاف کرتی ہے۔ یرقان، سنگ گردہ اور عسر البول کے لیے مفید ہے۔ جلدی بیماریوں یعنی جذام، آتشک اور خارش وغیرہ میں مفید ہے۔ معدہ، جگر اور تلی وغیرہ کی بیماریوں میں نفع دیتی ہے۔ اس کا لیپ آبلے اور پھوڑے کی جلن کو مفید ہے۔ مہندی سُدّوں اور رگوں کے منہ کو کھول دیتی ہے اس لیے پیٹ کے درد میں اس کا لیپ مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ فاسد مادوں کو باہر نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ دردِ سر اور دردِ نزالۂ میں بھی اس کا لیپ مفید ہے حضورؐ کا اپنے موئے مبارک مہندی سے رنگنا ثابت ہے اس لیے علماء

نے مہندی کے خضاب کو جائز قرار دیا ہے۔

(۱۱) بچھو کے کاٹے کا علاج نمک اور معوذتین سے کرو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے میں بچھو نے کاٹ کھایا۔ آپؐ نے بچھو کو جوتی سے مار ڈالا اور فرمایا کہ یہ بچھو بھی کیسی ملعون چیز ہے کہ یہ نمازی اور غیر نمازی کو نہیں چھوڑتا (یا نبی یا غیر نبی کے الفاظ استعمال فرمائے، یہ شک راوی کی جانب سے ہے) پھر آپؐ نے نمک اور پانی منگوا کر ایک برتن میں ڈالا اور یہ پانی اپنی انگلی پر جہاں بچھو نے کاٹا تھا ڈالنے لگے، ساتھ ہی آپؐ معوذتین (قرآن مجید کی آخری دو سورتیں) پڑھتے جاتے تھے۔

(شعب الایمان بیہقی)

نمک طعام دوسرے درجہ میں گرم اور خشک ہے۔ رطوبات متعفنہ کو تحلیل اور خشک کرتا ہے۔ جس عضو پر اس کا لیپ کیا جائے۔ اس عضو کے اجزاء کو سکیڑ کر اس کے مسامات کو وسیع کرتا ہے۔ مسامات کے اندر رطوبات کو تحلیل کرتا ہے۔ گرم پانی میں نمک گھول کر بچھو کے کاٹے ہوئے عضو کو اس پانی میں رکھیں تو اس سے زہر تحلیل ہوتا ہے اور درد موقوف ہو جاتا ہے۔

(۱۲) جو اور چقندر بیماری کے بعد کی کمزوری کو دور کرتے ہیں

حضرت ام المنذرؓ بنت قیس انصاریہ سے روایت ہے کہ میرے ہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی تھے۔ حضرت علیؓ ابھی ابھی بیماری سے اٹھے تھے۔ ہمارے ہاں کھجوروں کے خوشے لٹک رہے تھے۔ حضورؐ اٹھ کر ان میں سے کھجوریں تناول فرمانے لگے۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی اٹھ کر کھجوریں کھانی شروع کیں مگر حضورؐ نے ان سے کہا، تم ابھی بہت کمزور ہو۔ چنانچہ حضرت علیؓ رک

گئے۔ پھر میں نے جو اور چقندر پکا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کیے۔ پس آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، اس میں سے کھاؤ کیونکہ یہ تمہارے لیے مفید ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

(۱۳) آشوبِ چشم میں کھجور کھانا مضر ہے

حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ میں ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے سامنے روٹی اور کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے مجھے بھی کھانے کی دعوت دی پس میں کھجوریں کھانے لگا۔ جس پر حضورؐ نے فرمایا، کیا تم اس حالت میں بھی کھجوریں کھاتے ہو جب کہ تمہیں آشوبِ چشم ہے۔ (زاد المعاد)

(۱۴) شدید بیماری میں حاذق طبیب کو بلاؤ۔

۱۰ ہجری میں رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ مکہ پہنچ کر وہ سخت بیمار ہو گئے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شدید علالت کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا، طبیب حارث بن کلدہ کو بلاؤ۔ حارث بن کلدہ ثقفی بڑا نامور طبیب تھا اور "طبیب العرب" کے لقب سے مشہور تھا۔ حارث بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو دیکھتے ہی کہنے لگا، خطرہ کی کوئی بات نہیں، کھجور اور السی کے آٹے کا حریرہ بنا کر مریض کو پلایا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور حضرت سعدؓ صحت یاب ہو گئے۔ (سیرۃ سعدؓ بن ابی وقاص)

ایک اور روایت میں ہے کہ حارث بن کلدہ نے حضرت سعدؓ کے لیے فریقہ تیار کرنے کی ہدایت کی یعنی کھجور، جَو کا دلیہ اور میتھی پانی میں ابال کر اس میں شہد ملا کر (مریض کو نہار منہ) پلایا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نسخہ پسند فرمایا۔ اس کے استعمال سے مریض کو شفا ہو گئی۔ (طبِ نبوی اور جدید سائنس)

(۱۵) آنکھوں میں سرمہ لگایا کرو

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سرمہ آنکھوں میں ڈالا کرو کہ وہ آنکھ کی روشنی کو تیز کرتا ہے اور پلکیں بھی اگاتا ہے۔ (شمائل ترمذی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، تم سوتے وقت سیاہ سرمہ ضرور لگایا کرو۔ بے شک یہ نگاہ کو روشنی بخشتا ہے اور پلکوں کے بال اگاتا ہے۔

(ابن ماجہ)

(۱۶) انجیر بواسیر اور نقرس کے لیے مفید ہے

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی نے انجیر سے بھرا ہوا طباق (تھال) ہدیۃً پیش کیا۔ آپؐ نے ہمیں فرمایا، کھاؤ۔ ہم نے اس میں سے کھایا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا، اگر کوئی پھل جنّت سے زمین پر آسکتا ہے تو میں کہوں گا یہی وہ ہے کیونکہ بلاشبہ یہ جنّت کا میوہ ہے اس میں سے کھاؤ کہ یہ بواسیر کو ختم کر دیتی ہے اور نقرس (جوڑوں کے درد) میں نفع بخش ہے۔ (ابو بکر الجوزی)

(۱۷) کھنبی کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے

حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھنبی مَن میں سے ہے۔ اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی، مسند احمد)

یہی روایت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔

(۱۸) زیتون کے تیل سے علاج کرو

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زیتون کے تیل سے علاج کرو۔ اسے کھاؤ اور لگاؤ کیونکہ یہ ایک مبارک درخت سے ہے۔ (بیہقی۔ ابن ماجہ)

حضرت علقمہؓ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہارے لیے زیتون کا تیل موجود ہے اسے کھاؤ اور بدن پر مالش کرو کیونکہ یہ بواسیر میں فائدہ دیتا ہے۔ (ابن الجوزیؒ، ذہبیؒ)

ایک اور روایت میں بواسیر کی جگہ باسور (مقعد کا زخم) ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، زیتون کا تیل کھاؤ اور اسے لگاؤ (یعنی اس کی مالش کرو) کیونکہ اس میں ستر بیماریوں سے شفا ہے، جن میں ایک کوڑھ ہے۔ (ابونعیمؒ)

(۱۹) تربوز کھجور کا اور کھجور تربوز کی مصلح ہے

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تازہ پکی ہوئی کھجوروں کے ساتھ تربوز کھایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ کھجور کی گرمی کو تربوز کی ٹھنڈک مار دیتی ہے اور تربوز کی ٹھنڈک کو کھجور کی گرمی مار دیتی ہے۔ (ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد)

(۲۰) بچوں کے حلق کی بیماری کا علاج قسط سے کرو

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اپنے بچوں کو حلق کی بیماری میں (گلے پڑنے پر) ان کا گلا دبا کر اذیت نہ دو بلکہ تم قسط (گوٹھ یا میٹھی کوٹھ) استعمال کرو۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے عورتو! تمہارے لیے افسوس کا مقام

ہے کہ تم اپنی اولاد کو خود قتل کرتی ہو۔ اگر کسی کے بچے کے گلے میں سوزش ہو جائے یا سر میں درد ہو جائے تو وہ قسط ہندی کو لے کر پانی میں رگڑے اور بچے کو چٹادے۔ (مستدرک حاکم۔ الشافی)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم ذات الجنب (پلورسی یا نمونیہ) کا علاج قسط بحری اور زیتون کے تیل سے کریں۔

(۲۱) کلونجی موت کے سوا ہر بیماری کا علاج ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ کالے دانے میں ہر بیماری سے موت کے سوا شفا ہے اور کالے دانے (سے مراد) شونیز (کلونجی) ہے۔

(صحیحین، مسند احمد و ابن ماجہ)

(۲۲) بہی (سفرجل) امراض قلب میں مفید ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سفرجل (بہی) کھاؤ کیونکہ وہ دل کے دورے کو ٹھیک کرکے سینہ سے بوجھ اتار دیتا ہے۔ (ابونعیم۔ ابن السنی)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سفرجل (بہی) کھانے سے دل پر سے بوجھ اتر جاتا ہے۔ اس کو نہار منہ کھانا چاہیئے۔ (کنز العمال)

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سفرجل (بہی) کھاؤ کہ یہ دل کے دورے کو ٹھیک کرتا اور دل کو مضبوط کرتا ہے۔ (مسند فردوس)

ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ سفرجل دل کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ (ذہبی)

(۲۳) سناء بے شمار بیماریوں کا علاج ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کسی چیز کے ذریعے موت سے شفا ہو سکتی تو وہ چیز سناء ہوتی۔ پھر فرمایا، تم سناء کو لازم پکڑو کیونکہ وہ موت کے سوا ہر مرض کے لیے شفا دینے والی ہے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

سناء ایک مشہور بوٹی ہے۔ جو ہر خلط کی مسہل ہے اور پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتی ہے۔ یہ صفراء، بلغم اور سودا کو بدن سے خارج کرتی ہے۔ اس کا مسہل بے شمار فوائد کا حامل ہے اور بے ضرر ہے۔ یہ دماغ کا تنقیہ کرتی ہے اور پرانے دردِ سر، دمہ، قولنج، عرق النساء، وجع المفاصل، جنون، مرگی، ذات الجنب (نمونیہ) نقرس اور دردِ شقیقہ کو نافع ہے۔ سناء میں ایک ایسا جوہر بھی پایا جاتا ہے جو خون کو صاف کرتا ہے۔

(۲۴) رات کا کھانا مت چھوڑو

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رات کا کھانا مت چھوڑو اس سے بڑھاپا جلد آ جاتا ہے۔

(کتاب الطب ابونعیم)

حافظ ابن قیمؒ نے "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کے کھانے کا حکم دیتے خواہ مٹھی بھر کھجوریں ہی کیوں نہ ہوں اور فرماتے کہ رات کا کھانا چھوڑنا بڑھاپا جلد لاتا ہے۔

خالی پیٹ ہونے اور بھوک کی حالت میں سو رہنے سے بدن کی رطوبتیں تحلیل ہونے لگتی ہیں جن کا ذخیرہ بدن میں ہر وقت مناسب مقدار میں رہنا حفظِ صحت اور بقائے قوت کے لیے لازمی ہے۔

(۲۵) ضروری ہو تو عملِ جراحی اور داغنے سے علاج کرو

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ حضورؐ کے ساتھ ایک بیمار کی عیادت کے لیے گیا۔ اس شخص کی کمر میں کہیں ورم تھا۔ لوگوں نے

حضورؐ کی خدمت میں عرض کی کہ اس میں پیپ پڑ چکی ہے۔ پس آپؐ نے فرمایا، اس میں شگاف دے دو۔ چنانچہ میں نے اس شخص (کے ورم) کو شگاف دے دیا۔ (زاد المعاد جلد دوم)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے ایک مریض کے بارے میں اس کے معالج کو حکم دیا کہ وہ مریض کے پیٹ میں شگاف دے۔ اس پر حضورؐ سے پوچھا گیا، اے اللہ کے رسولؐ کیا اس کے لیے طب میں بھی کوئی چیز مفید ہے۔ آپؐ نے فرمایا، جس ذات نے بیماریاں نازل کی ہیں اسی ذات نے جس جس چیز میں چاہا شفاء بھی رکھی ہے۔

"زاد المعاد" میں ہے کہ سید الاوس حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غزوۂ احزاب میں رگِ اکحل میں تیر لگا اور ان کا زخم بگڑ گیا۔ حضورؐ نے اس زخم کو خود اپنے دستِ مبارک سے داغا۔ جب یہ زخم پھول گیا تو حضورؐ نے اسے دوبارہ داغ دیا لیکن حضرت سعدؓ کا وقتِ آخر آ پہنچا تھا۔ ایک بکری کا کھُر لگنے سے یہ زخم پھٹ گیا اور حضرت سعدؓ نے وفات پائی۔ علاج کے لیے حضرت سعدؓ کو مسجد نبوی کے صحن میں نصب حضرت رُفیدہ انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خیمے میں رکھا گیا۔ وہ جراحی میں بہت مہارت رکھتی تھیں۔

ترمذی شریف میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت اسعدؓ بن زُرارہ حلق کے شدید درد میں مبتلا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر کو خود اپنے دستِ مبارک سے داغا۔

ادیر ہم نے صرف چند مثالیں دی ہیں جن سے حفظانِ صحت، بیماری اور علاج معالجے کے سلسلے میں دانائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امن و اخوت کے داعیٔ اعظم ﷺ

کہا جاتا ہے کہ اس وقت تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ دنیا ترقی کر کے اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکی ہے۔ یہاں تک کہ کرۂ ارض کے بسنے والے، سیارگانِ فلک سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ مادی نقطۂ نگاہ سے عصر حاضر کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے لیکن دوسری طرف جب ہم اخلاقی اور روحانی اقدار کی کسوٹی پر عصر حاضر کی تہذیب و تمدن کو پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج کل انسان نہایت تیزی کے ساتھ ایک ایسے قعرِ مذلت میں گرتا جا رہا ہے جس کی تہہ میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بلاشبہ دنیا وی آسودگیوں اور دولت کی ریل پیل ہے لیکن انسان کی روح سکون سے نا آشنا ہے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ اضطراب اور بے یقینی کی ہمہ گیر کیفیت ہر کہ دمہ پر طاری ہے۔ شر پسندی اور دہشت گردی کی گرم بازاری ہے۔ امن و امان کرۂ ارضی سے مفقود ہو چکا ہے۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں اس قدر اسلحہ اور تخریب کاری کا سامان بنا چکا ہے کہ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے مختلف قوموں اور علاقوں میں بدامنی اور کشت و خون کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ بڑی طاقتوں کے پاس ہولناک اسلحہ اور آلاتِ تخریب کاری کے جو ذخیرے ہیں وہ امنِ عالم کے لیے ہر وقت خطرہ بنے ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر منافقت، ریاکاری، ملمع سازی اور "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصولوں کو روا رکھا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ سائنسی آلاتِ حرب کی بے دردی نے دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے، تہذیب حاضر نے دنیا کو اور تو بہت کچھ

دیا ہے لیکن امن وسکون سے محروم کر دیا ہے۔

تاریخ عالم پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اس سے پہلے بھی کرۂ ارض پر کئی دور ایسے آئے جب اس کے باشندوں نے ترقی اور دنیوی کامرانیوں کی انتہائی حدوں کو چھو لیا تھا لیکن ان کی بے راہروی اور کردار و عمل کے فقدان نے انہیں ایسی بھیانک تباہی سے دوچار کیا کہ آج اُن کے قصّے اور آثار مرقع عبرت بنے ہوئے ہیں۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے دُنیا کئی بار بننے اور بگڑنے کے بعد ایک ایسے مقام پر کھڑی تھی کہ اس کی اخلاقی زندگی پر موت طاری ہو چکی تھی اور وہ انسانی مجد و شرف سے محروم ہو چکی تھی انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ کہیں رنگ اور نسل کے نام پر معرکہ آرائیاں تھیں تو کہیں وطن اور مذہب کے نام پر انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ کہیں ذات پات کی تفریق سے شرف انسانیت کی تذلیل کی جا رہی تھی تو کہیں ہوسِ ملک گیری میں مبتلا طالع آزماؤں نے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یکایک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور ریگ زار عرب میں محمّد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ظہور ہوا۔ یہ ظہور گویا ایک ابر رحمت تھا جو انسانیت کی سوکھی ہوئی کھیتی پر جھوم جھوم کر برسا اور اس کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ اس ظہور کا مقصد صرف یہ تھا کہ خدائے واحد کا نام بلند کیا جائے، بنی نوع انسان کو اس کے خود ساختہ معبودوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ اس کے فضائل اخلاق کی تکمیل کی جائے اور شر و فساد کو مٹا کر ہر طرف امن و آشتی کے پھول کھلائے جائیں۔ یہ جناب محمّد مصطفٰی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اُسوۂ حسنہ اور آپؐ کے فدائیوں کا حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار ہی تھا کہ مسلمان ایک قلیل سی مدّت میں سیاسی اور تمدّنی لحاظ سے قریب قریب تمام دنیا پر چھا گئے اور پھر صدیوں تک نہ صرف ان کے جاہ و جلال کا

پرچم لاکھوں مربع میل پر لہراتا رہا بلکہ وہ دنیا بھر کو تہذیب و اخلاق کا درس بھی دیتے رہے ۔ الحمد للہ کہ آج بھی مسلمان بہت سے آزاد ملکوں کے مالک ہیں اور ان کی تعداد بھی قرن اوّل کے مسلمانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے لیکن آج کے مسلمان اور قرن اوّل کے مسلمان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے ۔ قرن اوّل کا مسلمان قرآنی اخلاق کی تصویر اور رسول عربی ؐ کے اُسوۂ حسنہ کا سچا عاشق اور پیروکار تھا ۔ اس کی ہیبت سے دشمنان حق لرزتے تھے لیکن اُس کے حُسنِ کردار کو دیکھ کر پتھر بھی موم ہو جاتے تھے ۔ آج کے مسلمان کا کردار و عمل دوسروں کو کیا متاثر کرے گا ، وہ خود غیروں کی تہذیب ' تمدن اور اخلاق کو اپنے لیے مشعل راہ بنا بیٹھا ہے ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ مسلمان بھی قلب و روح کے اُس سکون سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو بہت بڑا انعام ربانی ہے ۔ ایسا انعام کہ جس میں دین اور دنیا کی سعادتیں شامل ہیں ۔ آئیے سوچیں کہ مسلمان جس کا منصب یہ تھا کہ رنگ نسل اور عصبیت کے بتوں کو پاش پاش کر دے ، دشمن کے مقابلے میں بنیانِ مرصوص بن جائے ۔ امن و اُخوت کا داعی بن کر دنیا کو اسلام کا حقیقی جلوہ دکھا دے اور اس کی بھٹکتی ہوئی روح کو اطمینانِ قلب سے آشنا کر دے ، کیوں اپنے مقام اور منصب سے گر چکا ہے ؟

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ۔ (سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۲)

(اور جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا اس کو نہ کسی طرح کے ظلم و ستم کا خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کی حق تلفی کا ۔)

اس ارشادِ الٰہی کی روشنی میں غور کیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ باوجود ساری دُنیا میں پھیلے ہوتے کے ہم آج کل جس ناقابلِ رشک صورتِ حال

سے دوچار ہیں اس کے کیا اسباب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور وعدہ تو برحق ہے اس لیے ہم اپنے ادبار اور محرومی کی توجیہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں کہ ہم میں ایمانِ محکم اور کردار و عمل کا فقدان ہے اور ہم نے ہادیٔ برحق محسنِ انسانیت رحمتِ دو عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعلیمات کو فراموش کر ڈالا ہے۔ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ گرامی بنی نوعِ انسان کے لیے مجسّم خیر و برکت اور رحمت و شفقت تھی۔ آپؐ سے بے نیاز ہو کر فلاح یا مغفرت کی امید کرنا محض خام خیالی بلکہ گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آپؐ کو "رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ" (سارے جہانوں کے لیے رحمت) "رَؤُفٌ رَّحِیْم" (نہایت شفقت کرنے والا مہربان) سراجِ منیر (روشن چراغ یا سورج) بشیر (خوشخبری دینے والا) اور نذیر (اللہ سے ڈرانے والا) کہہ کر پکارا ہے اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو اہلِ ایمان کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)

یعنی (اے اہلِ ایمان بلاشبہ تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی ذات میں بہترین نمونہ (طریقِ زندگی) موجود ہے)

سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرتِ طیبہ کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیں، وہ اتنا پاکیزہ، جامع اور ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے کہ تحریر و تقریر کے ذریعے اس کا صحیح نقشہ کھینچنا امرِ محال ہے۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر تھی، قرآن پاک کے احکام و منشاء اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے عمل میں سرِ مو فرق نہ تھا۔ آپؐ نے کرۂ ارض پر جو انقلاب برپا فرمایا وہ یکسر قرآنی انقلاب تھا اور جو نظام آپؐ نے سرزمینِ عرب میں قائم فرمایا وہ یکسر قرآنی نظام تھا۔ آپؐ کے انقلاب کا مقصد اذہان و نظریات کی تطہیر تھا اور اس تطہیر کا دائرہ

کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہ تھا بلکہ یہ آفاقی تھا اور روئے زمین کے تمام لوگوں پر محیط تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوعِ انسان کو بالعموم اور اہل ایمان کو بالخصوص اَمن و اُخوّت کی جو دعوت و تعلیم دی وہ آپؐ کی حیاتِ اقدس کا ایک ایسا درخشاں پہلو ہے جس کے فیوض و برکات کی وسعتوں کو دیکھ کر انسان وَرطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ مؤرخین نے حضورؐ کی بعثت سے پہلے کے عرب کی سیاسی اور اخلاقی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باہمی کشت و خون، تشتت و افتراق اور دوسرے گوناگوں رذائل نے اہلِ عرب کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا اگر چند سے اور یہی حالت رہتی تو قانونِ قدرت کے مطابق ان کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل کیا اور ان میں ایک ایسے داعیٔ امن و اُخوّت کو بھیج دیا جنہوں نے ایک طرف تو مفاسد کا قلع قمع کیا اور لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی اور دوسری طرف متحارب قبائل کو باہم شیر و شکر کر دیا اور اہل ایمان میں ایسا جذبۂ اُخوّت پیدا کیا کہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے۔ وہی عرب جس میں امن و امان نام کی کسی شے کا وجود تک نہ تھا وہاں امن و آشتی کی ایسی بہار آتی ہے کہ سنسان وادیوں گھاٹیوں اور صحراؤں میں کوئی آدمی تن تنہا بیسیوں میل تک سونا اچھالتا چلا جاتا ہے اور کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جہاں "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا" (سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو) کی تلقین فرماتا ہے وہاں اپنا یہ احسان بھی یاد دلاتا ہے کہ (بعثتِ نبوی سے) پہلے وہ کیا تھے اور پھر (بعثتِ نبوی کے بعد) اللہ کے فضل و کرم سے وہ کیا بن گئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ج وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۔ (آل عمران ۔ آیۃ ۱۰۳)

(اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل وکرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا)

یہاں اگر کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت امن و اخوت صرف اہل عرب کے لیے تھی یا اپنے زمانے ہی کے لیے تھی تو یہ بات بداہتہً غلط ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف اہل عرب کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپؐ کی تعلیم وہدایت وقتی یا کسی خاص زمانے کے لیے نہیں تھی بلکہ دائمی اور اَبَدالآباد تک کے لیے تھی۔ آپؐ جس دین کے داعی تھے وہ توسراسر امن وسلامتی کا علمبردار تھا کیونکہ یہی ایمان واسلام کی روح ہے۔ امن وسلامتی کے بغیر ایمان اور اسلام کے الفاظ جسد بے روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رحمۃ للعالمینؐ ہونے کی حیثیت سے حضورؐ نے جہاں معاشرت، معیشت اور تہذیب و تمدن کے گیسو سنوارے وہاں اُمورِ ریاست وسیاست کو بھی اپنے ناخنِ تدبیر وحکمت سے سلجھایا اور امن واخوت کے ایسے اصول وضع کر دیئے جن کی پابندی دُنیا اور آخرت دونوں جگہ فلاح کی ضامن ہے۔ اگر بنی نوعِ انسان آج بھی ان اصولوں پر عمل پیرا ہو جائے تو یہ دُنیا گہوارۂ بہار بن جائے جس میں ہر شخص مسرور و مطمئن ہو۔

اسلام میں امن کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اسے خدائے واحد پر ایمان لانے اور شرک نہ کرنے کا صلہ ٹھہرایا گیا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔

(الانعام آیۃ ۸۲)

(جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ آلودہ نہیں کیا، حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہِ ہدایت پر بھی وہی ہیں)

سورۂ قریش میں قریش سے فرمایا گیا ہے۔

فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔ (قریش۔ آیۃ ۳-۴)

(پس ان (قریش) کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا)

گویا امن بہت بڑا انعامِ ربی تھا جو اللہ تعالیٰ نے قریش کو عطا کیا حالانکہ اس زمانے میں پورے عرب میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں کیونکہ ہر وقت ان کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی غارت گر گروہ اچانک اس پر چھاپا نہ مار دے۔ کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے کیونکہ راستے میں اس پر کسی بھی جگہ ڈاکہ پڑ سکتا تھا لیکن قریش مکہ میں بالکل محفوظ تھے۔ نہ ان کو مکہ پر کسی دشمن کے حملے کا خطرہ تھا اور نہ ان کے قافلوں کو کوئی چھیڑتا تھا۔

اسلام میں انسانی جان کی حرمت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ کسی ایک انسان کے ناحق قتل کو ساری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۖ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۔ (المائدہ - آیۃ ۳۲)

(جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔)

غرض قرآن پاک کی روشنی میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے قیام کا اہم مقصد امن وسلامتی ہے اور ساتھ ہی اہل ایمان میں باہمی اُخوّت اور محبّت کا فروغ بھی۔

محسنِ انسانیت خیر الخلائق صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بنی نوع انسان اور اُمّتِ مُسلمہ کو امن وآشتی اور اُخوّت باہمی کی جس بلیغ انداز میں دعوت دی اور ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو جس طرح درست کیا وہ عزم واستقامت اور جہد وسعی کی ایک ایمان افروز داستان ہے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ ہم اس سلسلے میں حضورؐ کے طریق کار اور اُن زرّیں اصولوں کا اجمالی ذکر ضرور کریں گے جن کی بدولت فتنہ وفساد اور بدامنی کی آماجگاہ بنی ہوئی سرزمین عرب خدا کے نور سے جگمگا اٹھی۔ ہر طرف امن وسکون کی عطر بیز ہوائیں چلنے لگیں اور وہاں کے باشندوں نے صدیوں کے بعد سکھ چین کا سانس لیا۔ محسن انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسّلام مخلوق خدا کے لیے خیر اور بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔ یہی وہ چیز تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (الانفال - آیۃ ۲۴)

(یعنی اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے)

اس ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے اصلاح و ہدایت کے جس کام کا آغاز کیا ہے اور تمہیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کے لیے بُلایا ہے اسی میں درحقیقت شخصی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمہارے لیے زندگی ہے۔ اگر سچے دل سے رسول اللہؐ کی پکار پر لبیک نہ کہو گے اور ان برائیوں کو جنہوں نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنۂ عام برپا ہو گا جس کی آفت سے کوئی نہ بچ سکے گا خواہ تم میں سے بہت سے ایسے افراد بھی موجود ہوں جو عملاً برائی کرنے اور برائی پھیلانے کے ذمہ دار نہ ہوں بلکہ اپنی زندگی میں بھلائی ہی لیے ہوں۔

آئیے اب دیکھیں کہ ہادیٔ برحق صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وہ زندگی بخشنے والی پکار کیا تھی جس نے نوعِ انسانی کے افکار و خیالات میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ یوں تو آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پکار اخلاقِ حسنہ کے تمام شعبوں پر محیط ہے کیونکہ آپؐ فضائلِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے لیکن امن و اُخوّت کے حوالے سے اس پکار کے آٹھ بڑے بڑے اجزاء یہ نظر آتے ہیں:

(۱) عقیدۂ توحید
(۲) احترامِ انسانیت اور وحدتِ نسلِ انسانی
(۳) اتحاد و اتفاق
(۴) رواداری
(۵) جہاد فی سبیل اللہ
(۶) اُخوّت و مساوات

(۷) عدل و انصاف

(۸) امن کی ضامن حکمتِ عملی

اب ان میں سے ہر عنوان پر ہم الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

(۱) عقیدۂ توحید

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عقیدۂ توحید قصّۂ پارینہ بن چکا تھا۔ انسانوں نے خالقِ حقیقی کو چھوڑ کر بے شمار معبود بنا رکھے تھے۔ وہ پہاڑوں، پتھروں، دریاؤں، درختوں، جانوروں، ارواح و شیاطین، آگ، چاند، سورج اور ستاروں ہی کے سامنے نہیں بلکہ کیڑوں مکوڑوں تک کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ اہلِ عرب کی جہالت اور ان کے شرک کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی کو راستے میں چار پتھر مل جاتے تو وہ تین سے استنجا کر لیتا اور ایک کو اپنا معبود بنا لیتا۔ (مُسندِ دارمی) غیر اللہ کی پرستش کے نتیجے میں انسان سخت ذہنی انتشار، توہم پرستی، بُزدلی اور بے یقینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسے خالص اور حیات بخش عقیدۂ توحید کی تعلیم دی جس سے وہ حقیقی خالقِ کائنات کے سوا ہر ایک سے آزاد نڈر اور بے فکر ہو گیا، اس میں ایک نئی امنگ اور نئی وحدت پیدا ہوئی۔ اس نے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو کارسازِ حقیقی اور نفع و نقصان پہنچانے والا سمجھنا شروع کر دیا۔ اس کو کثرت میں وحدت نظر آنے لگی، وہ اپنے کو اشرف المخلوقات اور صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ سمجھنے لگا۔ یہ گویا انسانی عظمت و شرف کا قیام تھا جس سے پوری دنیا محروم ہو چکی تھی۔ یہی عقیدہ رسولوں، نبیوں، آسمانی کتابوں، فرشتوں، یومِ آخرت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی اساس بنا اور نوعِ انسانی کو ایک

نقطۂ اتحاد پر جمع کر دیا۔

② احترامِ انسانیت اور وحدتِ نسلِ انسانی

(ا) رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت سے پہلے "احترامِ انسانیت" نام کی کسی چیز کا وجود دنیا میں نہ تھا۔ انسانی جان کی قدر و قیمت مکھی اور مچھر کے برابر بھی نہ تھی۔ ایک انسان کی ادنیٰ خواہش پر ہزاروں جانیں قربان کر دی جاتی تھیں۔ بُتوں کے استھانوں پر انسانی گوشت اور خون کے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بنی آدم تک یہ ارشادِ خداوندی پہنچایا کہ

"ہم نے بنی آدم کو عزّت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔"

(الاسریٰ آیۃ ۷)

آپؐ نے لوگوں کو بتایا کہ خالقِ کائنات نے انسان کو اپنا خلیفہ ٹھہرایا ہے اور انسان اس کائنات کا سب سے قابلِ احترام اور لائقِ محبّت وجود ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ بھی آپؐ کے اتّباع میں کھڑے ہو گئے۔ اس پر ہم نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! یہ تو ایک یہودی کی میت تھی۔ آپؐ نے فرمایا، کیا وہ ایک فردِ انسانی نہ تھا؟ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت اور اہمیت کیا تھی۔

پھر آپؐ نے لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات بھی بٹھا دی کہ

تمام انسان گویا خدا کا کنبہ ہیں اور اللہ کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کو آرام پہنچائے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

(ب) محسنِ انسانیت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا تیسرا بڑا احسان نوعِ انسانی پر یہ ہے کہ آپ نے اس کو وحدتِ انسانی کا مہتم بالشان تصور دیا جس نے وطنیت، قومیت، عصبیت اور لسانیت وغیرہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور عالمگیر امن و آشتی کی عمارت کے لیے بنیاد فراہم کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات۔ آیۃ ۱۳)

(لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے)

رسولِ رحمت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے حجۃ الوداع کے تاریخ ساز موقع پر اس ارشادِ خداوندی کی توضیح یوں فرمائی کہ

"لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے کسی عرب کو عجمی پر، کسی عجمی کو عرب پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے بجز تقویٰ (پرہیزگاری) کے۔ تم میں زیادہ عزت و کرامت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے ڈرنے والا ہے۔"

تاریخ کے اوراق کھنگالیں تو معلوم ہوگا کہ رنگ، نسل، زبان،

وطنیت اور قومیت کی بنا پر دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا یا دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا، ایسا فتنۂ عظیم ہے جو بارہا ہولناک جنگوں اور کشت وخون کا باعث ہوا ہے۔ رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے وحدت انسانی کا تصور پیش فرما کر اس فتنے کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ یہ نظریہ گویا ایک پُر بہار اور تناور درخت ہے جس کے سائے کے نیچے انسانیت کو امن وسکون حاصل ہو سکتا ہے اور وہ اشتراک عمل اور تعاون باہمی کے اصول پر انسانیت کی تعمیر نو کا کام انجام دے سکتا ہے۔ آنحضورؐ نے عصبیت کے مکروہ صورت بت کو یہ فرما کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا کہ

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر جنگ کرے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جس کی موت عصبیت پر واقع ہو۔"

(مشکوٰۃ باب الجنائز)

کسی نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟

فرمایا: "عصبیت یہ ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم کی ناجائز مدد کرو۔"

(مشکوٰۃ باب المفاخر)

ایک اور حدیث میں رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ "جو شخص اپنی قوم کی ناحق اور ناروا بات پر مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ جیسا ہے جو اونچی جگہ سے (کنوئیں میں) گر کر ہلاک ہو جاتا ہے اور پھر دُم پکڑ کر اس کو کھینچا جاتا ہے۔"

(ابوداؤد۔ عن عبداللہؓ بن مسعود)

(۳) اتحاد و اتفاق

کسی بھی ملک یا قوم میں تشتت وافتراق امن کا سب سے بڑا

دشمن اور اتحاد و اتفاق امن کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق سے رہنے کی بے حد تاکید فرمائی۔ آپؐ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک جسم قرار دیا اور فرمایا کہ آپس کی ہمدردی، محبّت اور شفقت میں مومنین جسمِ انسانی کی مانند ہیں۔ جب ایک عضو بیمار ہو جاتا ہے تو باقی اعضائے بدن بھی اس کے شریکِ حال ہو جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

اس سلسلے میں رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے کچھ اور ارشادات ملاحظہ ہوں۔

○ "مومن دوسرے مومن کے حق میں عمارت کی مانند ہے جس کے بعض حصّے دوسرے حصّوں کی مضبوطی اور تقویت کا باعث ہیں۔" (بخاری و مسلم)

○ "خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

○ "مسلمان بھائی کی خیر خواہی کرنا دین (کی اصل) ہے۔" (ترمذی)

○ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم نہ کرے، اسے نقصان نہ پہنچنے دے۔ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا حاجت روا بن جاتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی مصیبت اور پریشانی دور کر دے اللہ تعالیٰ قیامت کے مصائب اور غموں میں سے اس کا کوئی بڑا غم دور کر دے گا اور جو شخص کسی مسلمان کا عیب ڈھانکے

اللہ قیامت کے دن اس کی عیب پوشی کرے گا۔"
(بخاری و مسلم)

○ " مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا آئینہ ہے اور مومن مومن کا بھائی ہے اسے نقصان سے بچاتا ہے۔ اس کے حقوق کی غائبانہ حفاظت کرتا ہے۔" (ابوداؤد۔ ترمذی)

○ " اگر مسلمانوں کے دو فریقوں میں کسی بات پر نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو آپؐ نے ان میں عدل سے صلح کرا دینے کو صدقہ قرار دیا ہے۔" (صحیحین)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ سے فرمایا، کیا میں تمہیں ایسا عمل بتاؤں جو روزے، نماز اور زکوٰۃ سے بھی افضل ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، ہاں یا رسولؐ اللہ! فرمایا، وہ عمل لوگوں میں مصالحت کرا دینا ہے اور ان میں فساد ڈالنا دین کے مونڈنے والی حرکت ہے۔
(ترمذی و ابوداؤد)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے باہمی تنازعات کا سختی سے محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔ ان کو ایک دوسرے سے الجھنے کی ممانعت فرماتے تھے۔ اگر باز نہ آتے تو بزور روک دیتے یا فریقین میں مصالحت کرا دیتے۔

حضورؐ کو اختلاف و تفرقہ سے سخت نفرت تھی اور کفر و شرک کے بعد مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کو آپؐ سب سے بڑا جرم اور گناہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کئی احادیث میں آپؐ نے مسلمانوں میں پھوٹ اور تفرقہ ڈالنے والے شخص کو بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب ٹھہرایا ہے۔
(مسلم، نسائی، ابوداؤد)

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر وہ قوم جس نے اتحاد و اتفاق کو ترک

کردیا اور تشتت وافتراق میں مبتلا ہوگئی، بہت جلد تباہ ہوگئی۔ اسی لیے حضورؐ لوگوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ آپس میں اختلاف نہ کیا کرو۔ تم سے پہلے لوگ اختلاف (نااتفاقی) ہی کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ (صحیح بخاری)

(۴) رواداری

انسانی رواداری قیامِ امن کا ایک زبردست عنصر ہے۔۔۔ جبکہ تنگ نظری اور تعصب، فتنہ وفساد اور انتشار و بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ قرآنِ پاک نے جہاں یہ اعلان فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران-آیۃ ۱۹)

(درحقیقت دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)

وہاں یہ بھی واضح فرمادیا لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے) یہی وہ رواداری ہے جو اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے اور باہمی حسد، طبقاتی جنگ، قومی پیکار اور مذہبی تعصب سے انسان کو نجات دلا کر دنیا میں امن قائم کرسکتی ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رواداری پر اس قدر زور دیا کہ اس سے روگردانی کرنے والے کو اپنی جماعت سے خارج قرار دیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح باب الجنائز)

آپؐ نے مملکت کے تمام مسلم وغیرمسلم باشندوں کو رنگ، نسل، وطن یا دنیوی حیثیت کے بغیر وہ تمام بنیادی حقوق دیے جو قرآن پاک میں متعین ہیں، مثلاً جان ومال، عزت وآبرو اور نجی زندگی کا تحفظ، مذہبی دلآزاری سے تحفظ، عبادت گاہوں کا تحفظ، عقیدہ کی آزادی کا حق، حاجت مندوں اور معذوروں کے لیے وسائلِ ریاست سے متمتع ہونے کا حق۔

اگر کبھی کسی غیرمسلم کو کسی مسلمان سے تکلیف پہنچی تو حضورؐ نے اس کا سختی سے محاسبہ فرمایا۔ عسکری مہمات میں فوج کو سختی سے حکم دیا کہ

لڑائی میں مذہبی پیشواؤں، عبادت گاہوں کے ملازموں اور تارک الدُنیا راہبوں سے کوئی تعرّض نہ کیا جائے۔ یہی اسلامی رواداری تھی جس نے فتنہ و فساد کے سوتے خشک کر دیئے اور بالواسطہ طور پر قیامِ امن کا ایک مؤثّر ذریعہ ثابت ہوئی۔

۵ جہاد فی سبیل اللہ

جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب ہے وہ محنت اور کوشش جو اللہ کی راہ میں دینِ حق کی سربلندی اور استحکام کے لیے کی جائے اس میں مال جان اور اولاد ہر چیز کی قربانی شامل ہے۔ مستشرقین نے جہاد کی جو تشریح و تعبیر کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی دیوانوں FANATICS کا ایک مسلّح گروہ غیر مسلموں پر پل پڑتا ہے اور تلوار کے زور سے ان کو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ تعبیر و تشریح بالکل غلط اور گمراہ کُن ہے جہاد فی سبیل اللہ فساد کے لیے نہیں بلکہ اصلاح اور قیامِ امن کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے حدود اللہ اور رسولؐ نے مقرر فرما دیئے ہیں ان سے تجاوز کسی صورت میں جائز نہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ، ظالموں اور مفسدوں کے لیے قہرِ الٰہی اور انسانیت کے لیے رحمت و برکت ہے۔ یہ دنیاوی بادشاہوں حاکموں اور قوموں کی خونریز جنگوں کی طرح نہیں جو صرف ملک گیری یا زر و مال حاصل کرنے کے لیے لڑی جاتی ہیں اور ان میں بدعہدی، عورتوں اور بچّوں وغیرہ کا قتل اور ہر بڑے سے بڑا ظلم روا رکھا جاتا ہے لیکن اسلامی جہاد میں ایسی سب باتیں ممنوع ہیں۔ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت صرف مندرجہ ذیل صورتوں میں ہے۔

(۱)۔ ملک و ملّت کے دفاع اور حفاظت کے لیے، جب دشمن حملہ آور ہو یا حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔

(۲) فتنہ و فساد اور سرکشی کو ختم کرنے کے لیے۔
(۳)۔ ظلم و استبداد کے استیصال کے لیے۔
(۴) ضعیفوں اور مظلوموں کی مدد کے لیے۔

اس طرح جہاد فی سبیل اللہ ایک افضل ترین عبادت اور مخلوق خدا کو فتنہ و فساد کے چُنگل سے نکال کر امن کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گیا۔ قرآنِ پاک اور احادیث نبوی میں جہادِ فی سبیل اللہ کے بے شمار فضائل بیان ہوئے ہیں۔ حضورؐ صحابہؓ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ہر وقت تیار رہنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے اور اعلانِ جہاد کے بعد اس میں حصّہ لینا آپ نے ہر مسلمان کے لیے دینی فریضہ قرار دیا تھا۔ حضورؐ نے ہر مسلمان کے دل میں جہاد فی سبیل اللہ میں حصّہ لینے کی ایسی تڑپ پیدا کر دی تھی کہ وہ اس میں شامل ہونے کو اپنی خوش بختی اور عدم شمولیت کو بہت بڑی محرومی سمجھتا تھا۔ یہ مجاہدین کا جذبۂ صادق ہی تھا کہ فتح مکّہ اور غزوۂ حنین (۸ ہجری) کے بعد سارے عرب نے آستانۂ اسلام کے سامنے سر جُھکا دیا اور امن و امان کی یہ کیفیت ہوئی کہ ایک محمل نشین خاتون تنہا (بیسوں میل دور واقع سرحدی شہر) حیرہ سے مکّہ آ کر کعبہ کا طواف کرتی ہے اور پھر اسی طرح وطن کو مراجعت کرتی ہے لیکن کسی کو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ وہی عرب تھا جہاں کسی قافلے کے لیے چند میل کا سفر بھی امن و سلامتی کے ساتھ طے کرنا امرِ محال تھا۔

(۶) اُخوّت و مساوات

(۱) اُخوّت اور مساوات دو ایسے اوصاف ہیں کہ اگر ان کو اپنا لیا جائے تو معاشرے میں فتنہ و فساد کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ خدمتِ خلق، ایثار و کرم، مہمان نوازی اور انکسار و تواضع بھی اُخوّت و مساوات

ہی کی شاخیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے:
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (بے شک مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں)
رحمت عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے تمام مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں رشتۂ اُخوت میں پرو دیا اور ان کی باہمی عداوتوں کا خاتمہ کر کے دشمنانِ حق کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا، اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شخص نے عرض کیا، یا رسولُ اللہ! میں مظلوم کی مدد تو بے شک کروں لیکن جب وہ ظالم ہے تو اس کی مدد کیسے کروں — آپ نے فرمایا، اس کو ظلم سے روک دے یہی اس کی مدد ہے (بخاری و مسلم)

یوں تو حضورؐ نے پہلے مکّہ میں اور پھر ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کے مابین ایک مخصوص قسم کا عقدِ مؤاخاۃ قائم کرا دیا تھا لیکن فی الحقیقت آپؐ نے تمام مسلمانوں میں ایسا جذبۂ اُخوّت پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ مسلمانوں کی اُخوّتِ باہمی کی آپؐ کے نزدیک کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ آپؐ کے ان ارشادات سے کیا جا سکتا ہے۔

- "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں" (صحیحین)
- اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو باہم محبت رکھتے تھے۔ مجھے اپنے جلال کی قسم ہے انہیں میں آج اپنے سایہ میں جگہ دوں گا اور آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں" (صحیح مسلم)
- "ایک دوسرے سے حسد مت کرو اور تناجش مت کرو (تناجش کا مطلب ہے کہ بازار میں کوئی چیز بکتی ہو اور کوئی خریدتا ہو تو دوسرا خریدنے کی نیت کے بغیر اس کی قیمت بڑھائے) اور ایک

دوسرے سے بغض مت رکھو اور ایک دوسرے سے اعراض نہ کرو (حقارت سے منہ نہ پھیرو) اور تم میں سے کوئی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ اللہ کے بندو ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ ترکِ مدد کرے۔ ہر چیز مسلمان کی مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت (یعنی کسی مسلمان کو قتل کرنا یا اُس کا مال غصب کرنا یا اس کی عزت کے درپے ہونا) (صحیح مسلم)

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے فرمایا، سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اور تم سب ایک اُمّت ہو، تمہارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لیے حرام کر دی گئی ہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں کشت و خون کرنے لگو۔

(ب) انسانی معاشرے میں شدید قسم کی معاشی عدم مساوات، ذات پات کی تمیز حسب و نسب پر گھمنڈ اور ایسی ہی دوسری چیزیں طبقاتی کشمکش اور بدامنی کا باعث بنتی ہیں۔ رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بنی نوعِ انسان کو مساوات کا ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ تصوّر دیا کہ دُنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دربارِ رسالت میں امیر اور غریب، آقا اور غلام، عربی اور عجمی گورے اور کالے سب یکساں تھے اور تمام مسلمانوں کے حقوق رنگ نسل اور زبان اور وطن کے امتیاز کے بغیر برابر تھے اگر کسی کو فضیلت حاصل تھی تو وہ صرف تقویٰ کی بناء پر تھی۔ خاندان کا غرور اور دوسروں کے نسب پر طعن کرنا آپؐ کے نزدیک عہدِ جاہلیت کی نشانیاں تھیں۔ (صحیح مسلم)

آپؐ نے قریش کا غرورِ نسب اس طرح مٹایا کہ اپنی پھوپھی کی بیٹی حضرت زینبؓ بنتِ جحش کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا اور اپنی بنتِ عم ضباعہ بنتِ زبیر بن عبد المطّلب کو غریب الوطن

صحابی حضرت مقدادؓ بن الاسود کندی سے بیاہ دیا۔ دینی اور دنیاوی تمام امور میں آپؐ دوسروں کے ساتھ شانہ بشانہ ہو کر کام کرتے تھے اور یہ کبھی پسند نہ فرماتے تھے کہ دوسرے کام کرتے رہیں اور آپؐ بیٹھے رہیں۔ مسجد نبوی کی تعمیر ہو یا خندق کی کھدائی، دکھ ہو یا سکھ، سفر ہو یا حضر آپؐ ہر حال میں صحابہؓ کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ حدیہ کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب کہ تیس ہزار جاں نثار آپؐ کے ہم رکاب تھے، حضرت عبداللہ ذوالبجادینؓ نے وفات پائی تو آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ مل کر خود ان کی قبر کھودی اور تدفین کی۔ آپؐ کی مساوات پسندی اور انکسار و تواضع کے بے شمار واقعات کتب سیر میں ملتے ہیں ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ "محبوب خلائق سربراہ مملکت" ہونے کے باوجود آپؐ نے مساوات کا جو نمونہ پیش کیا دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ معاشی عدم مساوات کے اثرات آپؐ نے اس طرح زائل کیے کہ زکوٰۃ، صدقات اور حقوق العباد کی ادائیگی کا ہمہ گیر نظام قائم فرمایا جس کے نتیجے میں ایک دن وہ وقت آیا کہ زکوٰۃ اور خیرات لینے والے مشکل سے ملتے تھے۔

⑦ عدل و انصاف

عدل و انصاف دنیا کے ہر مہذب معاشرے اور حکومت میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ جس معاشرے میں عدل و انصاف کا فقدان ہو وہ فتنہ و فساد اور بدامنی کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہونے کے اعتبار سے عدل و انصاف پر غیر معمولی زور دیتا ہے۔ چنانچہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل و انصاف کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ آپؐ کا عدل اپنے بیگانے دوست دشمن امیر غریب مسلم اور غیر مسلم سب

کے لیے یکساں اور بلا امتیاز تھا۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ کے پاس کوئی مقدمہ لایا گیا جس میں ایک فریق مسلم اور دوسرا غیر مسلم تھا۔ آپؐ نے شہادتیں سننے کے بعد غیر مسلم کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا۔ اسی طرح جب تک کسی کے خلاف کامل ثبوت نہ مل جائے آپ حد جاری نہیں فرماتے تھے اور جب کامل ثبوت مل جائے تو پھر اجرائے حد میں آپ نہ کسی کی سفارش مانتے تھے اور نہ کسی رو رعایت سے کام لیتے تھے۔

⑧ امن کی ضامن ۔ حکمتِ عملی

مدنی زندگی میں سرورِ کائنات صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی گویا آپؐ بیک وقت اللہ کے آخری رسول بھی تھے اور ایک وسیع و عریض مملکت کے ہمہ مقتدر اور محبوب خلائق سربراہ بھی۔ لیکن یہ سربراہی دنیا کے دوسرے بادشاہوں جیسی نہیں تھی بلکہ تخت و تاج، خدم و حشم، کروفر، قصر و ایوان، مال و دولت، حاجب و دربان اور پولیس و دفتر سے یکسر بے نیاز تھی اور اس سربراہ کی حکومت "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ" کے اصول کی آئینہ دار تھی۔ آنحضورؐ نے تبلیغِ حق، تزکیۂ نفس، اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و کردار کے ساتھ ساتھ اسلامی مملکت کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی POLICY کی تشکیل جن خطوط پر فرمائی وہ نہ صرف ایک مثالی حکومت کے عکاس تھے بلکہ قیامِ امن کے بھی ضامن تھے۔ ان خطوط کا ایک مختصر سا خاکہ یوں کھینچا جا سکتا ہے کہ:۔

① آپؐ نے غیر مسلموں سے صلح و امن کے بکثرت معاہدے کیے اور ہمیشہ صلح کو جنگ پر ترجیح دی۔ ہجرت کے بعد آپؐ نے سب سے

پہلے یہودِ مدینہ کے ساتھ امن و صلح اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا جس نے میثاقِ مدینہ کے نام سے شہرت پائی۔ اس میں آپؐ نے یہودیوں کو مکمل آزادی دی اور شہری و ثقافتی معاملات میں ان کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیئے۔ ۷ھ ہجری میں خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں سے صلح و امن کے معاہدے ہوئے۔ ۶ھ ہجری میں قریشِ مکہ کے ساتھ دس سال کے لیے صلح و امن کا معاہدہ ہوا جو تاریخ میں "صلحنامۂ حدیبیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ۹ھ ہجری میں نجران، دومۃ الجندل، ایلہ، مقنہ، جرباء، اذرح، تبالہ، جرش اور یمن کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ امن و صلح کے معاہدے ہوئے۔ اسی سال بحرین کے مجوسیوں کو معمولی جزیہ کے عوض ہر قسم کے حقوق دیئے گئے۔ عرب کے متعدد قبائل سے بھی حضورؐ نے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ اگر کبھی اپنی مدافعت یا فتنہ و فساد کے استیصال کے لیے تلوار اٹھانا ناگزیر ہو گیا تو بھی آپؐ نے کوشش کی کہ جانی نقصان کم از کم ہو۔ عہدِ رسالت کے تمام غزوات و سرایا کی تعداد ۸۲ ہے۔ ان سب میں مجموعی طور پر ۱۰۱۸ آدمی کام آئے گویا مقتولین کا اوسط $12\frac{1}{2}$ فی لڑائی ہے جبکہ حضورؐ کی ہجرت سے وفات تک دو سو چھہتر مربع میل روزانہ کے اوسط سے عرب کا علاقہ اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہوا۔ (رحمۃ للعالمین جلد دوم قاضی سلمان منصورپوری) فی الحقیقت آپؐ کی داخلی حکمتِ عملی سراسر امن و صلح پر مبنی تھی اور اس کا مقصد کسی علاقے پر طاقت کے بل پر قبضہ جمانا نہ تھا۔ اس حکمتِ عملی نے تمام اہلِ عرب کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص رشتۂ اتحاد میں پرو دیا اور ملک سے بدامنی کا خاتمہ ہو گیا۔

(۲) حضورؐ کی خارجہ حکمتِ عملی کے نمایاں پہلو یہ تھے:

(ا) آپؐ نے عرب کی سرحدوں کو بیرونی خطرات سے محفوظ کر دیا

اور یمن، عمان اور بحرین کو (جو فی الحقیقت عرب کا حصّہ تھے) مجوسی ایران کے پنجے سے نجات دلائی۔

(ب) پڑوسی ممالک (حبشہ، ایران، روم اور مصر) کے بادشاہوں کو خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دی اور کسی قسم کی دھمکی دینے کی بجائے ان کو بتایا کہ اگر انہوں نے امن اور سلامتی کی یہ دعوت قبول نہ کی تو اپنی رعیت کا وبال انہیں کی گردن پر ہوگا۔

(ج) بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے کا موقع دینے کے بجائے آگے بڑھ کر سرحدوں پر اس کا مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ تبوک کا پُر صعوبت سفر اسی سلسلے میں پیش آیا۔ (سنہ ۹ ہجری)

(د) سفیروں کی جان کے تحفظ کو اپنی حکومت کا اصول قرار دیا۔ اسی طرح اسیران جنگ سے بہترین سلوک اپنی حکومت کا شعار قرار دیا۔ لڑائیوں میں اپنی فوج کو باغ اور کھیت اجاڑنے، لوٹ مار کرنے، بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مذہبی پیشواؤں، راہبوں اور معذوروں کو قتل کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔

اوپر کی سطور سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کس زندگی بخشنے والی چیز کی دعوت دیتے تھے۔ یہ دعوت تھی اسلام (سلامتی) کی، ایمان (امن) کی اور اُخوّت (بھائی چارے، ہمدردی اور پیار محبّت) کی۔ جن مبارک ہستیوں نے اس پر لبیک کہا انہوں نے وہ انعامِ ربانی پا لیا جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا اور جب ان کے اخلاف نے اس کو نظر انداز کر دیا تو زوال و ادبار کے عفریت نے انہیں اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔ حق یہ ہے کہ جب تک رسولِ رحمت صلعم کی دعوت اور پکار پر لبیک نہ کہا جائے گا دنیا کا یہ انتشار اور ہولناک اضطراب کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے درد کا مداوا اسی دعوت پر لبیک کہنے ہی سے ہو سکتا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسا کرنے کی توفیق دے۔ (آمین ثم آمین)

اَفْصَحُ الْعَرَب صلی اللہ علیہ وسلم

عرب میں رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت سے پہلے کا زمانہ دورِ جاہلیت کہلاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس دور کی تصویر صرف چار لفظوں میں کھینچ دی گئی ہے۔

ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (آل عمران۔ آیہ ۱۵۴) اللہ کے بارے میں جاہلانہ گمان

حُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ (المائدہ۔ آیہ ۵۰) زمانۂ جاہلیت کا سا فیصلہ

تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ (الاحزاب۔ آیہ ۳۳) دورِ جاہلیت کی سی (عورتوں کی) سج دھج۔

حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (الفتح۔ آیہ ۲۶) زمانۂ جاہلیت کی سی ضد (اپنی ناک کی خاطر ایک ناروا کام کرنے پر اصرار)۔

اس تفصیل کے مطابق جَاهِلِيَّة کا لفظ قرآنِ پاک میں صرف چار مقامات پر استعمال ہوا ہے اور اس کے ساتھ ظَنّ، حُکم، تَبَرُّج اور حمیّت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جن آیات میں یہ الفاظ آئے ہیں، مفسّرین نے ان کی جو تشریح کی ہے اس کو دیکھ کر دورِ جاہلیت کے عربوں کی معاشرت اور مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ دینی اور اخلاقی زاویۂ نگاہ سے یہ بدترین تاریکی اور جہالت کا دور تھا۔ شرک (بُت پرستی، کواکب پرستی) شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، لوٹ مار، بدکاری، بے حیائی، بے شرمی، سفّاکی، بے رحمی، دختر کُشی اور باہمی کُشت و خون وغیرہ عرب قوم کے چہرے کے بدنما داغ تھے لیکن یہی قوم کچھ ایسے اوصاف اور ایسی خصوصیات کی حامل تھی جن کی بنا پر دنیا کی دوسری قوموں میں اس کو ایک خاص مقام حاصل تھا مثلاً

شجاعت وشہامت، حریت پسندی، مساوات پسندی، مہمان نوازی اور سخاوت جیسی خوبیاں عربوں کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ صاف گو ایسے تھے کہ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا، دوغلاپن ان میں بالکل نہیں تھا۔ یا تو کھلے دشمن ہوتے تھے یا کھلے دوست۔ اگرچہ عام طور پر وہ نوشت وخواند سے عاری تھے لیکن ذہن اور حافظہ کے غیر معمولی طور پر تیز تھے۔ ایک چیز جو اُن کے لیے ہر شے سے بڑھ کر سرمایۂ ناز اور باعث افتخار تھی۔ وہ ان کی زبان (عربی) اور اس زبان کا شعروادب تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عربی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کی وسعت، جامعیت اور ہمہ گیری کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک ایک چیز کے لیے دو تین سے لے کر کئی سو تک الفاظ ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہو:

① مرد سفید رنگ کا ہو تو اسے اَزْهَر، عورت سفید رنگ کی ہو تو رُعْبُوبَة گھوڑا سفید ہو تو اسے اَشْهَب، گائے سفید ہو تو اسے لِیَاح۔ بیل سفید ہو تو اسے لَهَق۔ اونٹ سفید ہو تو اسے اَعْيَس۔ گدھا سفید ہو تو اسے اَقْمَر۔ ہرن سفید ہو تو اسے اَدَم۔ بال سفید ہو تو اسے اَشْمَط۔ پانی سفید ہو تو اسے صَافِ یا خَالِص۔ شہد صاف ہو تو اسے مَاذِی۔ انگور سفید ہو تو اسے مُلَّاحِی۔ کاغذ یا کپڑا سفید ہو تو اسے اَبْيَض۔ چاندی سفید ہو تو اسے یَقَق۔ روٹی سفید ہو تو اسے حُوَّارِی کہتے ہیں۔

② بہادر آدمی کو شجاع کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر آدمی کو بَطَل، اس سے بڑھ کر صِمَّه، اس سے بڑھ کر بُهْمَه، اس سے بڑھ کر ذِمِر، اس سے بڑھ کر حَلِس، اس سے بڑھ کر نِكَل، اس سے بڑھ کر مِحْرَب اور اس سے بھی بڑھ کر بہادر آدمی کو غَشَمْشَم کہتے ہیں۔

اسی طرح تلوار، صُبح، اونٹ، شیر، عورتوں کے جسمانی محاسن اور

معائب کے لیے کئی کئی سَو الفاظ ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں ہر خیال کے اظہار کے لیے موزوں الفاظ کی کثرت ہے، اس لیے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وسعت کے اعتبار سے اور شعر و ادب کے میدان میں دنیا کی کوئی اور زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عربوں کا شعر و ادب فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ تھا اور عرب بجا طور پر اپنی زبان آوری اور فصاحت و بلاغت پر ناز کرتے تھے اور اپنے علاوہ باقی سب کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔

فصاحت و بلاغت قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان کا مطلب ہے خوش بیانی، خوش کلامی۔ علم معانی کی رو سے کلام میں ایسے الفاظ لانا جو اہلِ زبان کے روزمرّہ اور محاورہ کے خلاف نہ ہوں، مشکل اور بھدّے نہ ہوں، موقع اور محل کے مطابق ہوں۔ ایسی عبارت یا ایسا کلام (تقریر یا جُملہ) جس میں الفاظ تو تھوڑے ہوں لیکن ان میں مطالب و معانی کی کثرت ہو، بھی فصاحت و بلاغت میں داخل ہے۔

عربوں میں شاعروں اور خطیبوں کو بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ شعلہ بیان خطباء اور قادر الکلام شعراء کا تعلق جس قبیلے سے ہوتا وہ قبیلہ بھی ان کی وجہ سے معزز سمجھا جاتا۔ دورِ جاہلیت میں عربوں کے ہاں کمال کا معیار ہی بیان و بلاغت اور فصاحتِ لسانی تھی۔ چنانچہ اس دور میں ایسے نامور شعراء اور خطباء پیدا ہوئے جن کی طلاقتِ لسانی اور سحر البیانی نے ایک دنیا کو مسخّر کر لیا۔ ان میں سے بعض شعراء ایسے تھے جن کے کلام کو آبِ زر سے لکھ کر کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیا گیا۔

خطیبانہ فصاحت و بلاغت اور حُسنِ کلام کو اپنا طُرّۂ امتیاز سمجھنے والی یہی قوم تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے خَاتَمَ الْأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْن صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو مبعوث فرمایا۔ چونکہ اللہ جَلَّ شَانُہٗ نے آپؐ کی ذاتِ گرامی کو افضل النّاس

اور تمام کمالات وصفات کی جامع بنایا تھا اس لیے فصاحت و بلاغت اور حُسنِ بیان کا وصف بھی آپ کو علیٰ وجہ الکمال عطا کیا گیا۔ اس کے دو پہلو تھے ایک تو یہ کہ آپؐ کو قرآن کا لافانی معجزہ عطا ہوا جس کی فصاحت و بلاغت نے تمام فُصحاءِ عرب کو ساکت ومبہوت کر دیا اور وہ اس کی ایک آیت کا جواب بھی پیش کرنے میں ناکام رہے۔ یہ معجزہ لسانِ رسالت ہی کے ذریعے خلقِ خدا تک پہنچا۔

دوسرا پہلو یہ تھا کہ ذاتی طور پر بھی آپؐ کو تمام فُصحاءِ عرب سے بڑھ کر فصاحت و بلاغت عطا کی گئی۔ چنانچہ آپؐ تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَب (یعنی میں عرب میں سب سے زیادہ فصیح اللسان ہوں) اگرچہ تمام عرب قبائل کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر فصاحت و بلاغت کا دعویٰ تھا لیکن قریش اور بنو سعد (بن بکر بن ہوازن) مُسَلَّم طور پر اس میں ممتاز تھے۔ قریش تو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اپنا قبیلہ تھا اور نجد کے بدوی قبیلہ بنو سعد میں آپؐ نے بچپن میں پرورش پائی تھی۔ اس ماحول میں پرورش پاکر آپؐ تمام فُصحاءِ عرب سے بڑھ کر فصیح اللّسان ہو گئے تھے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فصاحتِ نبوی کا خاکہ یوں کھینچا ہے:

> "اس طرح (قریش میں ولادت اور بنو سعد میں پرورش سے) آپؐ کی فصاحت و بلاغت میں بادیہ نشینوں کی قوّتِ بیان و مقابلہ، عمدہ لفظی اسلوب کے ساتھ شہری علاقے کے الفاظ کی چمک دمک اور اندازِ گفتگو کی رونق ایک ساتھ جمع ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ تائیدِ الٰہی بھی آپؐ کے شاملِ حال تھی جس کی امداد اس وحی ربانی سے ہوئی تھی جس کا احاطہ انسانی قدرتِ علم سے باہر ہے۔"
>
> (فصاحتِ نبویؐ بحوالہ الشفا)

ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللہُ تعالیٰ عَنہ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! میں سارے عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سنا ہے مگر آپ سے بڑھ کر فصیح و بلیغ میں نے نہیں دیکھا۔ تو آپ کو یہ ادب کس نے سکھایا؟"

حضور (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے فرمایا:

أَدَّبَنِيْ رَبِّيْ فَأَحْسَنَ تَادِيْبِيْ یعنی مجھے تو میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور بہت خوب ادب سکھایا ہے۔

ایک اور روایت میں آپ کے جواب میں یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں

وَنَشَأْتُ فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ (اور میں نے قبیلہ بنی سعد میں پرورش پائی ہے۔)

اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں حالانکہ آپ ہم سے کبھی الگ نہ ہوئے؟"

آپ نے فرمایا:

"میری زبان اسماعیل علیہ السّلام کی زبان ہے۔ اسے جبریل امین میرے پاس لائے اور مجھے سکھا دی۔"

(طبقات ابن سعد۔ مواہب اللدنیہ)

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی گفتگو کی شان یہ تھی کہ آپ بلا ضرورت کبھی نہ بولتے تھے اور جب گفتگو فرماتے تھے تو تمام لسانی بلاغتیں اور فکری بلندیاں سر نگوں نظر آتی تھیں۔ یہی حسن کلام اور فکری اعجاز تھا کہ مشرکین مکہ کبھی آپ کو شاعر اور کبھی ساحر کہتے تھے اور مکہ میں نو وارد لوگوں کو اس ڈر کی بنا پر آپ سے ملنے نہیں دیتے تھے کہ وہ آپ کی گفتگو سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ خواہ مخواہ کی لفاظی، تکلف، مصنوعی انداز سے فصاحت چھانٹنا اور منہ بنا بنا کر گفتگو کرنا آپ کو سخت ناپسند تھا۔ اس کے برعکس آپ کی گفتگو اتنی عام فہم، سادہ (مگر سہل ممتنع یعنی جس کی کوئی نقل

نہ آتا رسکے) دلآویز، شیریں، مربوط اور مرتب ہوتی تھی کہ فوراً سامع کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اس میں کسی گھٹیا یا عامیانہ لفظ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ آپؐ کے ارشادات مکالمات اور خطبات حشو و زواید سے خالی ہوتے تھے اور ان میں ایجازِ کامل کے ساتھ اعجازِ اکمل بھی پایا جاتا تھا۔ کلام کا طول و اختصار مطالب کے مطابق ہوتا تھا۔ جہاں اِطناب کا تقاضا ہوتا وہاں کلام تشریحی اور تفصیلی ہوتا، جہاں ایجاز مناسب ہوتا وہاں ایجاز کو ترجیح دیتے اور اس ایجاز میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا۔ حضورؐ الفاظ ایسی ترتیب سے ادا فرماتے تھے کہ اگر سننے والا چاہے تو الفاظ کا شمار کر سکتا تھا۔ آپؐ ہر شخص سے گفتگو کرتے وقت اس کی ذہنی سطح اور معاشرتی درجے کا خیال رکھتے۔ بدوی (دیہاتی، صحرائی) لوگوں سے ان کے انداز و معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور گفتگو میں ایسے الفاظ استعمال فرماتے جن کو وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ آپؐ سامع کے لب و لہجے کا خیال بھی رکھتے تھے اور یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔ عربی زبان پر آپؐ کی اسی غیر معمولی قدرت اور مسحور کُن فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر آپؐ کے صحابہ کرامؓ بھی حیران ہوا کرتے تھے اور عرب کے دوسرے فصحاء اور نامور شعراء بھی انگشت بدنداں ہو جاتے تھے۔ عہدِ رسالت میں ایسی مثالیں کثیر تعداد میں ملتی ہیں جن میں حضورؐ کی زبانِ مبارک سے قرآن پاک کا کوئی حصہ یا آپؐ کے اپنے ارشادات سن کر سامع کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ کفر و شرک کے ظلمت کدہ سے نکل کر اسلام کی وادیٔ نور میں داخل ہو گیا۔ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی فصاحت و بلاغت، آپؐ کی گفتار یا آپؐ کے کلام کی کسی ایک صنف تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ آپؐ کے اندازِ تکلّم اقوال، مکالمات، نصائح، خطبات، معاہدات، مکتوبات، فرامین، ادعیہ اور وصایا ہر شے میں جلوہ گر تھی۔ یہ ساری چیزیں حدیث و سیرۃ کی کتابوں میں

محفوظ ہیں۔ ان کا بنظر غائر مطالعہ کرنے والا قاری بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع افصح العرب تھے اور آپؐ کی گفتار اور آپؐ کے کلام کی ہر نوع جامعیت اور فصاحت و بلاغت کا شاہکار بلکہ منفرد اور بے مثال تھی۔ گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں عرب میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، دعویٰ نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت تھا اور کتبِ حدیث و سیرۃ اس کی سب سے بڑی مصدق ہیں۔ یہاں اس کی مثالیں پیش کرنا مضمون کی غیر معمولی طوالت کا باعث ہوگا تاہم بطور تبرک ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک مکالمہ ہے جو دعوتِ اسلام کے اوائل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک سلیم الفطرت اعرابی عمروؓ بن عبسہ کے درمیان ہوا۔ باختلاف روایت یہ مکالمہ عکاظ کے بازار میں یا خاص مکہ شہر میں ہوا۔ اس کے بعد حضرت عمروؓ بن عبسہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ اس مکالمہ میں سوال حضرت عمروؓ بن عبسہ کی طرف سے ہیں اور جواب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے۔

سوال: مَا الْإِسْلَامُ ؟ اسلام کیا ہے ؟

جواب: طِيبُ الْكَلَامِ وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ۔
پاکیزہ گفتگو اور غرباء کو کھانا کھلانا۔

سوال: مَا الْإِيمَانُ ؟ ایمان کیا ہے ؟

جواب: اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ۔ صبر اور سیر چشمی۔

سوال: أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ ؟ اسلام کس کا افضل ہے ؟

جواب: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ
جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

سوال: أَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ ؟ ایمان کونسا افضل ہے۔

جواب: خُلُقٌ حَسَنٌ۔ بہترین خلق۔

سوال: اَیُّ الصَّلٰوۃِ اَفْضَلُ؟ نماز کون سی افضل ہے؟
جواب: طُوْلُ الْقُنُوْتِ۔ لمبے قیام والی۔
سوال: اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ؟ ہجرت کون سی افضل ہے؟
جواب: اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ
جو چیز تیرے رب کو ناپسند ہو اس کو چھوڑ دینا۔
سوال: فَاَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ؟ جہاد کونسا افضل ہے؟
جواب: مَنْ عُقِرَ جَوَادُہٗ وَاُھْرِیْقَ دَمُہٗ۔
جس کا گھوڑا بھی کام آئے اور خود بھی شہید ہو جائے۔
سوال: اَیُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ؟ کون سا وقت افضل ہے؟
جواب: جَوْفُ اللَّیْلِ الْاٰخِرُ۔ رات کا پچھلا پہر۔
(مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان۔ بحوالہ مسند احمد)

حضورؐ نے ہر سوال کا جو جواب دیا اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے جس کی تشریح کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یوں سمجھئے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی فصاحت و بلاغت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عام احادیث میں آپؐ کا اندازِ بیان بالعموم ابلاغی ہوتا تھا اور خطبوں میں تبلیغی۔ ابلاغ میں بیان پُرسکون اور بات منطقی ہوتی ہے جبکہ تبلیغ میں زبان پُرجوش اور بیان بلیغ جس پر تفہیم و ترغیب کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں آپؐ کی فصاحت و بلاغت مبالغہ غلُوّ اور خیال آرائی سے پاک ہوتی تھی۔ حضورؐ نے مختلف موقعوں پر بے شمار خطبے دیئے۔ احمد زکی صفوت نے ان میں سے بارہ خطبے اپنی کتاب "جمہرۃ خطب العرب" میں جمع کیے ہیں! ان میں بلحاظ جامعیت اور زورِ بیان پانچ خطبے سب سے بڑھ کر ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اوّلین خطبہ جس کے ذریعے آپؐ نے قریش کو پہلی مرتبہ دعوتِ توحید دی۔

(۲) یوم فتح مکہ کا خطبہ۔
(۳) مدینے میں داخلے کا خطبہ
(۴) مدینہ میں پہلا خطبۂ جمعہ
(۵) خطبۂ حجۃ الوداع

ان میں سے آخر الذکر خطبہ سب سے ممتاز اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں حضورؐ نے کئی ابدی آفاقی حقائق بیان کرنے کے علاوہ دوسرے کئی اہم امور کو بھی خطبے کا موضوع بنایا ہے مثلاً حقوق اللہ، حقوق العباد، خواتین اور زیر دستوں کے ساتھ حسن سلوک، خانگی معاشی اور سیاسی زندگی کے رہنما اصول، اسلام کا حقیقی مفہوم اور اس کے تقاضے وغیرہ۔ اتنے بہت سے مسائل و موضوعات کو بہت تھوڑے الفاظ میں سمیٹ لینا کمال کی بلند ترین حد ہے۔ آپؐ کے خطبات کو پڑھ کر لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپؐ دنیا کے سب سے بڑے خطیب تھے نہ آپ سے پہلے کوئی آپؐ جیسا خطیب ہوا اور نہ بعد میں۔

ان کا تکلّم جانِ بلاغت، نُطق ہے اُن کا کانِ فصاحت
ہر ہر لفظ ہے لؤلؤے لالا، صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم
(امین گیلانی)

○

خُلقِ مبارک حاصلِ قرآں، نُطقِ مُطہّر شہد بداماں
جانِ بلاغت، رُوحِ فصاحت، صلی اللہ علیہ وسلم
(محمود سدیدی)

صاحبِ جوامع الکلم ﷺ

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح افصحُ العرب تھے۔ اسی طرح صاحبِ جوامع الکلم بھی تھے۔ "جوامع الکلم" فی الحقیقت فصاحت و بلاغت ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان سے مراد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ کلمات ہیں جو ہیں تو مختصر لیکن معنوی اعتبار سے بڑی وسعت رکھتے ہیں یعنی قلیل الالفاظ مگر کثیر المعانی۔ جاحظ نے "جوامع الکلم" کی تعریف یوں کی ہے۔

"جوامع الکلم سے مراد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) وہ کلمات ہیں جو قلیل الالفاظ ہوتے ہوئے بھی کثیر المعانی ہیں۔"

(البیان والتبیین ۴/۲۹)

"جوامع الکلم" کی اصطلاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے اس ارشاد پر مبنی ہے — اُعطیتُ (اُوتیتُ) جوامعَ الکلمِ (مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جوامع الکلم عطا کیے گئے ہیں۔

علامہ محمد عطیۃ الابراشی نے "جوامع الکلم" کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

"آپ کا وہ جامع کلام جس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ اور برابری کی ہی نہیں جا سکتی، جو بیان و بلاغت کا آخری درجہ اور بے انتہا مدلل بھی ہے، جو جامع کلمات اور انوکھی حکمت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ و حروف کی تعداد تو قلیل ہوتی ہے لیکن معانی کی فراوانی ہوتی ہے۔" (فصاحتِ نبوی: بحوالہ عظمت الرسول ص ۲۷۷)

یہاں ہم بطور تبرک "جوامع الکلم" کی پچاس مثالیں پیش کرتے ہیں:

(۱) اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۲) اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔

جب تم کو اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور برے کام سے رنج و قلق ہو تو تم مومن ہو۔ (مسند احمد)

(۳) اِنَّ الْغَضَبَ لَیُفْسِدُ الْاِیْمَانَ کَمَا یُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ۔

غصہ ایمان کو ایسا خراب کر دیتا ہے جیسا کہ مصبر (ایلوا) شہد کو خراب کر دیتا ہے۔ (شعب الایمان بیہقی)

(۴) مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یُؤْذِ جَارَہٗ۔ (صحیح بخاری)

جو شخص بھی اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے۔

(۵) اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ

دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت۔ (صحیح مسلم)

(۶) اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ فِتْنَۃً وَفِتْنَۃُ اُمَّتِیْ الْمَالُ

ہر امت کے لیے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کی خاص آزمائش مال ہے۔ (جامع ترمذی)

(۷) اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ

پاکیزگی نصف ایمان ہے۔ (صحیح مسلم)

(۸) اَلطَّاعِمُ الشَّاکِرُ کَالصَّائِمِ الصَّابِرِ

کھانا کھا کر شکر کرنے والا صابر روزہ دار کی مانند ہے۔ (جامع ترمذی)

(۹) اِنَّ مِنْ خِیَارِکُمْ اَحْسَنَکُمْ اَخْلَاقًا

بے شک تم میں سے نیک ترین وہ ہے جو تم میں سے اخلاق میں اچھا ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۱۰) اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ ۔ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اس لیے اللہ کے نزدیک بہترین شخص وہ ہے جو اللہ کے کنبے کے ساتھ احسان کرے ۔ (بیہقی)

(۱۱) لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ

قطع رحمی کرنے والا (یعنی قرابت داروں کے ساتھ قطع تعلق کرنے والا یا ان سے برا سلوک کرنے والا) جنت میں نہ جاسکے گا ۔

(۱۲) اَلْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ

تونگری (دولت مندی) دل کی تونگری (دولت مندی) ہے ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۱۳) اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا

بے شک بعض بیان (کلام ۔ باتیں) جادو (کا اثر رکھتے) ہیں ۔ (صحیح بخاری)

(۱۴) اَلْاِقْتِصَادُ فِى النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ

اخراجات میں میانہ روی (اعتدال) آدھی زندگی ہے (یعنی ضروری اور سود مند ہے) ۔ (بیہقی)

(۱۵) اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ

دین نام ہے خیر خواہی کا (یا دین سراسر خیر خواہی ہے) (صحیح بخاری)

(۱۶) اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ

نادم (شرمندہ یا پشیمان) ہونا ہی توبہ ہے ۔ (مسند احمد)

(۱۷) مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِىْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَ لَهٗ فِىْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ ۔

جو شخص اپنے رزق میں فراخی (اضافہ) اور لمبی عمر کا خواہشمند ہو اسے چاہیے کہ اپنے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۱۸) لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ ۔ انسان اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک

وہ اپنے بھائی کے لیے بھی اسی چیز کو پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۱۹) اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔

تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔
(سُنَنِ ابی داؤد۔ جامع ترمذی)

(۲۰) اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔

حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ (سُنَنِ ابی داؤد)

(۲۱) اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی جَمِیْلٌ وَ یُحِبُّ الْجَمَالَ۔

بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور پسند کرتا ہے جمال کو۔ (صحیح مسلم)

(۲۲) لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔

طاقتور وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(۲۳) مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ۔

جس نے (احسان کرنے والے) بندہ کا شکریہ ادا نہیں کیا اس نے اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کیا۔ (مُسندِ احمد، جامع ترمذی)

(۲۴) اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ کَلِمَۃَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ

ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔
(مُسندِ احمد، سُنَنِ ابی داؤد، سُنَنِ ابنِ ماجہ)

(۲۵) زِنْ وَاَرْجِحْ

تول اور (ترازو کا پلڑا) جھکتا رکھ۔ (مُسندِ احمد، سُنَنِ ابی داؤد، سُنَنِ ابنِ ماجہ)

(۲۶) اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ
روزہ گناہوں سے بچنے کے لیے ڈھال ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۲۷) تَصَافَحُوْا یَذْهَبُ الْغِلُّ وَتَهَادُوْا تَحَابُّوْا وَتَذْهَبُ الشَّحْنَاءُ۔
تم ایک دوسرے کے ساتھ مصافحہ کیا کرو۔ اس سے کینہ دور ہوتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو۔ اس سے تم میں باہم محبت پیدا ہوگی اور دلوں سے دشمنی دور ہوگی۔ (مؤطا امام مالک)

(۲۸) اَلطِّیَرَۃُ شِرْكٌ۔
شگون لینا شرک ہے۔ (صحیح بخاری، مسند احمد)

(۲۹) اَلْاَنَاۃُ مِنَ اللّٰہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ۔
کاموں کو متانت اور اطمینان سے انجام دینا اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی کرنا شیطان کی طرف سے ہے۔ (جامع ترمذی)

(۳۰) کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّكَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ۔
دنیا میں ایسے رہ جیسے کہ تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا مسافر (صحیح بخاری)

(۳۱) لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ لَا یَرْحَمُ النَّاسَ۔
اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کرتا۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۳۲) اَلْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ وَلَا خَیْرَ فِیْمَنْ لَا یَاْلَفُ وَلَا یُؤْلَفُ۔
مومن اُلفت و محبت کا مرکز ہے اور اس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے اُلفت نہیں کرتا اور دوسرے اس سے الفت نہیں کرتے۔
(مسند احمد و شعب الایمان للبیہقی)

(۳۳) اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے اعمال میں سب سے محبوب یہ

عمل ہے کہ اس کی محبت بھی اللہ کے لیے ہو اور بغض بھی اللہ کے لیے ہو۔
(سُنَنِ ابی داؤد)

(۳۴) حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ۔
(اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں) نیک گمانی بہترین عبادت ہے۔
(مُسندِ احمد، سُنَنِ ابی داؤد)

(۳۵) مَنْ يُحْرَمُ الرِّفْقَ يُحْرَمُ الْخَيْرَ۔
جو شخص نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا وہ تمام خیر (ہر اچھائی اور بھلائی) سے محروم کیا گیا۔ (صحیح مسلم)

(۳۶) طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ۔
(دیگر) فرائض کے بعد حلال کمائی کی تلاش فرض ہے۔ (جامع ترمذی)

(۳۷) تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرَكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ۔
اللہ کی پناہ مانگو بلاؤں کی سختی سے اور بدبختی کے لاحق ہونے سے اور بُری تقدیر سے اور دشمنوں کی شماتت سے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۳۸) هَدِيَّةُ الْأَحْيَاءِ إِلَى الْأَمْوَاتِ الْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ۔
زندوں کا (خاص) ہدیہ مُردوں کے لیے ان کے حق میں دعائے مغفرت ہے۔
(شعب الایمان للبیهقی)

(۳۹) إِمَاطَةُ الْأَذَىٰ عَنِ الطَّرِيقِ۔
ایمان کا ایک ادنیٰ حصہ ہے راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(۴۰) إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي مَعْرُوفٍ۔
اطاعت تو صرف نیک کاموں میں ہوتی ہے۔ (صحیحین)

(۴۱) أَدْوَمُهُ وَإِنْ قَلَّ۔ وہ کام سب سے زیادہ پسندیدہ ہے

جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ تھوڑا ہو۔ (صحیح بخاری)

(۴۲) طَاعَةُ النِّسَاءِ نَدَامَةٌ۔

عورتوں کی (بلا سوچے سمجھے) اطاعت سے ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔

(ابن عساکر)

(۴۳) اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ ۔ دعا عبادت کا مغز ہے۔ (جامع ترمذی)

(۴۴) کُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ۔ ہر بھلائی صدقہ ہے۔ (بیہقی)

(۴۵) اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ۔

خبردار بدگمانی سے بچنا، بے شک بدگمانی تو بالکل جھوٹی بات ہے۔

(صحیح مسلم، سنن نسائی)

(۴۶) اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ یَلْتَقِطُهَا حَیْثُ وَجَدَهَا۔

دانائی مومن کی گمشدہ متاع ہے جہاں کہیں اسے پاتا ہے چن لیتا ہے۔

(سیرۃ المختار)

(۴۷) اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس نے محبت کی۔ (یعنی قیامت کے دن اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا) (الشفاء)

(۴۸) قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔

کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر (اس قول پر) جم جاؤ۔ (صحیح مسلم)

(۴۹) رِبَاطُ یَوْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا عَلَیْهَا۔

اللہ کی راہ میں ایک دن پاسبانی کرنا دنیا اور اس کے تمام ساز و سامان سے بہتر ہے

(صحیح بخاری)

(۵۰) اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی اَلْیَدُ الْعُلْیَا هِیَ الْمُنْفِقَةُ وَالسُّفْلٰی هِیَ السَّائِلَةُ۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والا۔ (صحیح بخاری)

صلی اللہ علیہ وسلم

ہادیٔ اعظم کا حُسنِ تبلیغ

خیرُالانام رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پوری انسانیت کے ہادی اور قیامت تک ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ بنی نوعِ انسان کے تمام طبقے، زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کے لیے آپؐ کے محتاج ہیں۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذاتِ اقدس تمام کمالات و صفات کی جامع ہے۔ آپؐ کی تبلیغ و تعلیم سے بے نیاز ہو کر خدارسی کا تصوّر اور نجات و بخشش کی اُمید، خام خیالی اور غلط اندیشی ہے۔ حُضُور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حیاتِ اطہر کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیں وہ اتنا ارفع، اعلیٰ پاکیزہ اور بے مثال دکھائی دیتا ہے کہ تحریر و تقریر کے ذریعے اس کا پورا پورا نقشہ کھینچنا ممکن ہی نہیں، بقولِ شاعر:

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ

آپؐ کی سیرتِ طیّبہ کا ایک خاص پہلو آپؐ کا مُعَلِّم اور مُبَلِّغ ہونا ہے۔ یہ ایسا پہلو ہے کہ دوسرے تمام پہلو اس کے تابع یا اجزائے لاینفک معلوم ہوتے ہیں۔ آپؐ بے شک ایک خاوند بھی تھے، ایک باپ بھی تھے، ایک امام بھی تھے، ایک حاکم بھی تھے ایک مجاہد بھی تھے اور ایک عابد شب زندہ دار بھی۔ مگر یہ سب صفات آپؐ کی تبلیغی اور تعلیمی حیثیت کے تابع تھیں۔ اگر آپؐ شوہر تھے تو اس لیے کہ دنیا کے سامنے ایک بہترین شوہر کا اُسوہ پیش کریں۔ ایک باپ تھے تو اس لیے کہ اولاد کے حق میں ایک نہایت شفیق باپ کا نمونہ پیش کریں۔ امام اور حاکم تھے تو اس لیے کہ دنیا کے سامنے امامت اور حکومتِ الٰہیہ کے صحیح خدوخال پیش کریں۔ مجاہد تھے تو اس لیے کہ لوگوں کو جہاد کے تقاضے بتائیں اور میدانِ جہاد میں عزم و استقامت

کا نمونہ بن کر دکھائیں، عابدِ شب زندہ دار تھے تو دنیا کو یہ بتانے کے لیے کہ اپنے خالق کا قرب کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فی الحقیقت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے زندگی کی ہر راہ اور عمل کے ہر شعبے میں مبلّغ اور معلّم تھے۔ آپؐ کا حسنِ خلق بھی تبلیغ تھا، آپؐ کا فقر و زہد بھی تبلیغ تھا۔ آپؐ کا ذکر و فکر بھی تبلیغ تھا۔ آپؐ کی عبادت و ریاضت بھی تبلیغ تھی۔ آپؐ کی خانگی زندگی بھی تبلیغ تھی۔ آپؐ کی سپہ گری بھی تبلیغ تھی۔ مختصر یہ کہ آپؐ تبلیغِ حق کے پیکرِ جمیل تھے۔

اسلامی اصطلاح میں تبلیغ کا مطلب ہے، اللہ کے احکام مخلوقِ خدا تک پہنچانا۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغ کا حکم اس طرح دیا:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ آیۃ: ۶۷)

یعنی، اے رسول! جو کچھ تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر نازل ہوا، وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔

حکمِ تبلیغ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حیثیت کا تعیّن سورۂ احزاب میں یوں فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۔

یعنی، اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے حکم سے اور روشن چراغ بنا کر۔

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ یعنی ہم نے آپؐ

کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو سورۂ النحل میں یہ فرما کر تبلیغ کا طریقہ بھی بتا دیا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط

یعنی، اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے بحث بھی کرو تو ایسے طریقے سے جو بہترین ہو۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مبلّغ یا معلّم کی تعلیم کا اثر اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی تعلیمات پر خود عامل ہو اور اپنے ہر قول اور ہر اُصول کا عملی نمونہ پیش کرے۔ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرتِ طیبہ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس پر پوری طرح عمل بھی کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" فرما کر آپؐ کی زندگی کو مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا، گویا آپؐ کی پاک زندگی قرآنِ حکیم کی عملی تفسیر ہے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تبلیغ و تعلیم دو اجزاء پر مشتمل تھی۔ باللسان یعنی زبان کے ساتھ اور بالعمل یعنی عمل کے ساتھ۔

جہاں تک تبلیغ باللسان کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو انتہا درجے کا خوش خلق اور شیریں زبان بنایا تھا۔ آپؐ کی گفتگو میں عجیب تاثیر تھی۔ اس تاثیر کی حلاوت، شیرینی، دلپذیری، دلربائی اور دلکشی کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس میں ایسی کشش ہوتی تھی کہ دشمن کو بھی موہ لیتی تھی۔ جب حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بات کرتے تو آپؐ کے دہنِ مبارک سے پھول جھڑتے تھے۔ آپؐ کی باتوں میں مٹھاس کے ساتھ ایسی سحر خیز فصاحت و بلاغت

ہوتی تھی کہ سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔ گفتگو میں آپؐ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تھے۔ اس ٹھہراؤ میں بے انتہا خوبصورتی، رعنائی اور دلنوازی ہوتی۔ جس بات پر زور دینا ہوتا اس کو دو یا تین مرتبہ دہراتے تاکہ سننے والے کی سمجھ میں اچھی طرح آجائے۔ آپؐ ہر شخص سے اس کی ذہنی صلاحیت اور معاشرتی سطح کے مطابق گفتگو فرماتے۔ اس میں ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہ ہوتا تھا اور یہ اتنی مؤثر اور بلیغ ہوتی کہ مخاطب کے دل میں اتر جاتی تھی۔ خود اللہ جلّ شانہٗ نے آپؐ کی نرم مزاجی اور خوش خلقی یا شانِ تبلیغ کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران)

یعنی (اے نبیؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور تنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے بھاگ جاتے۔

سورۂ قلم میں آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یعنی اے نبیؐ! بے شک تم اخلاق کے نہایت اعلیٰ درجے پر ہو۔

یہی خلقِ عظیم آپؐ کی تبلیغ و تعلیم کا عملی پہلو تھا۔ آپؐ خیر الخلائق اور رحمۃٌ للعالمین تھے۔ دنیا کی کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو آپ کی ذاتِ گرامی میں نہ پائی جاتی ہو۔ صدق و عفاف، ایفائے عہد، امانت و دیانت، عفو و درگزر، رحم و کرم، انکسار و تواضع، عدل و انصاف، اکرامِ ضیف، ایثار و سخاوت، زہد و تقویٰ، فقر و قناعت، صبر و استقامت، شرم و حیا، صلہ رحمی، یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی، غربا و مساکین

کی اعانت، جانوروں پر رحم، ہمسایوں سے حسنِ سلوک، عبادت دریاضت جہاد فی سبیل اللہ، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، خوش کلامی و خوش مزاجی وغیرہ سب آپؐ کے گلشنِ اخلاق کے خوش رنگ پھول تھے جن کی خوشبو سے ہر سلیم الفطرت شخص کا مشامِ جان معطر ہو جاتا تھا اور وہ آپؐ پر ایمان لانے کے لیے بے تاب ہو جاتا تھا۔

آپؐ کی ذاتِ اقدس اپنی تبلیغ و تعلیم کا مجسّم نمونہ تھی جسے دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا تھا کہ جس بات کو آپؐ بھلائی اور خیر کہتے ہیں وہ آپؐ کی اپنی ذات میں کس شان سے جلوہ گر ہے۔ آپؐ کی تبلیغ کا محور لوگوں کو قرآن کی آیات پڑھ کر سنانا، ان کا تزکیۂ باطن کرنا اور انہیں قرآن اور حکمت کی تعلیم دینا تھا۔ زبان سے بھی اور عمل سے بھی۔ جن صحابہؓ کو آپؐ تبلیغ کے لیے روانہ فرماتے ان کو بھی نصیحت فرماتے کہ لوگوں کو آسانی کی راہ بتانا، ان کو دِقّت اور دشواری میں نہ ڈالنا، انہیں خوشخبری سنانا اور نفرت نہ دلانا۔

آپؐ کا یہ حسنِ تبلیغ ہی تھا کہ دنیا کے اکھڑ ترین انسان چند سال کے اندر اندر دنیا کے بہترین انسان بن گئے۔ انہوں نے نہ صرف تہذیب و تمدن کی زلفوں کو سنوارا بلکہ دینِ حق کو بھی چار دانگِ عالم میں پھیلا دیا۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سیرت ساز

آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے ابو الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے فرزندِ گرامی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو اپنے پاک ہاتھوں سے تعمیر کیا تو اللہ جل شانہ نے اسے برکت والا گھر اور سارے جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت قرار دیا جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (آیۃ ۹۶)

(بے شک پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے، برکت والی اور سارے جہانوں کے لیے مرکزِ ہدایت)

بیت اللہ شریف (ع دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا) کی تعمیر کے وقت اللہ تعالیٰ کی ان برگزیدہ ترین ہستیوں نے بارگاہِ ربّ العزت میں دعا کی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔

(البقرہ - آیۃ ۱۲۹)

(اے ہمارے ربّ تو ان لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے (یعنی ان کے اخلاق درست کرے) یقیناً تو بڑی قوت والا اور بڑا حکیم ہے)

حق تعالیٰ نے اس دعا کو یوں شرفِ قبولیت بخشا کہ کوئی اڑھائی ہزار سال

بعد اس نے آلِ اسمٰعیلؑ میں خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو حاملِ قرآن، رحمۃٌ للعالمین، سراجِ منیر، مبشّر، منذر، ہادی، معلّم اور مزکّی بنا کر مبعوث فرمایا۔
آلِ اسمٰعیلؑ سے ہماری مراد قریش سے ہے جو مکہ میں آباد تھے اور جن کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا بالتحقیق ثابت ہے۔ نسبی اعتبار سے یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ یا آپؐ کی قوم تھی لیکن اصطلاحًا تمام اہلِ عرب آپؐ کی قوم تھے۔ اس لیے عمومی طور پر سارے اہلِ عرب کو بھی آپؐ کی قوم کہا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اگرچہ سارے عالَم (بشمول عرب) پر کفر و شرک، عصیان و تمرّد اور جہالت کی تیرہ و تار گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور آپؐ سارے عالم کی ہدایت اور رہبری کے لیے مبعوث ہوئے تھے لیکن آپؐ کے اوّلین مخاطب اہلِ عرب ہی تھے۔ اہلِ عرب یا عرب قوم اپنے اطوار و خصائل کے اعتبار سے ایک عجیب قوم تھی۔ اس میں جہاں کچھ ایسی خصوصیات تھیں جو اس کو خیر الامم بنانے کا اہل بناتی تھیں وہاں اس میں بہت سے ایسے رذائل بھی پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے اس کے اوصاف کو دبا لیا تھا اور وہ بحیثیتِ مجموعی ایک اَن پڑھ، وحشی اور گمراہ قوم متصوّر ہوتی تھی۔
آئیے اس کی خصوصیات اور رذائل پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

عربوں کی خصوصیات

(۱) عربوں کی سب سے پہلی خصوصیت ان کی صحیح النّسبی تھی۔ شمالی عرب کے تمام قبیلے بالتحقیق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور نسل سے تھے۔ اگرچہ یہود اور بنی اسرائیل بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن عربوں کے برعکس دوسری قوموں کے اختلاط اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی بیشتر خاندانی خصوصیتیں مٹ چکی تھیں۔

(۲) ہمیشہ آزاد رہے اور کبھی کسی دوسری قوم کی غلامی نہ کی۔

(۳) وہ زمین کے وسط میں آباد تھے کیونکہ ملکِ عرب پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے۔

(۴) بڑے بہادر اور نڈر تھے۔

(۵) صاف گو تھے جو بات دل میں ہوتی تھی وہی زبان پر ہوتی تھی۔ دوستوں کے کھلے دوست اور دشمنوں کے کھلے دشمن ہوتے تھے۔ دروغ گوئی کو برا سمجھتے تھے۔

(۶) نہایت مہمان نواز تھے۔ اپنے پاس پناہ لینے والوں، مہمانوں اور ہمسایوں کی امداد میں اپنی جان تک لڑا دیتے تھے۔

(۷) ذہن اور حافظہ کے بہت تیز تھے۔

(۸) بڑے خود دار اور مساوات پسند تھے۔

(۹) بڑے زبان آور تھے۔ اپنی زبان عربی کے مقابلے میں دوسری زبانوں کو ہیچ سمجھتے تھے اور دوسرے ملکوں کو عجم (گونگا) قرار دیتے تھے۔

رذائل اور گمراہی

۱۔ کفر و شرک ـــــ اہلِ عرب دینِ ابراہیمی کو فراموش کر کے کفر و شرک کی دلدل میں دھنس چکے تھے۔ ان میں اللہ یا ایک "بڑے خدا" کا تصور تو موجود تھا لیکن عملاً انہوں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بنا رکھے تھے۔ وہ ان کے بت بنا کر ان کو پوجتے تھے، ان پر قربانی چڑھاتے تھے اور انہی سے اپنی حاجتیں مانگتے تھے اگر کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو وہ ناک بھوں چڑھاتے تھے جیسا کہ سورۃ الزمر میں فرمایا گیا ہے:

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۚ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (آیۃ ۴۵)

(جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں (معبودوں) کا ذکر ہوتا ہے تو یکا یک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں)

مولانا الطاف حسین حالیؒ نے مسدسِ حالی میں اس دور کے عربوں کی بت پرستی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا | کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزّیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا | اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا

ہبل، صفا، عزّیٰ، نائلہ سب بتوں کے نام تھے۔ ان کے علاوہ اور بیسیوں بت بھی تھے مثلاً لات، منات، اساف، ودّ، مناف، شمس، بعل، ذوالکفین، یغوث وغیرہ۔ فی الحقیقت عربوں میں بت پرستی کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کسی کو کوئی خوبصورت پتھر مل گیا اس کو اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ مسندِ دارمی میں تو یہاں تک ہے کہ راہ جاتے کسی کو چار پتھر مل گئے، اس نے اٹھا لیے، تین سے استنجا کر لیا اور ایک کو معبود بنا لیا۔ اپنے "بڑے خدا" کی نسبت ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ اس کے بال بچے ہیں۔ چنانچہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور ان کو بھی خدا کا درجہ دیتے تھے۔ اسی طرح وہ جنّات کو بھی خدا کے رشتے دار اور شریک سمجھتے تھے۔

بتوں پر صرف جانوروں ہی کی نہیں انسانوں کی قربانیاں بھی چڑھائی جاتی تھیں۔ بعض قبیلوں میں کواکب پرستی کا رواج تھا وہ چاند سورج، عطارد، مشتری وغیرہ کو پوجتے تھے۔

۲۔ **اوہام پرستی** ——— اجنّہ، شیاطین اور بھوت پریت کو بہت مانتے تھے۔ ان سے مدد مانگا کرتے تھے اور اپنے آپ کو ان کی پناہ میں دے دیتے تھے۔ سانپ کو ہلاک نہیں کرتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ سانپ کو مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت یا کوئی اور کام کرنے

سے پہلے شگون لیتے تھے مثلاً کوئی پرندہ دائیں جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو سفر کرنے یا کسی دوسرے کام کو شروع کرنے سے باز رہتے تھے۔ اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھ پھوڑ دیتے تاکہ اونٹوں کو نظر نہ لگ جائے۔ اسی طرح ان میں سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے۔

۳۔ **شراب خواری** ـــــ شراب کے بے حد رسیا تھے۔ بہت ہی کم آدمی ایسے تھے جن کو شراب کی لت نہ ہو۔ بے تحاشا پیتے تھے اور نشے کی حالت میں شرمناک حرکتیں کرتے تھے۔

۴۔ **قمار بازی** ـــــ شراب خواری کے ساتھ قمار بازی کا رواج بھی عام تھا۔ جوا کھیلنے کے انہوں نے بے شمار طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ روپے پیسے اور جانوروں پر تو بازی لگاتے ہی تھے بعض اوقات اپنی بیوی اور بال بچوں پر بھی بازی لگا دیتے تھے۔

۵۔ **سود خواری** ـــــ سود خواری بہت عمدہ پیشہ سمجھی جاتی تھی اکثر دولت مند لوگ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے اور اس کے وصول کرنے میں بڑی سختی سے کام لیتے تھے۔

۶۔ **قتل وغارت اور لوٹ مار** ـــــ عربوں کے صحرائی قبیلے لوٹ مار اور قتل وغارت میں بے حد دلیر تھے۔ بعض قبیلوں نے تو رہزنی اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ یا ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ وہ راہ چلتے مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ مختلف قبیلے موقع پا کر ایک دوسرے کے مال ودولت مویشیوں بلکہ اہل وعیال تک پر ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔ اس ڈاکہ زنی کو وہ بہادری کا کام سمجھتے تھے، نہ کوئی راستہ محفوظ تھا اور نہ کوئی قریہ۔ امن نام کی کسی چیز کا ملک میں نام ونشان تک نہیں تھا۔ نہ کوئی حکومت تھی، نہ کوئی قانون تھا اور نہ ظالموں سے کوئی بازپرس کرنے والا تھا۔

۷۔ **چوری** ——— بہت سے صحرائی قبیلوں کے لوگ چوری میں بڑی شہرت رکھتے تھے مثلاً بنوجُہَینہ، بنوغفار، بنو مُزَینہ وغیرہ۔ انہوں نے نقب لگا کر چوری کرنے کے علاوہ اس کے اور بھی کئی طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ حاجیوں کا مال اسباب چوری کرنے میں یہ لوگ خاص مہارت رکھتے تھے۔

۸۔ **بے شرمی اور بے حیائی** ——— عربوں میں بے شرمی اور بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ قریش کے سوا باقی سب عورتیں اور مرد مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ رفع حاجت اور نہاتے وقت پردہ نہیں کرتے تھے اپنی مجلسوں میں خلوت کی باتیں مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے ان کو بیوی بنا لیتے تھے۔

۹۔ **بدکاری اور فواحش** ——— بدکاری اور فواحش کی کوئی حد و نہایت نہیں تھی۔ بدکار عورتیں سربازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں۔ بعض شعراء عشق و محبت اور بدکاری کے واقعات اپنے اشعار میں اس طرح باندھتے تھے کہ وہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ ہر شخص ایک وقت میں جتنی چاہے شادیاں کر سکتا تھا۔ بیویوں کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ یہ لوگ فسق و فجور میں گلے گلے تک دھنسے ہوئے تھے۔

۱۰۔ **سفّاکی اور بے رحمی** ——— سفّاکی اور بے رحمی جاہلی عرب کے لوگوں کی گویا گھٹی میں پڑی تھی۔ لڑائیوں میں مستورات کے پیٹ چاک کرنا مقتولوں کی لاشوں کا مُثلہ کرنا، دشمن کا سر کاٹ کر اس کی کھوپڑی میں شراب پینا معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا۔ زندہ اونٹ اور دُنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب بنانا۔ جانوروں کو درختوں سے باندھ کر ان پر تیر اندازی کی مشق کرنا، یہ عربوں کے عام مشغلے تھے۔ کسی کو سزا دینی ہوتی تو اس کو کسی کوٹھڑی میں قید کر دیتے اور کھانے پینے کو کچھ نہ دیتے تھے وہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ کبھی مجرم کو گھوڑے کی دُم سے باندھ کر گھوڑے کو دوڑا دیتے۔ اس کے

بدن کے ٹکڑے اڑجاتے۔ کبھی مجرم کے اعضا رکسی درخت کی ٹہنیاں جُھکا کر ان کے ساتھ باندھ دیتے پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے۔ اس طرح مجرم کا بدن چِر جاتا۔

۱۱۔ دُختر کُشی ـــــ اکثر صحرائی قبیلوں میں دختر کُشی کا ظالمانہ رواج تھا۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی (یا اس کی صغر سنی میں) زندہ دفن کر دیا جاتا تھا یا کسی اور طریقے سے مار ڈالا جاتا تھا۔ ویسے بھی عورتوں کو بہت حقیر سمجھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔

۱۲۔ جنگ جوئی ـــــ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھنا اور ایک دوسرے سے لڑ مرنا عام بات تھی۔ مختلف قبیلے بالعموم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ دو قبیلوں میں کسی بات پر لڑائی چھڑ جاتی تو اس کا سلسلہ برسوں تک بلکہ نسلوں تک جاری رہتا اور اس لڑائی میں اور بہت سے قبیلے بھی ایک دوسرے کی حمایت میں شامل ہو جاتے۔ مؤرّخین نے ان لڑائیوں کو "ایامُ العَرَب" کا نام دیا ہے۔ ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس معاملے (جنگجوئی) میں صحرائی (دیہاتی) اور شہری سبھی قبیلے یکساں تھے۔

۱۳۔ وحشت اور جہالت ـــــ جاہلی دور کے عربوں میں حلال حرام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ عام جانوروں کے علاوہ وہ حشرات الارض کو بھی کھا جاتے تھے۔ مردہ جانور کا گوشت کھانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ جما ہوا خون اور آگ میں بُھنا ہوا چمڑا ان کی مرغوب غذا تھی۔

زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا

اوپر ہم نے دورِ جاہلیت کے عربوں کے رذائل اور گمراہی کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا بگاڑ کس حد تک پہنچ چکا تھا یہاں تک کہ ان کی اچھی خصوصیات بھی بگاڑ کے نیچے

دب کر رہ گئی تھیں اور یہی سبب تھا کہ پڑوس کی اقوام عرب قوم کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ اس قوم کو رذائل اور گمراہی کی دلدل سے نکالنا، اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنا، کفر و شرک سے متنفرؔ اور بیزار کر کے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کا پرستار بنانا بڑا کٹھن اور صبر آزما کام تھا۔ فی الحقیقت کسی بگڑی ہوئی قوم میں ذہنی انقلاب برپا کرنے اور اس کی اصلاح و تعمیر کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں لیکن ساتویں صدی عیسوی میں چشم فلک نے یہ تحیّر خیز منظر دیکھا کہ عرب کی غیر ذی زرع ریگستانی سرزمین میں مبعوث ہونے والے نبی آخر الزّماں صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صرف تیئس ۲۳ سال کے اندر یہ مہتم بالشان کام کر دکھایا۔ حصول مقصد کے لیے آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو مشکلات و مصائب کے جن ہولناک طوفانوں سے گزرنا پڑا وہ ایک الگ داستان ہے۔ البتہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ رحمت عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اہل عرب کو نہ صرف قعرِ مذلّت سے نکال لیا بلکہ ان کو شرف و مجد کے اتنے بلند مقام پر فائز کر دیا کہ وہ دنیا کے رہبر و پیشوا بن گئے۔ ان میں بہترین عالم، بہترین معلّم، بہترین مبلّغ، بہترین مدبّر، بہترین جرنیل، بہترین حاکم، بہترین مفکّر اور بہترین مصلح نکلے۔ تہذیب و تمدن کی زلفوں کو انہوں نے سنوارا، سیاست و معیشت کے چہرے کو انہوں نے نکھارا، جہالت کے اندھیروں اور کفر و شرک کی ظلمتوں میں ہدایت کا نور انہوں نے پھیلایا۔ اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے جان مال اولاد جس شے کی ضرورت پڑی حاضر کر دی۔ یہ ہادیٔ اعظم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فیضِ تربیت ہی کا اعجاز تھا کہ پرلے درجے کی پسماندہ، وحشی اور جاہل قوم کے افراد قبول اسلام کے بعد انسانیت کے بہترین نمونے اور ہر قسم کی اخلاقی خوبیوں کے پیکرانِ جمیل بن گئے۔

قرآن و حدیث اور کتبِ سیر میں ان نفوسِ قدسی یا صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے جو اوصاف و محاسن جا بجا بیان ہوئے ہیں،

ان کا احاطہ کرنے کے لیے ایک دفتر یا ضخیم کتاب درکار ہے۔ یہاں ہم صرف چند اوصاف و محاسن بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

کُفّار پر سخت اور آپس میں رحیم، ہر وقت رکوع وسجود یا اللہ کے پسندیدہ کاموں میں مشغول، چہروں پر سجدوں کے نشان لیے ہوئے، اللہ اور اللہ کے رسول کے فرمانبردار، رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو اپنی جان، اپنے ماں باپ، اہل وعیال ہر شے سے بڑھ کر محبوب سمجھنے والے، صادق الایمان، ہر بھلائی میں پیش پیش رہنے والے، حق کی خاطر جان کی بازی لگا دینے والے، راہ حق میں عزیز واقارب، وطن، گھر بار، مال اولاد اور جائیداد سب کچھ قربان کر دینے والے، راہِ حق میں ہر قسم کی مصیبت اور سختی صبر و استقامت سے جھیلنے والے، ہمیشہ سچ بولنے والے، کبائر اور بے حیائی سے بچنے والے، حلال کمانے اور کھانے والے، حرام سے بچنے والے، حق وصداقت کے معاملے میں مداہنت نہ کرنے والے، ریا کاری سے نفور، مخلص، اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینے والے، اپنی زبان پر قابو رکھنے والے، عہد کو ہر حال میں پورا کرنے والے، ایثار پیشہ، فیّاض، راہِ حق میں بڑھ چڑھ کر قربانی دینے والے، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے، مہمانوں کا اکرام کرنے والے، مُتواضع، غُصّہ آنے پر معاف کر دینے والے، سچی گواہی دینے والے، غرور اور فخر سے اجتناب کرنے والے، علم سیکھنے اور سکھانے والے، غریبوں مسکینوں یتیموں بیواؤں اور سائلوں کی مدد کرنے والے، پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنے والے، ماں باپ کی خدمت کرنے والے، اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرنے والے، اپنی اولاد پر شفقت کرنے والے اور اُس

کی اچھی تربیت کرنے والے، نیکی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے والے، مصیبت پر صبر کرنے والے، لین دین کے کھرے، جہاد فی سبیل اللہ کرنے والے، نماز قائم کرنے والے، حج کرنے والے، روزے رکھنے والے، زکوٰۃ دینے والے، اللہ پر توکل کرنے والے، حسابِ آخرت کے خوف سے رونے والے، حقوق العباد پورے کرنے والے، قناعت پسند، فتنہ و فساد سے بچنے والے، اللہ کا ذکر کثرت سے کرنے والے، رحم دل، متقی، خلقِ خدا کی خدمت کرنے والے، ایک دوسرے کو کثرت سے سلام کرنے والے، صفائی اور پاکیزگی کو پسند کرنے والے، نرم مزاج، خوش کلام، امانت دار، بردبار، نشہ آور اشیاء سے بچنے والے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

صحابۂ کرامؓ کے یہ سب اوصاف و محاسن رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی سیرت و کردار سازی کے مرہونِ منت تھے اور انہی کی بدولت صحابۂ کرامؓ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ بندے بن گئے تھے۔ ان کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف دین کی طرف سبقت کرنے والوں (سَابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ) کو دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار قرار دیا گیا بلکہ بعد میں راستبازی کے ساتھ ان کے پیچھے آنے والوں کو بھی جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ (سورۃ التوبہ۔ آیۃ ۱۰۰)

سُوْرَۃُ النِّسَآء میں رحمتِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے تربیت یافتہ نفوس کو "مومنین" کہا گیا ہے اور ان کے راستہ کو معیاری راستے کا درجہ دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی مخالفت کو رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی مخالفت قرار دیا گیا ہے اور مومنین کی راہ چھوڑ کر چلنے والوں کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ (آیۃ ۱۱۵)

ایک قوم کے بگڑے ہوئے افراد کی کایا پلٹ دینے اور ان کو مثالی

سیرت و کردار کا حامل بنا دینے کا جو مہتم بالشان کارنامہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سی مدت میں سرانجام دیا، دنیا کی تاریخ کا ایک ایک ورق کھنگال ڈالیے اس کی مثال کسی دوسری قوم میں ہرگز نہیں مل سکے گی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عدیم المثال انقلاب کیسے برپا فرمایا؟ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے آپؐ کی سیرتِ اطہر پر نظر ڈالیں تو تین باتیں واضح طور پر سامنے آئیں گی۔

۱۔ آپؐ نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے حکمت، عمدہ نصیحت اور حسنِ خلق سے کام لیا جیسا کہ آپؐ کو حکم دیا گیا تھا

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط (النحل۔ آیۃ ۱۲۵)

یعنی (اے نبی) اپنے رب کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔

آپؐ کے حسنِ تبلیغ اور قبولِ حق سے پہلے لوگوں کی حالت کی طرف سورہ جمعہ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔

(الجمعۃ۔ آیۃ ۲)

(وہی اللہ ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)

۲۔ راہِ حق میں آپؐ کو جو زہرہ گداز مصائب پیش آئے آپؐ انہیں بے مثال صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور لوگوں کو برابر اللہ کی طرف بلاتے اور دعوتِ حق قبول کرنے والوں کی تعمیرِ سیرت و کردار

میں مشغول رہے۔

۴۔ جن اُمور کی آپؐ نے لوگوں کو تعلیم دی، خود بھی ان پر عمل کر کے دکھایا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر آپؐ کی ذات کو دوسروں کے لیے نمونہ بنا دیا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (الاحزاب)

(اے لوگو تمہارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین طریقِ زندگی موجود ہے)

لوگوں کو نرمی اور محبت کے ساتھ راہِ حق کی طرف بلانے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کی اپنی جگہ خاص اہمیت ہے۔ اس کے ساتھ یُزَکِّیْھِمْ فرما کر اللہ جَلّ شانہٗ نے خود شہادت دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاک صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا کے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ تقریباً چھتیس مرتبہ مختلف شکلوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا مطلب یہی ہے کہ نفسِ انسانی سے ہر قسم کی آلودگیاں اور نجاستیں دور کر کے اسے صاف ستھرا کیا جائے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ آپؐ لوگوں کے اخلاق، عادات اور معاملات کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر رہے ہیں اور ان کو اعلیٰ درجے کے اخلاقی فضائل سے آراستہ کر کے ان کی زندگیاں سنوار رہے ہیں۔ اسی کا نام کردار و سیرت سازی ہے۔ قرآنِ حکیم کی سورۂ جمعہ کا پہلا رکوع خاص طور پر یہودیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے نازل ہوا۔ یہ لوگ سرزمینِ عرب میں صدیوں سے آباد تھے۔ یہود سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ قبولِ اسلام سے پہلے اہلِ عرب کی کیا حالت تھی اور چند سال کے اندر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت اور رہنمائی میں کس طرح ان کی کایا پلٹ گئی ہے۔ کیا ایک بگڑی ہوئی قوم کے کردار کی اس طرح اصلاح و تعمیر کرنا ایک نبی کے سوا کسی کے لیے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

مولانا الطاف حسین حالیؒ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپؐ کی

کردار سازی کے حوالہ سے مسدّس حالی میں کیا خوب کیا ہے :

مِس خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جن نفوس کو دعوتِ حق پر لبیک کہنے کی سعادت نصیب ہوئی اور یوں صحابہ وصحابیات کی مقدس جماعت میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا رحمتِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اُن کی تربیت اس طرح فرمائی کہ اس جماعت کا ہر فرد چلتا پھرتا اسلام یا صبغۃ اللہ یعنی اللہ کے رنگ کا پاکیزہ نمونہ بن گیا۔ اللہ اور رسول کے یہ فرمانبردار بندے ہر نیکی میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے اعلیٰ کردار کو دیکھ کر غیر مسلموں کے دلوں میں خود بخود اسلام کی طرف کشش پیدا ہوتی تھی۔ محسنِ انسانیت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے تربیت یافتہ ہی مردانِ حق تھے جنہوں نے اپنی قوتِ ایمانی کی بدولت چند سال کے اندر قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ ڈالے اور اسلام کے حیات بخش پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ انصاف پسند غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو انسان تیار کیے بلاشبہ وہ انسانیت کے بہترین نمونے اور نہایت اعلیٰ سیرت وکردار کے حامل تھے۔

نفسیات میں رحمتِ عالم ﷺ کی بے مثال مہارت

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے جس پہلو کو بھی لیں وہ اتنا جامع اور ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے کہ انسان ورطۂ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس کی مکمل اور صحیح تصویر کشی سے عاجز پاتا ہے ؏

لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ

اگرچہ اربابِ سیر نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور مکارمِ اخلاق کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ تفصیل سے کیا ہے لیکن ان میں سے بیشتر نے آپ کی جامع کمالات وصفات ذاتِ گرامی کے ایک خاص پہلو پر قلم اٹھانے کو شاید تحصیلِ حاصل سمجھا۔ یہ پہلو ہے نفسیات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال مہارت۔ سیرۃ طیبہ کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت خود بخود آشکارا ہوتی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو انسانی فطرت کا بہترین نباض بنایا تھا۔ جس طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح و تربیت کی، اس کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کے نورانی راستے پر لائے اور اس کے افراد کو سیرت و کردار کے پاکیزہ مثالی نمونے بنا دیا۔ وہ آپؐ کے حسنِ تبلیغ اور علم النفس یا نفسیات SYCHOLOGY میں آپؐ کی بے مثل مہارت پر دال ہے جو تحیر خیز بھی تھی اور ایمان افروز بھی۔ فی الحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ

ایک "ماہر نفسیات" کے مقام و مرتبہ سے کہیں بلند تھا۔ نفسیات میں مہارت تو آپؐ کے کمالات و صفات کا ایک بہت ہی معمولی حصہ تھی۔ جن باتوں سے نفسیات میں آپؐ کی مہارت کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے، دراصل وہ اس حکمت کا حصہ تھیں جس کی آپؐ نے اپنے قول و عمل سے لوگوں کو تعلیم دی۔ قرآن حکیم میں حضورؐ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صاحب کتاب و حکمت ہونے کے ساتھ رحمۃ للعالمین اور صاحب خلق عظیم بھی تھے۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ، محاسن اخلاق اور ارشادات و ہدایات میں بیمار جسم و روح دونوں کی شفا بخشی کا سامان موجود تھا اور انہی سے آب حیات کی تاثیر رکھنے والی اُس حکمت کے چشمے پھوٹتے تھے جو جسم کی صحت و توانائی، دل کی آسودگی، ذہن کی کشادگی، روح کی بالیدگی اور سیرت و کردار کے نکھار کی ضامن تھی اور ہے حضورؐ کی تعلیم حکمت، حسن تبلیغ اور خلق عظیم کے متعدد پہلو نفسیات میں آپؐ کی بے مثل مہارت کے عکاس ہیں۔ ان میں اکثر پہلوؤں کا ذکر اس کتاب کے مختلف عنوانات کے تحت آچکا ہے کچھ مزید پہلوؤں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

(۱) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی تعلیم دی خود بھی ان پر عمل کرکے دکھایا۔ جن کاموں سے منع فرمایا، کبھی ان کے نزدیک تک نہ گئے اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا خود ان پر بطریق احسن عمل کرکے اپنی ذات کو لوگوں کے لیے بہترین نمونہ بنا دیا۔ اگر لوگوں کو یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کرنے کی تلقین فرمائی تو خود عمر بھر ان طبقوں کی سرپرستی فرماتے رہے۔ اگر لوگوں کو ہمیشہ سچ بولنے کی تاکید فرمائی تو خود عمر بھر حق کے سوا کوئی بات زبانِ مبارک پر نہ لائے یہاں تک کہ دشمنوں سے بھی "صادق" کا لقب پایا۔ اگر لوگوں کو دیانتداری اور امانتداری کا درس دیا تو خود دیانت و امانت

کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ دشمن بھی اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھتے تھے اور آپؐ کو امین امین کہتے ان کی زبانیں نہ تھکتی تھیں۔ اگر لوگوں کو توکل علی اللہ کی تلقین فرمائی تو خود نازک سے نازک موقعوں پر بھی اللہ پر توکل کیا اور جبین ہمت پر شکن نہ آنے دی۔ اگر لوگوں کو حلم و تحمل اور عفو و درگزر کا سبق دیا تو خود راہِ حق میں معاندین کی سخت سے سخت باتیں برداشت کیں، برائی کا بدلہ بھلائی سے دیا اور جانی دشمنوں پر بھی قابو پانے کے بعد انہیں معاف فرما دیا۔ غرض کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ ان سب باتوں کا نفسیاتی اثر ہی تھا کہ اسلام کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا چلا گیا۔

(۲) آپؐ کی شیریں زبانی اور نرم مزاجی لوگوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی اور وہ (گنوار صحرائی بھی) اس سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف راغب ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اپنے حبیبؐ کی نرم خوئی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

(آل عمران آیۃ ۱۵۹)

(اے نبیؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تُند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے)

(۳) نبوت کے چوتھے سال جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ توحید عام کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی کہ آپؐ اپنے قریبی عزیزوں کو سب سے پہلے اللہ کے عذاب سے ڈرائیں تو آپؐ نے ایک دن صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا:

"یا صباحاہ" (ہائے صبح کا خطرہ)۔

پھر آپؐ نے قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آواز دی۔ اس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک بھاری لشکر تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار کھڑا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے؟"

سب نے بیک آواز جواب دیا:

"ہاں، ہم نے کبھی تمہیں جھوٹ بولنے والا نہیں پایا۔"

آپؐ نے فرمایا: "تو میں اللہ کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں اپنے آپ کو اس سے بچانے کی فکر کرو۔"

مولانا حالیؒ نے "مسدسِ حالی" میں اس واقعہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبرؐ تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا"

کہ "فوج گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دلنشیں ہے تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

اُس وقت بظاہر تو قریش پر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے انتباہ اور پیغام توحید کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن ان کو خبردار کرنے سے پہلے آپؐ نے جس طرح ان سے اپنے "صادق" ہونے کا اعتراف کرایا اس نے متعدد سعید روحوں کو آپؐ کی دعوت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ آپؐ کو جھٹلانے یا دعوتِ توحید کو رَدّ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی معقول عذر نہ تھا۔

۴ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اَفْصَحُ الْعَرَب تھے اور عرب کے ہر قبیلے سے اس کے علاقائی لہجے اور مقامی محاورے کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ اس کی تفصیل "اَفْصَحُ الْعَرَب" اور "حسنِ تبلیغ" کے عنوانات کے تحت بیان کی گئی ہے۔ عربی زبان پر آپؐ کے غیر معمولی عبور اور آپؐ کی فصاحت و بلاغت کا بھی عربوں پر نفسیاتی اثر ہوتا تھا۔

۵ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی غیر معمولی سخاوت اور مہمان نوازی بھی عوام الناس کے تحت الشعور میں اسلام کی طرف رغبت پیدا کرنے کا باعث بنتی تھی۔ لوگوں کا آئے دن کا مشاہدہ تھا کہ آپؐ خود بھوکے رہ کر بھی سائلوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے، عرب کے گوشے گوشے سے جو وفود آتے تھے آپؐ ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے اور جب وہ جانے لگتے تو سب کو کچھ نہ کچھ دے دلا کر رخصت فرماتے تھے۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ طرزِ عمل ایک طرف تو عوام النّاس پر خوشگوار نفسیاتی اثر ڈالتا تھا تو دوسری طرف آپؐ کی سخاوت وایثار اور مہمان نوازی سے فیض یاب ہونے والوں کے دلوں میں آپؐ سے عقیدت اور محبّت کے جذبات پیدا کر دیتا تھا جو ان کو حلقۂ اسلام میں لے آتے تھے۔

۶ آنحضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کے دُکھ سُکھ میں برابر شریک رہتے تھے۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے، بیمار کو تسلّی و تشفی دیتے اس کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے "اِنْ شَاءَ اللہ

صحت یاب ہوجاؤ گے۔ پھر اس کی صحت کے لیے دعا کرتے۔ یوں نفسیاتی طور پر مریض پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ اسی طرح کسی صحابی کا انتقال ہوجاتا تو آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھاتے اور فوت ہونے والوں کے رشتہ داروں کے پاس جاکر تعزیت کرتے۔

(۷) نماز پڑھاتے وقت اگر مقتدیوں میں بچوں والی عورتیں ہوتیں تو آپ نماز میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلد ہی سلام پھیر دیتے تاکہ عورتوں اور بچوں کو تکلیف نہ ہو۔

(۸) مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے محلے کی مسجد میں بنو سلمہ کے لوگوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے عشاء کی نماز میں سورۂ بقرہ پڑھی۔ ایک صاحب نے جو دن بھر کام کرنے کی وجہ سے سخت تھکے ہوئے تھے (ان کی طویل قراءت کی وجہ سے) علیٰحدہ ہو کر ہلکی سی نماز پڑھ لی۔ حضرت معاذؓ کو خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ شخص منافق ہے۔ اُن صاحب کو حضرت معاذؓ کی یہ بات سخت ناگوار گزری اور انہوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا :

"یارسولؐ اللہ! ہم محنت مشقت کرنے والے لوگ ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے مزدوری کرتے ہیں اور اونٹوں کے ذریعے پانی بھرتے ہیں (اس طرح سخت تھک جاتے ہیں) آج معاذ نے ہمیں نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ بقرہ شروع کر دی اس لیے میں نے اپنی نماز علیٰحدہ ہوکر پڑھ لی۔ اس پر معاذ کہتے ہیں کہ میں منافق ہوگیا۔"

حضرت معاذؓ بھی بارگاہِ نبوی میں حاضر تھے۔ حضورؐ نے ان سے مخاطب ہوکر تین مرتبہ فرمایا، اے معاذ! کیا فتنہ برپا کرو گے؟ اس کے بعد فرمایا صرف سورۃ الشمس اور سورۃ الضحیٰ جیسی (چھوٹی) سورتیں پڑھ لیا کرو (کیونکہ مقتدیوں میں بوڑھے، ضعیف اور اربابِ حاجت سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

(صحیح بخاری)

(۹) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہلِ یمن پر حاکم مقرر فرمایا۔ جب وہ مدینہ منورہ سے چلنے لگے تو حضورؐ نے ان کو یہ نصیحت فرمائی:

"اے معاذ! جب تم یمن پہنچو تو وہاں کے لوگوں سے نرم سلوک کرنا، سختی نہ کرنا، لوگوں کو خوش رکھنا، (دین سے یا اسلامی حکومت سے) متنفر نہ کر دینا۔ باہم مل کر کام کرنا۔ تم وہاں ایسے لوگ بھی پاؤ گے جو پہلے سے کسی مذہب کے پیرو ہیں۔ جب ان کے پاس پہنچو تو پہلے ان کو توحید و رسالت کی دعوت دینا۔ جب وہ اس کو قبول کر لیں تو کہنا کہ اللہ نے تم پر دن رات میں پانچ نمازیں بھی فرض کی ہیں۔ جب وہ ان کو تسلیم کر لیں تو انہیں بتانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے۔ یہ تمہارے امیروں سے لے کر تمہارے غریبوں کو دی جائے گی۔ جب وہ زکوٰۃ دینا بھی منظور کر لیں تو چن چن کر اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس (بددعا) اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔"

ان نصیحتوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم انسانی نفسیات کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ دین کے معاملے میں نومسلموں پر سختی کرنا آپؐ کو پسند نہیں تھا اور آپؐ ان کو نرمی اور محبت کے ساتھ شعائرِ اسلام کا پابند بنانا چاہتے تھے۔ اسی طرح آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ جونہی وہ اسلام قبول کریں، ان پر دین و شریعت کے تمام احکام کی پابندی لازم قرار دی جائے کیونکہ ایسی پابندی کو وہ اپنے اوپر بوجھ سمجھیں گے۔ آپؐ کے خیال میں مناسب یہ تھا کہ ان میں مختلف شرعی احکام بتدریج نافذ کیے جائیں جب اسلام ان کے ذہنوں میں راسخ ہو جائے گا تو وہ خود بخود سب احکام کی خوشدلی سے پابندی کریں گے۔

(۱۰) ۹ھ ہجری میں بنو ثقیف کا ایک وفد طائف سے مدینہ منورہ آیا اور بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر چند شرطوں پر اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ شرطیں یہ تھیں:

ہمیں زنا کاری، سود خواری اور شراب خواری کی اجازت دی جائے۔

حضورؐ نے یہ تینوں شرطیں یکسر مسترد کر دیں۔ پھر اہل وفد نے درخواست کی کہ ہمیں نماز سے معاف کر دیا جائے (یعنی ہم پر نماز کی فرضیت ساقط کر دی جائے) حضورؐ نے یہ درخواست بھی رد کر دی اور فرمایا کہ جس دین میں اللہ کی عبادت نہ کی جائے وہ دینِ فطرت نہیں۔

اس کے بعد اہلِ وفد نے زکوٰۃ اور جہاد سے استثنار کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا، اچھا اس کے لیے تم کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے بعد میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ فرماتے سنا کہ جب یہ لوگ صدق دل سے اسلام قبول کریں گے (یعنی اسلام ان کے ذہنوں میں راسخ ہو جائے گا) تو یہ جہاد بھی کریں گے اور زکوٰۃ بھی دیں گے۔ اور پھر واقعی کچھ عرصہ بعد بنو ثقیف اسلام کے بازوئے شمشیر زن بن گئے اور انھوں نے میدانِ جہاد میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ اسی طرح وہ زکوٰۃ دینے میں بھی دوسرے مسلمانوں سے پیچھے نہ رہے۔

(۱۱) ایک دفعہ ایک شخص آنحضورؐ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ملنے آیا۔ رُعبِ نبوّت سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آپؐ نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو بڑی محبّت اور نرمی کے ساتھ فرمایا، گھبراؤ نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔ (مستدرک حاکم)

۱۲ یومِ جمعہ کو ہفتے کے دوسرے تمام دنوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اگرچہ ہفتے کے ساتوں دنوں کی ہئیت یکساں ہے اور ان میں سرِمُو فرق نہیں مگر جو

باتیں یومِ جمعہ کو دوسرے دنوں سے ممیّز کرتی ہیں وہ یہ ہیں :

(ا) اس دِن ظہر کے چار فرضوں کے بجائے جمعہ کے دو فرض پڑھے جاتے ہیں اور ان سے پہلے خطبہ بھی ہوتا ہے جس کو خاموشی سے سُننا ضروری بھی ہے اور باعث اجر بھی۔

(ب) آنحضور صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے نمازِ جمعہ کی جس قدر تاکید فرمائی اور اس کے لیے جس اہتمام کا حکم دیا اس کا ایسا نفسیاتی اثر ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں جمعۃ المبارک کی اہمیت اور فضیلت نقش کالحجر ہو گئی اور یہ دن قیامت تک کے لیے شعارِ مِلّت بن گیا۔

اس سلسلے میں حضورؐ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں :

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِیَ اللّٰہ تعالیٰ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا :

"میرا جی چاہتا ہے کہ نماز (جمعہ) پڑھانے کے لیے اپنی جگہ کسی اور شخص کو کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھر جلا دوں جو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے نہیں آتے۔ (صحیح بخاری، مُسندِ احمد)

۲۔ حضرت جابر بن عبداللہ رَضِیَ اللّٰہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ فرض ہے اِلّا یہ کہ عورت ہو یا مسافر ہو یا غلام ہو یا مریض ہو۔ (دارقطنی، بیہقی)

۳۔ حضرت ابوالجعد ضمریؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا :

"جو شخص کسی حقیقی ضرورت اور جائز عذر کے بغیر محض بے پروائی کی بناء پر مسلسل تین جمعے ترک کر دے اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے (بروایتِ دیگر اللہ اس کا دل منافق کا دل بنا دیتا ہے) (مُسندِ احمد)

۴۔ حضرت جابر بن عبداللہ رَضِیَ اللّٰہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

نے فرمایا:

"آج سے قیامت تک جمعہ تم لوگوں پر فرض ہے جو شخص اسے ایک معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اسے چھوڑے، اللہ اس کا حال درست نہ کرے، نہ اسے برکت دے۔ خوب سُن رکھو، اس کی نماز نماز نہیں، اس کی زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں۔ اس کا حج، حج نہیں۔ اس کا روزہ، روزہ نہیں۔ اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے، پھر جو توبہ کرے اللہ اسے معاف فرمانے والا ہے۔"

(ابنِ ماجہ، بزّار)

۵۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر مسلمان جمعہ کے دن غسل کرے اور جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو پاک صاف کرے، سر میں تیل لگائے یا جو خوشبو گھر میں موجود ہو وہ لگائے، پھر مسجد جائے اور دو آدمیوں کو ہٹا کر ان کے بیچ میں نہ گھسے۔ پھر جتنی کچھ اللہ توفیق دے اتنی نماز (نفل) پڑھے پھر جب امام بولے تو خاموش رہے، اس کے قصور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک معاف ہو جاتے ہیں۔" (بخاری، مُسنَدِ احمد)

۶۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنا چاہیے، دانت صاف کرنے چاہئیں، جو اچھے کپڑے اس کو میسر ہوں پہننے چاہئیں اور اگر خوشبو میسر ہو تو لگانی چاہیے۔" (بخاری، مُسنَدِ احمد)

۱۳۔ کُتبِ حدیث میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے بیسیوں حکیمانہ ارشادات ملتے ہیں جن پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا انسانی فطرت اور

نفسیات سے گہرا تعلق ہے۔ ان میں سے کچھ ارشادات یہاں درج کیے جاتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم سے اپنی سخت دلی کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا، یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو۔ (اس طرح تمہارے دل کی سختی دور ہو جائے گی)۔ (مُسنَدِ احمد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم سے پوچھا، یا رسولؐ اللہ! اسلام میں کیا چیز بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا، (حاجت مندوں کو) کھانا کھلانا اور ہر مسلمان کو سلام کرنا خواہ ان سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔ (صحیحین)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا، قوی مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ اچھا اور محبوب ہے۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا، اپنے ماں باپ کو گالی دینا بھی کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ لوگوں نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کو ماں باپ کی گالی دے پھر وہ اس کے جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا، بہادر وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو پالے۔ (صحیحین)

حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم نے فرمایا، جس نے کسی کی سفارش کی اور اس سفارش کے عوض اس کو کچھ ہدیہ

یا تحفہ دیا گیا اور اس نے قبول کر لیا تو اس نے ربوٰا (سُود) کا بڑا دروازہ کھول دیا۔
(خیر المواعظ)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو مبالغہ سے دوسرے کی تعریف کرتے ہوئے سُنا تو (تعریف کرنے والے سے) فرمایا، تم نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ (یا فرمایا کہ تو نے اس کی کمر توڑ دی)۔
(ادب المفرد)

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تندرستی کی حالت میں آدمی کا ایک درہم کا صدقہ کرنا موت کے وقت سَو درہم صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ (ابو داؤد)

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے اپنے آپ کو کسی چیز سے دنیا میں قتل کیا (یعنی خودکشی کی) اس کو قیامت کے دن اسی چیز سے عذاب دیا جائے گا۔
(صحیح مسلم)

حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پانچ باتوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو:-

(۱) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے (۲) صحت کو بیماری سے پہلے
(۳) مالداری کو مفلسی سے پہلے (۴) بے فکری کو پریشانی سے پہلے
(۵) زندگی کو موت سے پہلے۔ (ترمذی)

کتابیات

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مندرجہ ذیل کتابوں سے براہِ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ——

(۱) قرآنِ پاک ——
(۲) الجامع الصحیح —— امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ
(۳) الجامع الصحیح —— امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ
(۴) سُنَنِ ابی داؤد —— امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ
(۵) سُنَنِ نسائی —— امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی نسائی رحمۃ اللہ [illegible]
(۶) جامع ترمذی —— امام ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ
(۷) مؤطا —— امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
(۸) مُسندِ احمد —— امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
(۹) سُنَنِ ابن ماجہ —— امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابنِ ماجہ قزوینی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۰) السیرۃُ النبویہ —— ابنِ ہشام رحمۃ اللہ علیہ
(۱۱) الشمائل —— امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۲) الادب المفرد —— امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ
(۱۳) الطبقات الکبریٰ —— علامہ محمد بن سعد کاتب واقدی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۴) زاد المعاد —— حافظ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ
(۱۵) مشکوٰۃ المصابیح —— شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب مصری رحمۃ اللہ علیہ
(۱۶) الاصابہ فی تمییز الصحابہؓ —— حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۷) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب —— حافظ ابنِ عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ
(۱۸) اُسدُ الغابہ فی معرفۃ الصحابہؓ —— علامہ ابنِ اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ
(۱۹) الکامل فی التاریخ —— علامہ ابنِ اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ
(۲۰) البدایہ والنہایہ —— حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ

(۲۱) احیاء العلوم —— امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۲) شعب الایمان —— امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۳) سیرۃ النبیؐ —— علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۴) رحمۃ للعالمینؐ —— قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری رحمۃ اللہ علیہ

(۲۵) محمد رسول اللہؐ —— شیخ محمد رضا مصری اردو ترجمہ جناب محمد عادل قدوسی

(۲۶) سیرت کبریٰ —— مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم

(۲۷) شمائل کبریٰ —— عبدالحکیم خان نشتر جالندھری مرحوم۔ مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم

(۲۸) سیرۃ سرورِ عالمؐ —— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۹) نبیٔ رحمتؐ —— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(۳۰) رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی —— ڈاکٹر محمد حمید اللہ

(۳۱) اخلاقِ نبویؐ —— مولانا سید محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ

(۳۲) جغرافیہ جزیرۃ العرب —— مولانا محمد رابع ندوی

(۳۳) سیرۃ نبوی قرآنی —— مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

(۳۴) اسوۂ رسولِ اکرمؐ —— مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

(۳۵) معارف الحدیث —— مولانا محمد منظور نعمانی

(۳۶) حیاۃ الصحابہؓ —— مولانا محمد یوسف کاندھلوی مرحوم

(۳۷) زادِ راہ —— مولانا جلیل احسن

(۳۸) راہِ عمل —— مولانا جلیل احسن

(۳۹) فصاحتِ نبوی —— علامہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

(۴۰) الرحیق المختوم —— مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

(۴۱) نقوش (لاہور) —— رسول نمبر جلد چہارم —— ماہنامہ

(۴۲) مقالاتِ سیرت (دسویں سیرت کانفرنس اسلام آباد) وزارت امور مذہبی حکومت پاکستان

(۴۳) رہبرِ کامل —— مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی مرحوم

ان کے علاوہ رسالہ "فاران" کراچی "ضیائے حرم" لاہور، "اردو ڈائجسٹ" لاہور، "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور، "محدث" لاہور، "مہک" گوجرانوالہ وغیرہ کے بعض شماروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

طالب الہاشمی کی دوسری تالیفات

سیرۃ طیبہ

اخلاقِ پیمبری

وُفودِ عرب بارگاہِ نبویؐ میں

معجزاتِ سرورِ کونینؐ

ارشاداتِ دانائے کونینؐ

صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے ایمان افروز تذکرے

سیرۃ خلیفۃ الرسول سیدنا صدیق اکبرؓ

تیئس پروانے شمعِ رسالتؐ کے

خیر البشرؐ کے چالیس جاں نثارؓ

سرورِ کائناتؐ کے پچاس صحابہؓ

آسمانِ ہدایت کے ستر ستارے

رحمتِ دارینؐ کے سَو شیدائیؓ

فرزندِ سعادت کے ایک سو پچاس چراغؓ

حبیبِ کبریاؐ کے تین سَو اصحاب

تذکارِ صحابیاتؓ

سیرۃ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ

سیرۃ حضرت ابوایوب انصاریؓ

سیرۃ حضرت ابوہریرہؓ

سیرۃ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص

سیرۃ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ

تاریخ وسوانح کے موضوع پر کچھ اور تالیفات

یہ تیرے پُراسرار بندے

الملک الظاہر بیبرس

ملک شاہ سلجوقی

سلطان نورالدین محمود زنگیؒ

یعقوب المنصور باللہ

تاریخِ اسلام کی چار سَو باکمال خواتین

تذکرہ شاہِ جیلانؒ

تذکرہ خواجہ اجمیریؒ

تذکرہ بابا فریدالدین گنج شکرؒ

تذکرہ مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ

تذکرہ حضرت موج دریا بخاریؒ

متفرق موضوعات پر چند تالیفات

سفرنامۂ آخرت

حکایاتِ رومیؒ

حکایاتِ سعدیؒ

حکایاتِ صوفیہ

آج کے نیچے کل کے جوان

قوم کے نونہالوں کے لیے کردار ساز کتابیں

ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم
(صدارتی ایوارڈ یافتہ)

جنت کے پھول

کیڑے مکوڑوں کی حیرت انگیز کہانیاں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ
حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ
حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بن عبید اللہ
حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح
حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن زید
حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بن العوام
حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص
حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف

اللہ کی پکڑ اور دوسری کہانیاں
آگ میں باغ
سونے چاندی کا بچھڑا
صبر کی تصویر 〃
لقمانِ حکیم
خدائی امتحان 〃
شہید نبی

جنت کی خوشبو اور دوسری کہانیاں
یمامہ کا قیدی
غمگسار بیوی 〃
شیر دل خاتون 〃
آزمائش 〃
بادشاہی میں فقیری 〃
اللہ کا شیر 〃
اللہ کی تلوار 〃
فرض کی پکار 〃
درویش گورنر 〃
بہادر بھائی بہن 〃
ماں راضی اللہ راضی 〃
حق کی تلاش 〃
دلوں پر حکومت 〃
خدا پر بھروسا 〃
شریف دشمن 〃
گمنام محسن 〃
کرخ کا درویش 〃
ڈاکو کا قہقہہ 〃
دلیر چرواہا 〃
بے وقت کی اذان 〃
دریا دل عالم 〃
دل کی بادشاہی 〃
اللہ کا سپاہی 〃
شرافت کا پتلا 〃
نصیحت کا حق 〃
غرور کا سر نیچا۔ شیر دل سلطان
غریب بادشاہ توبہ کی برکت ظلم کا انجام
... کا سپاہی

الفتح انٹرپرائزز
اردو بازار۔ لاہور

نوٹ: کتابوں کی قیمتوں میں کاغذ کے نرخ اور دوسرے اخراجات کے مطابق ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ ہر کتاب اسی قیمت پر مہیا کی جائے گی جو آرڈر موصول ہوتے وقت ہوگی۔ بڑے آرڈر پر معقول رعایت دی جائے گی۔

ہماری چند دیگر کتب

